

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

جوری 2013

خواتین کا جسطہ

سالِ الوعز



کہنی سنتی
کرن کرن روتی
ہمارے نامہ

14 مسیر

15 اداہ

266 نادر خاتون

آپ
کیا پردہ

رجائیت
شازہ عزمین

خاتون کا ڈائری

میری ڈائری سے
امت (اصبور)

مجھ سے ملے

باتیں سجل علی سے
شائین رشید

انٹرویو

تین سال کی دیکھ
نیام نہیں ملاقات
ادارہ
شائین رشید

ناول

میرے خواب لوٹادو
منجھت عبداللہ

گوہ گراں تھے ہم
عنیزہ سید

کمل ناول

204 نگہت سیما

98 میری سبک درمیان

142 سائرہ رضا

ناولٹ

82 ہم سے ہے زمانہ

افسانے

74 ام شامہ

64 ایلا یقین

68 راز و رفت

نظمیں غزلیں

260 انور سدید

260 پرتو و ہیلہ

261 مصطفیٰ اقبال

261 نازیہ کول نازی

غزل
غزل
غزل
نظم



پکوان

رنگارنگ پھول

284 آپ کا باورچی خانہ

286 موسم کے پکوان

262 شگفتہ جیاد

280 تصویر نشاط

نفسیات

میری یاد سے

288 نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

275 آپ کی بیاض سے

275 خالدہ جیلانی

بیوی بکس

290 بیوی بکس کے مشورے

جوری 2013

جلد 40 شمارہ 9

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، ناتھناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ہر جملہ ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت میں ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قطعے کی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری 2013ء کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

2012ء بھی وقت کے بہتے سمندر کا حصہ ہوا۔

وقت کا آغاز انجام نامعلوم۔ جانے کب اس کا سفر شروع ہوا اور اس کا اختتام کہاں ہوگا۔ کوئی نہیں جان سکتا۔ ترقی و ترقی، مروج و زوال، فتح و شکست کی بے شمار جہت ناگ داستانیں اپنے دامن میں بیٹھے وقت آگے ہی بڑھت جا رہا ہے۔ یہ داستانیں جو کئے زمانوں کی تاریخ کی صورت رقم ہیں اور آگے والے زمانوں کے لیے سبق۔

قرون سے جاری وقت کے اس تسلسل میں انسان مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بودی کائنات جو یہ ان کُن حن ترتیب رکھتی ہے انسان کے لیے تخلیق کی گئی تو یقیناً انسان کی تخلیق کا بھی کوئی علا وادفع مقصد ہوگا۔ انسان اس مقصد کو سمجھنے زندگی کا میاب پھرنے لگی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے آپ سب کو نیا سال مبارک۔ ہماری دعا ہے کہ نئے سال کا سورج ہم سب کے لیے امن، سلامتی، خوشحالی اور کامیابی لے کر آئے۔ آمین۔

انشائی کی بری،

انشائی ایک شخصیت رکھنے پہلو۔

بہترین مزاح نگار، خوبصورت شاعر، بے مثال کامل نگار۔ سفر نامے لکھنے تو تخلیق کا ایک پیارو پسند آیا۔ انشائی کے کامل پڑھے۔ وہ آج کے حالات کا آئینہ ہیں۔ زبان کی کاٹ، طنزی کی تیزی، جملوں کی معنی آؤ بستی، گنگنسی اور شوخی کے ساتھ ساتھ نفاست اور شائستگی کا عین بھی نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کچھوں کے نرم اور کوئل احساسات، بھری کیفیت میں دھل کر گہری، سنگینی آج دیتی چھا دیا سوز جگاتی ہے۔

انشائی نے سادے جہاں کا سفر کیا، سفر نامے لکھے پھر 11 جنوری 1978ء کو ایسے سفر پر چلے گئے جہاں سے کوئی نہیں لوٹا۔ انشائی دنیائے چلے گئے لیکن ان کی تحریریں، ان کی شاعری انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

اس شمارے میں،

۴ ساثرہ رضا کا مکمل ناول۔ آنے والے برف کا موسم،
۴ تیسرے میرے درمیان۔ مہوش اختیار کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
۴ زمین کے آئینے۔ نگہبخت سیما کا ناول،
۴ ہم سے ہے زمانہ۔ غرہ بخاری کا ناول،
۴ راستہ رفعت، اتم گاما اور ایلیا یقین کے افسانے،
۴ باتیں سبیل علی سے، فی وی فنکارہ نیلم میر سے ملاقات،
۴ نئے سال کی دہلیز پر۔ تاریخ سے سروے،
۴ کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
۴ نفسانی ازدواجی الجھنیں اور عزت نامہ کے مشورے،
۴ نئے سال کا ہوسلا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا۔ ہم آپ کی بلٹے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس برحق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور اصدوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نیکی

یعنی کچھ قرض معاف کر دے یا اس کو ادائیگی قرض میں (آسانی تک) مہلت دے دے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے

”اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے آسانی تک مہلت دے دو اور اگر تم معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے“

2- کوئی شخص نیکی نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرے تو اسے سمجھایا جائے تاکہ وہ اپنا ارادہ ترک کر کے نیکی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

3- باہم جھگڑنے والوں کو یوں ہی نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کے درمیان صلہ کرائے کی کوشش کی جائے۔

4- جھگڑنے والوں کو بھی مصلحین کے ساتھ تعاون اور ان کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔

کمزور، فقیر اور گم نام مسلمانوں کی فضیلت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے پر دو جھگڑنے والوں کی اونچی آوازیں سیں۔

ان میں سے ایک دوسرے سے قرضے میں کمی اور کچھ نرمی کا مطالبہ کر رہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا ”اللہ کی قسم! میں (یہ) نہیں کروں گا۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس باہر تشریف لائے اور پوچھا۔

”وہ شخص کہاں ہے جو اللہ پر قسم کھا رہا تھا کہ وہ نیکی نہیں کرے گا؟“

وہ شخص بولا کہ ”میں ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!“ (اور ساتھ ہی اس نے نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا) ”اور اسے (ان دونوں میں سے) اس چیز کا اختیار ہے جسے وہ پسند کرے۔ (یعنی قرض میں کچھ کمی کرائے یا مہلت لے لے) (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1- اس سے معلوم ہوا کہ تنگ دست مقروض کے ساتھ احسان کرنا مستحب ہے

شام، اس کی رضا کے طالب ہیں اور تیری آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں۔“

حضرت حارث بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”کیا میں تمہیں جنتیوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر آپ نے خود ہی جواب دیا) ہر کمزور جو کمزور سمجھا جاتا ہے، اگر وہ اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اسے پوری کر دیتا ہے۔ کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر جواب دیا) ہر تندہ جو سرکش، بخل (یا ترا کر چلنے والا) اور متکبر شخص۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- اس حدیث میں ان کمزور، غریب اور گوشہ گماںی لوگوں کی فضیلت کا بیان ہے جن کو معاشرے میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہوتا، لیکن وہ ایمان و تقویٰ کے ایسے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ اگر اللہ کی ذات پر اعتقاد کرتے ہوئے قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری فرما دیتا ہے۔

2- اس میں تواضع اور گماںی کی فضیلت اور تکبر، بخل اور شرارت و ناموری کی مذمت ہے۔

جنت اور روزِ قیامت

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جنت اور روزِ قیامت میں جھگڑا ہوا۔ جہنم نے کہا۔ ”میرے اندر سرکش اور متکبر انسان ہوں گے“

اور جنت نے کہا۔ ”میرے اندر کمزور اور مسکین لوگ ہوں گے۔ چنانچہ اللہ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ فرمایا (جنت سے کہا) اے جنت! تو میری رحمت ہے، تیرے ذریعے سے میں جس پر چاہوں گارحم کروں گا۔ (اور روزِ قیامت سے کہا) اے جہنم! تو میرا عذاب ہے، میں تیرے ذریعے سے جسے چاہوں گا عذاب دوں گا۔“

تم دونوں کا بھرتا میری ذمہ داری ہے۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- حدیث میں ضعیف و مساکین سے مراد وہ اہل ایمان و تقویٰ ہیں جو مصروفِ قیامت سے زندگی گزار دیتے ہیں لیکن دنیا کماتنے کے لیے مکرو فریب سے کام نہیں لیتے۔ حدیث میں ان کے لیے بشارت ہے۔ ان کے برعکس اللہ کے احکام سے سرنبالی کرنے والے جابر و متکبرین کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی پسند ہے کہ وہ ان قسموں میں سے جس قسم میں چاہے اپنا شمار کرالے۔

2- جنت اور روزِ قیامت کا یہ مکالمہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ان کے اندر ادراک و شعور پیدا کر دینا، جس سے وہ باہم بحث و تکرار کریں، کوئی مشکل کام نہیں ہے، اس لیے اس قسم کی احادیث کی تاویل کی چنداں ضرورت نہیں ہے، انہیں اپنے ظاہر ہی پر محمول کیا جائے۔ یہ روایت مسند احمد (3/79) میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے زیادہ مفصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

روزِ قیامت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یقیناً قیامت والے دن موٹا تازہ بڑا آدمی آئے گا اللہ کے ہاں پچھنے کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہو گا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں شان و شوکت کے ان مظاہر کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی جن کو اہل دنیا اہمیت دیتے ہیں۔ وہاں تو انسان کا ایمان، اخلاص اور تقویٰ دیکھا جائے گا اور اسی بنیاد پر اس کی قدر و قیمت ہوگی، اس لیے انسان کی اصل توجہ اپنے

دل کی اصلاح کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ صرف پرورش جسم کی طرف۔

2- روزِ قیامت جہاں انسان کے اعمال تو لے جائیں گے وہاں خود انسان کا وزن بھی ہو گا۔ جو شخص جتنا زیادہ متقی، پرہیزگار اور زاہد ہو گا اتنا ہی اس کا وزن زیادہ ہو گا۔ نیکیوں کے وزن کا زیادہ ہونا ہی باعثِ نجات ہے۔

روشنی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک سیاہ قام عورت یا کوئی نوجوان مسجد میں چھاڑو دیا کرتا تھا۔ (راوی کو شک ہے کہ وہ عورت تھی یا نوجوان) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گم پایا تو اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ وہ تو فوت ہو گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تو تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟“ گویا لوگوں نے اس (کی وفات) کے معاملے کو حقیر کر دانا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”مجھے اس کی قبر بتاؤ!“

چنانچہ لوگوں نے آپ کو اس کی قبر بتائی تو آپ نے اس پر نماز پڑھی، پھر فرمایا۔

”بے شک یہ قبریں، قبروں والوں پر تاریکی سے بھری ہوئی ہیں، میرے ان پر نماز پڑھنے سے یقیناً اللہ تعالیٰ یہ ان کے لیے روشن فرما دیتا ہے۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- بعض روایات کی بنیاد پر علماء نے اسی بات کو رائج قرار دیا ہے کہ جھاڑو دینے والی ایک عورت تھی۔

2- اس میں ایک تو مسجد کی صفائی کی فضیلت کا اور دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال خلق و تواضع کا بیان ہے۔

3- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل خیر و صلاح کے جنازوں میں شرکت کرنی چاہیے اور شرکت سے

محرومی کی صورت میں اس کی قبر گہ پاس کھڑے ہو کر بھی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔

غریب متقی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بہت سے برآگندہ، غبار آلود اشخاص جہنمیں دروازوں ہی سے دھکیل دیا جاتا ہے، اگر اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری فرما دیتا ہے۔“ (مسلم)

فائدہ :

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کو گندے کپڑے پہننے اور برآگندہ بال رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ شریعت نے صفائی کو پسند کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی صاف رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے ایسے لوگ جن کا لباس یا حلیہ زیادہ بارعب یعنی نہیں ہوتا اور نہ معاشرے میں ان کا کوئی وقار ہی ہوتا ہے اور زندگی و وجہ سے اچھے لباس کا اہتمام بھی نہیں کرتے، تاہم ان کے تقویٰ اور شرعی احکام کی پابندی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضرور پوری فرماتا ہے۔

کلام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”گوارے میں صرف تین (چوں) نے کلام کیا۔“

عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام، نبی اسرائیل کے ایک بچہ نے اور صاحبِ جبرئیل رحمۃ اللہ نے

جبرئیل ایک عبادت گزار آدمی تھے انہوں نے ایک کنیا (عبادت کے لیے جھونپڑی) بنائی ہوئی تھی۔ (ایک روز) وہ اس میں تھے کہ ان کی والدہ ان کے پاس آئیں جب کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

والدہ نے آواز دی۔ ”اے جبرئیل!“

تو جبرئیل نے (دل میں) کہا۔

”اے میرے رب! میری ماں (مجھے بلا رہی ہے) اور میں نماز میں (مصرف ہوں)“
وہ نماز ہی میں متوجہ رہے چنانچہ ان کی والدہ واپس چلی گئیں۔
دوسرے دن وہ پھر آئیں جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آواز دی۔

”اے جرتج“
انہوں نے (پھر دل میں) کہا ”اے میرے رب! میری ماں (مجھے بلا رہی ہے) اور میں نماز میں ہوں۔“
چنانچہ وہ نماز ہی میں متوجہ رہے (اور والدہ چلی گئیں۔)

تیسرے دن وہ پھر آئیں جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آکر کہا۔
”اے جرتج!“

انہوں نے (دل میں) کہا۔
”اے میرے رب! میری ماں (مجھے بلا رہی ہے) اور میں نماز میں ہوں۔ وہ نماز ہی میں متوجہ رہے۔

ان کی والدہ نے (انہیں بدو عادیہ ہونے) کہا۔
”اے اللہ! اسے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک یہ بدکار عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے۔“

چنانچہ بنی اسرائیل ’جرتج اور ان کی عبادت کا چرچا کرنے لگے۔ (ان میں) ایک بدکار عورت (بھی) تھی جس کے حسن و جمال کی مثال دی جاتی تھی۔

اس نے (بنی اسرائیل سے) کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میں اسے آزمائش میں ڈال دوں۔“

چنانچہ وہ عورت (سولہ سنہار کر کے) ان کے سامنے آئی، لیکن انہوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، تو وہ ایک چرواہے کے پاس آئی جس کا ان کی کنیا میں آنا جانا تھا۔

اس عورت نے اپنے اوپر اس چرواہے کو قدرت دی اور جب اس کا بچہ پیدا ہوا تو دعوا کر دیا کہ یہ جرتج کا ہے۔

لوگ (یہ سن کر) جرتج کے پاس آئے، انہیں کنیا سے بچے اتارا۔ ان کی کنیا کو گرا دیا اور انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔
انہوں نے پوچھا۔
”بات کیا ہے؟“ (تم کیوں میرے ساتھ ایسا معاملہ کر رہے ہو؟)

انہوں نے کہا۔ ”تو نے اس فاحشہ کے ساتھ بدکاری کی ہے اور اس نے تیرا لڑکا بھی جتا ہے۔“
انہوں نے پوچھا! ”بچہ کہاں ہے؟“

چنانچہ وہ بچہ اٹھا کر لائے۔ انہوں نے نماز ”مجھے چھوڑ دو“ میں نماز پڑھ لوں۔“ انہوں نے نماز پڑھی نماز سے فارغ ہو کر بچے کے پاس آئے اور اس کے پیٹ میں بچہ کا گایا اور اس سے پوچھا۔

”اے لڑکے! تیرا باپ کون ہے۔“
اس نے جواب دیا۔ ”فلان چرواہا۔“

چنانچہ سب لوگ جرتج کی طرف متوجہ ہوئے، انہیں (عقیدت سے) بوسہ دیتے اور چھوتے اور انہوں نے کہا۔

”ہم تیری کنیا سونے کی بنا دیتے ہیں۔“
انہوں نے کہا۔ ”نہیں“ اسے اسی طرح مٹی کی بنا دو جیسے پہلے تھی۔“ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا۔

(اب تیسرے بچے کا ذکر، جس نے گوارے میں گفتگو کی۔)
ایک دفعہ ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا کہ ایک شخص گزرا جو تیز رفتار تھوڑے پر سوار اور عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ بچے کی ماں نے کہا۔

”یا اللہ! میرے بچے کو (بھی) اس جیسا بنانا۔“
بچہ دودھ پینا چھوڑ کر اس شخص کی طرف متوجہ ہوا اور اسے دیکھا اور کہا۔

”اے اللہ! مجھے اس جیسا بنانا۔“ پھر (دوبارہ) دودھ پینا شروع کر دیا۔
” (حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں) گویا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ

آپ اس کے دودھ پینے کی کیفیت اپنی انگشت شہادت منہ میں ڈال کر اور اسے چوس کر بیان فرما رہے ہیں۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کچھ دیر بعد لوگ ایک کنیز کو مارتے ہوئے گزرے اور کہتے تھے۔“ تو نے بدکاری اور چوری کی ہے۔“

اور وہ کہتی تھی۔
”مجھے میرا اللہ کا بیٹا ہے اور وہ اچھا کار ساز ہے۔“
بچے کی ماں نے (پھر) دعا کی۔

”اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا نہ کرنا۔“
(یہ سن کر) بچے نے دودھ پینا چھوڑ کر اس لونڈی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اے اللہ! مجھے اس جیسا (ہی) کرنا۔“
اس کے بعد ماں بیٹے میں گفتگو ہوئی۔

ماں نے کہا۔ ”ایک خوش اطوار آدمی گزرا اور میں نے دعا کی اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا بنانا، تو نے اس کے برعکس کہا کہ یا اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنانا اور لوگ اس لونڈی کو لے کر گزرے جسے کچھ لوگ مار رہے تھے اور اسے کہہ رہے تھے کہ تو نے بدکاری اور چوری کی ہے تو میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا نہ کرنا تو تو نے کہا ”اے اللہ! مجھے اس جیسا (ہی) کرنا۔“ آخر یہ کیا بات ہے؟“

بچے نے کہا۔ ”وہ (حسین و جمیل گزرنے والا) شخص بڑا سرکش تھا لہذا میں نے دعا کی یا اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنانا اور یہ لونڈی جسے لوگ کہہ رہے تھے کہ تو نے بدکاری کی ہے، حالانکہ اس نے بدکاری نہیں کی تھی (اور کہتے تھے کہ تو نے چوری کی ہے، حالانکہ اس نے چوری نہیں کی تھی) تو میں نے دعا کی یا اللہ! مجھے اس جیسا (پارسا) بنانا۔“ (بخاری و مسلم)

سوال و جواب۔ اللہ اعلم۔
فوائد و مسائل :

1- اس حدیث میں صرف تین بچوں کے گوارے میں گفتگو کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد بنی اسرائیل

کے تین بچے ہیں کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث سے ان کے علاوہ بھی اصحاب الاخواند کے قصے میں بچے کا بولنا ثابت ہے۔
2- نفلی نماز کے مقابلے میں مال باپ کی پکار کو اہمیت دی جائے۔

3- نیک لوگوں کے لیے کرامت ثابت ہے۔
4- مومن پر بعض دفعہ بڑی بڑی آزمائشیں آتی ہیں، ایسے موقعوں پر صبر و استقامت ضروری ہے، بالآخر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدد فرماتا ہے۔

5- متکبرین اور ان کی مشابہت سے بچا جائے، چاہے ان کا ظاہر کتنا بھی حسین و جمیل ہو اور نیک لوگوں کے طور اطوار اختیار کیے جائیں کہ کامیابی اس میں ہے۔

جنہم میں

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب خیبر والا دن ہوا (یعنی جنگ خیبر ہوئی) تو اصحاب رسول میں سے کچھ آدمی آئے اور انہوں نے کہا کہ فلاں شخص شہید ہے اور فلاں شہید ہے، حتیٰ کہ ایک آدمی کے پاس سے وہ گزرے تو کہا ”فلاں (بھی) شہید ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ہرگز نہیں میں نے ایک چادر کی وجہ سے جو اس نے چرائی تھی اسے جنہم میں دیکھا ہے۔“ (مسلم) فائدہ :

معلوم ہوا کہ حقوق العباد شہادت سے بھی معاف نہیں ہوں گے، نیز مسلمانوں کے مشترکہ مال (قوی خزانے) میں خیانت بہت بڑا جرم ہے۔

خواتین ڈائجسٹ جنوری 2013 19





”بیمار کا حال اچھا ہے“

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہوکار بنے؟
ہے کوئی جو دیون ہار بنے؟
کچھ سال، مہینے، دن لوگو
پر سود بیاج کے بن لوگو
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں عمر کے توشہ خانے سے
جب نام ادھار کا آیا ہے
کیوں سب نے سر کو جھکایا ہے
ہم مانگتے نہیں ہزار برس
دس پانچ برس، دو چار برس
آسان بنے دشوار بنے
پر کوئی تو دیون ہار بنے
ہم بیٹھے ہی کشمکشوں لیے
سب عمر کی نقدی ختم کیے

اب گیت گیا شکایت گیا
ہاں شعر کا موسم بیت گیا
اب بیت جھڑ آئی پات گریں
کچھ صبح گریں، کچھ رات گریں
اپنے یار پرانے ہیں
اک عمر سے ہم کو جانے ہیں
ان سب کو ہم نے بلایا ہے
اور جھولی کو پھیلا دیا ہے
جب عمر کا آخر آتا ہے
ہر دن صدیاں بن جاتا ہے
جینے کی ہوس ہی زالی ہے
ہے کون جو اس سے خالی ہے
چہ پانچ برس، یہ چار برس
چھن جائیں تو لگیں ہزار برس
سب دوست گئے، سب یار گئے
تھے جتنے ساہوکار گئے

اڑتیس شعروں پر مشتمل یہ طویل نظم ابن انشاء
(1927-1978ء) نے نوکیلوں میں قیام کے
دوران 29 نومبر 1976ء میں لکھی اور مجلہ
”نفون“ لاہور میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ جب یہ
نظم ”نفون“ میں چھپی تو انشاء جی کے چاہنے والے ان
کے دوست ان کے مداح بری طرح آزرہ ہوئے، ان
کے دل تڑپ کر رہ گئے۔ یہ تو سیدھا سا دوا ایک ”توحہ“
تھا جو انشاء نے خود اپنے لیے لکھا تھا۔ جب ان چاہنے
والوں کے پیار بھرے گلے شکوے انشاء تک پہنچے تو
انہوں نے یہ مضمون لکھا ”بیمار کا حال اچھا ہے۔“ یہ
انشاء کا آخری مضمون ہے جو انہوں نے اس وقت لکھا
جب ڈاکٹروں نے انہیں لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ لیکن
جب ہم یہ مضمون پڑھتے ہیں تو اس میں ہمیں وہی
انشاء ملتا ہے، ہنستا مسکراتا ہوا، جس کے بارے میں
شفیق الرحمن کہتے ہیں۔

”ابن انشاء کی کتاب ہو، رسالے میں مضمون ہو یا
اخبار میں کالم، ان کا نام پڑھتے ہی ہونٹوں پر مسکراہٹ
آجاتی ہے کہ اب یہ ہنسائیں گے، پھر وہ ہنساتے ہیں اور
خوب ہنساتے ہیں۔“

”بیمار کا حال اچھا ہے۔“ بھی ایسا ہی مضمون ہے۔
حالانکہ یہ مضمون انہوں نے اسپتال کے بیڈ پر بیٹھ کر
لکھا اور ان پر یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ان کا مرض لاعلاج
ہے اور اب وہ زیادہ دن نہیں جییں گے۔ لیکن اس کے
باوجود ان کی تحریر میں خود رحمی کی کوئی جھلک ڈھونڈنے
سے بھی نہیں ملتی۔ وہ پر امید ہیں اور اپنے قاری کو بھی
امید اور تسلی دے رہے ہیں۔ مایوسی اور قنوطیت کے
بجائے وہی شکستہ انداز تحریر ہے جو ہمیں ان کے
دوسرے مضامین میں ملتا ہے اور جو ان کی خاص پہچان
ہے۔

ابن انشاء نے یہ مضمون موت کے سائے میں بیٹھ
کر لکھا اور ان لمحات میں بھی ان کی آنکھوں میں زندگی
کی چمک اور لبوں پر دل فریب مسکراہٹ ہے اور یہ
کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بڑے حوصلے کا کام

ہے۔ ایک خالص مزاح نگار کے لیے یہ بہت بڑی
آزمائش ہوتی ہے کہ کیا وہ اس حالت میں بھی اعلا
مزاح لکھ سکتا ہے، جب زندگی اپنی بھینک ترین شکل
میں اس پر حملہ آور ہو، اور انشاء جی اس آزمائش میں
پورے اترے ہیں۔ شکستگی کی ایک لہر ہے جو اس
مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔
خالص مزاح کے لیے تین چیزوں کی اشد ضرورت
ہوتی ہے۔

(1) ذہانت (2) ہمدردی (3) قوت
برداشت

ان تین چیزوں کے بغیر مزاح لکھنا ممکن نہیں، جبکہ
ابن انشاء کے یہاں یہ تین چیزیں اپنی صحت کے
ساتھ موجود ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کا زیر
نظر مضمون ”بیمار کا حال اچھا ہے“ میں ہمیں ملتا
ہے۔

”بیمار کا حال اچھا ہے“ دراصل ایک تفصیلی خط
ہے، ان چاہنے والے مداحوں کے نام جو انشاء جی کی نظم
”اب عمر کی نقدی ختم ہوئی“ پڑھ کر دل گرفتہ ہوئے
تھے۔ اس مضمون میں انشاء جی نے واضح طور پر لکھا
ہے کہ۔

”نفون“ میں ہماری نظم ”اب عمر کی نقدی ختم
ہوئی“ پڑھ کر بہت سے ہمارے دوست اور ہمدرد اور
محبت کرنے والے آزرہ ہوئے اور ہمیں خط لکھے۔
اسے اتنی اہمیت نہ دینی چاہیے۔ ہم نے اپنی زندگی کے
نفع نقصان کا گوشوارہ بنایا تو دنیا، کسی طرح اٹھانے میں
نہیں رہے ہمیشہ اپنے حق سے زیادہ پیاد۔

لبجے میں رجائیت کا عنصر غالب ہے۔ پورے
مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک رجائی انداز
نمایاں ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے نمائندے ان کا
آخری انٹرویو لینے لندن آئے، انشاء جی اس کا ذکر کس
قدر شکستہ انداز میں کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

”ہمیں معلوم تھا کہ خوش خیالی میں ایسا کر رہے
ہیں۔ جی۔ ہی۔ کی میں ہنستے رہے۔ ان کا دل کیا توڑتے، مگر

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے قومی ادارے پاکستان ٹیلی ویژن کے یہ پیسے ضائع جائیں گے، بلکہ اس انٹرویو کے دکھائے جانے کی حسب دل خواہ تقریب جلد ٹیلی تو شاید ان کی باز پرس بھی ہو۔“

لفظوں میں رجائی کھنک نمایاں ہے۔ لفظی مزاح کے سارے حربے ابن انشاء نے بڑی خوبی کے ساتھ مکمل مہارت سے اس مضمون میں استعمال کیے ہیں۔ لفظی مزاح، واقعاتی مزاح، پیروڈی، قاتل و قاتل کے ذریعے مزاح کا انداز۔ غرضیکہ صحت مند مزاح کی ساری صورتیں ہمیں اس مضمون میں ملتی ہیں۔

اسپتال میں موجود مختلف مریض کس طرح اپنی بیماری کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ دوسرے مریضوں سے سبقت لے جائیں اور جب کسی مریض نے حسب عادت انشاء جی سے پوچھا ان کے مرض کے بارے میں تو انشاء جی اپنے مرض کی تفریح بڑے خوب صورت اور شگفتہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں۔

”ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑا سا غم جاناں ہے۔ یہ مرض ایسا میں خاص کر ہمارے ملک میں زیادہ ہوتا ہے اور دیوانی ہے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا اس کی علامات بھی نثر میں بتانے سے لطف نہیں اور شاعری کا ترجمہ ہم سے نہیں ہوتا۔“

ابن انشاء نے اس مضمون میں لندن کے اسپتالوں، وہاں کی سہولیات، نرسوں اور ڈاکٹروں کا قاتل پاکستانی اسپتالوں سے نہایت اچھوتے انداز میں کر کے لطیف مزاح پیدا کیا ہے۔

”بستر کی پانچٹی میں کئی بٹن ہیں۔ بے ارادہ کسی بٹن پر ہاتھ پڑ گیا تو زمین چلتی شروع ہو گئی اور سر نیچے ٹانگیں اوپر ہوتی چلی گئیں۔ شیطانی کارخانہ ہے ہمارے ملک میں۔ ابھی تمہارا اوپر نیچے کرتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ جس طرف سے پلنگ اوپر کرنا ہو اوپر پاؤں کے نیچے اٹھیں رکھ دی جائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اٹھیں وقت پر نہیں ملتیں۔ تب یہ کام کتابوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک پائے

کے نیچے ”بھٹی زیور“ دوسرے کے نیچے علی پور کا ایلٹی ”آخر اند کر ذرا اونچا ہو جاتا ہے“ یوں کتابیں بھی بکسر بے کار چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی مصرف ہے۔“

اس طویل پیرا گراف میں لفظی مزاح کی بھی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ لندن اور پاکستان کے اسپتالوں کا قاتل کر کے بھی مزاح پیدا کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ لطیف قسم کا طنز بھی ہے اپنے لوگوں پر جو کتاب اور لفظ کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں۔ کتابوں کو بے مصرف سمجھنے کے بجائے اگر وہ ان سے بھرپور استفادہ کریں تو وہ اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

انشاء جی کے ہاں ”طنز“ (Satire) اور ”مزاح“ (Humour) توازن کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ انشاء جی کے ہاں طنز کے نتیجے لیکن بے آواز شہر میں جوان کی خیروں میں نوک وار سویوں کی طرح آبرو ڈال ہوتے ہیں کہ وہ بظاہر نظر آئیں یا نہ آئیں، لیکن ان کی چیخیں ضرور محسوس ہوتی ہیں۔ انشاء جی کے باغ و بہار اسلوب میں اس قدر شائستگی، نفاست اور خوش مزاجی برقرار رہتی ہے کہ نہ کسی کا دل دکھتا ہے اور نہ کسی فرد یا طبقے کے خلاف نفرت یا تحارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شگفتہ طبعی اور چابک دستی سے نہایت کڑی تنقید، تنقیض یا طنز کا بھرپور وار کر جاتے ہیں کہ پرانے محاورے کے مطابق سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاش بھی نہیں ٹوٹی۔ بقول اشفاق احمد!

”اوروں پر ہنسا، دوسروں کا خاکہ ڈانا اور طنز کی تیغ سے کشتوں کے نشے لگانا بڑا آسان کام ہے۔ ہر متکبر اسی طرح کیا کرتا ہے، لیکن یہ مزاح نگار کا کام نہیں ہے۔ مزاح نگار تو انشاء جی ایسا ہوتا ہے کہ جس کے رہنے میں تلخی نام کی کوئی چیز موجود ہی نہ ہو۔ نہ اصل زندگی میں نہ تحریر کے وجود میں۔“

”بیمار کا حال اچھا ہے۔“ میں ہمیں انشاء جی کے لطیف ”شوگر کوئڈ“ طنز کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

مثلاً ”ہمارے محکمہ پولیس اور اس کے کارناموں اور کام کرنے کے طریقوں کو کس خوب صورتی سے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔“

”ہمارے اور ان لوگوں کے دین میں بڑا فرق ہے۔ ان کے پادری لوگ اعتراف گناہ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تھانے دار وغیرہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ پادری کے سامنے برضا و رغبت اعتراف کیا جاتا ہے۔ مہرجوں کی دھونی یا برف کی سل اور پولیس والوں کے محاورے اور روزمرہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

اس مضمون میں انشاء جی نے ان لوگوں کی ذہنیت کو بھی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے جن کا تکیہ کلام ”پدرم سلطان بود“ ہوتا ہے۔ جو اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں اور خود پر اور اپنے حال پر توجہ نہیں دیتے۔

”تمہارے کرسی پر بیٹھیے۔ میں محمد بن قاسم سے بات شروع کرتا ہوں کہ ہماری ہر بات وہیں سے شروع ہوتی ہے۔“

یہ ابن انشاء کا خاص انداز ہے کہ وہ پطرس کی طرح اپنی ذات کو ہدف بنا کر دوسروں کو خود پر ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایک سچا مزاح نگار اگر اپنی ذات کے حوالے سے بات کرتا ہے تو یہ اگرچہ ہر لمحہ خارج پر نظر رکھتا ہے، لیکن جب موقع مطالبہ کرتا ہے تو اپنی ذات کو ہدف بنانے سے گریز نہیں کرتا اور دوسروں کو بھی اپنے آپ پر ہنسنے کی دعوت عام دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی افاد طبع کی کشادگی اور وسعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اپنے آپ پر ہنسنے کے لیے بڑے وقار اور وصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انشاء جی کی فنی چابک دستی یہ ہے کہ ان کی ذات پر ہنسنے والے کو جلد ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ انشاء جی پر نہیں بلکہ خود اپنے آپ پر ہنس رہا ہے، انشاء جی کی تحریر کے آئینے میں چھلکنے والا عکس تو خود اس کا اپنا ہے۔

”ایک نرس کو ہم نے ایک اور نم، تین چار کیلے دیے اور کچھ انور بھی تو اس نے ازراہ شفقت ہمارے

ماتھے کو چوم لیا، اگر ایک دو سیب اور ایک آدھ ناشپاتی بھی دے دیتے تو شاید اسے اس عمل کے لیے موزوں مقابلت بھی معلوم ہو جاتے۔ یہ ہمارا قیاس اور خوش خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل ہمارا ارادہ اس حکایت کو تھوڑے سے حسن بیان سے لذت نہ رہنا تھا۔ آخر سب ہی لکھنے والے اپنے سفر ناموں اور اسپتال ناموں میں ایسا کرتے ہیں۔“

یہاں اپنی ذات کو ہدف بنا کر ایسے لکھنے والوں پر چوٹ کی ہے جو اپنی ذات کو اپنی خیروں میں مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایسا مبالغہ جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس مضمون ”بیمار کا حال اچھا ہے“ میں انشاء جی نے خواتین کے حوالے سے اور اس خاص طور پر نرسوں کے حوالے سے بے باک انداز میں گفتگو کی ہے۔ یہ بے باکی اس لیے بھی اس مضمون میں آئی ہے کہ جب کسی کو پتا چلے کہ اس کی زندگی کے آخری دن ہیں تو شعوری طور پر نہ ہی لاشعوری طور پر وہ یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ کہتا ہے کہہ ڈالوں۔ شاید انشاء جی کے لاشعور میں بھی یہی بات چھپی ہوئی تھی۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

”ہمارے بعض دوست جو اسپتال میں رہے ہیں رات میں کئی کئی بار مصنوعی تنفس لیا کرتے تھے، بلکہ ایسے ماہر ہوئے کہ خود نرسوں کو دیا کرتے تھے۔ بتاتے ہیں کہ اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ کوئی کام کا میا نظر آیا تو ہم بھی یہ علاج آزما دیکھیں گے۔“

”ہم اپنے محبوب مصنف ہیں۔ کیا انداز تحریر ہے۔ کئی بار تو اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ قاعدے سے یہ کام کوئی اور کرتا اور صینہ تائید میں کرتا تو بہتر ہوتا ہے۔“

غرضیکہ اس مضمون میں شگفتگی، شوخی اور شائستگی کی ایک لہر ہے جو آغاز سے انجام تک رواں ہے اور اس لہر کی روانی کو برقرار رکھنے کے لیے انشاء جی نے مزاح کا ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ لفظی مزاح کی بے شمار مثالیں اس مضمون میں موجود ہیں۔ مثلاً ”آخر

ہسپتال کے باہر سے ہماری اپائنٹمنٹ ہوئی۔ نام تھا مسٹر کافن یعنی جناب تابوت۔ خاصا نام مبارک نام ہے۔“ طرز و مزاج میں تحریف نگاری ابن انشاء کا خاص میدان ہے۔ وہ تحریف سے پیدا ہونے والے گہرے تاثرات کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ پیروڈی کی صنف سے وابستہ فنی امکانات سے انہوں نے اکثر بہت کام لیا ہے۔ اس مضمون میں بھی پیروڈی کی خوب صورت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ”فیض احمد فیض کے ایک معروف مصرعے کی پیروڈی ملاحظہ کیجئے۔“

”اب آپریشن تھم کی طرف پابجولاں چلے دست افشاں چلے“

”بیمار کا حال اچھا ہے“ یہ مضمون دراصل روداد ہے ان شب و روز کی جب انشاء علاج کی غرض سے لندن کے ایک ہسپتال میں مقیم (ایڈمٹ) تھے۔ لہذا ہسپتال ڈاکٹروں، نرسوں، وہاں موجود ساسھی مریضوں، ان کی تکلیف، بیمار اور ان کے رویوں کے بارے میں، ہسپتال کے اندر کے ماحول اور باہر کے موسم کے بارے میں۔ اپنی بیماری، دکھ، تکلیف، درد، آپریشن، اپنوں سے دوری، دیار غیر میں وطن اور وطن کے لوگوں کی یادیں۔ یہاں کے ہسپتالوں، ڈاکٹروں، نرسوں کا موازنہ اور تقابل اپنے وطن کے ہسپتالوں، ڈاکٹروں اور نرسوں سے نہایت شوخ، شگفتہ، بڑا، سنجہ اور رجائیت آمیز انداز میں پوری جزئیات کے ساتھ لکھا۔ ہسپتال میں گزرے ان شب و روز میں کئی دفعہ ایسا موقع بھی آیا کہ اپنی تکلیف، اپنی بیماری جو سب سے بڑی لگتی تھی، دوسرے مریضوں کے سامنے بچھوس ہوئی۔ ایسے میں کئی بار اللہ کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا۔

زندگی کے اس موڑ پر جبکہ موت چند قدم کے فاصلے پر تھی انشاء جی یا سب اور قنوطیت کا شکار ہونے کے بجائے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں موت کا خوف نہیں



جمع و تفریق کے اس مسلسل عمل میں جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں وقت کے آئینے میں کوئی عکس بھی اک پل سے زیادہ ٹھہرتا نہیں

شب و روز کی گردشوں کے تسلسل میں وقت کا سفر جاری و ساری ہے۔ وقت کس اس سفر میں کسی لمحہ کو دوام نہیں، کوئی لمحہ ٹھہرتا نہیں ہے۔ وہ خوشیاں، وہ غم جن سے ہم ہو کر گزرتے ہیں۔ وقت کا سیل رواں انہیں بہا کر لے جاتا ہے۔ آئیں، آنکھیں، جینٹیل اور باتیں عمر رواں کا رزق ہو جاتی ہیں۔ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں اور تعبیریں وقت کے دشت حیرت میں کھو جاتی ہیں۔ یہ تماشا کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔

امروز کا پروا ہو، ماضی ہو کہ فردا ہو اک بھید اٹکھا ہے، اک راز یہ گہرا ہے

عمر کے اس سراب اجل خیز میں بے برسوں کے کچھ نشان رہ جاتے ہیں، کبھی مسکراہٹ بن کر اور کبھی آنسوؤں کی صورت یادیں جو کبھی ہنساتی ہیں، کبھی رلاتی ہیں۔

نئے سال کی آمد پر دل میں جہاں کچھ امیدوں کے چراغ روشن ہوتے ہیں، وہاں جانے والا سال کچھ دکھ اور ملال بھی چھوڑ جاتا ہے۔

ایک اور نیا سال ہمارے سامنے ہے۔ نئے سال کی آمد پر اپنی قارئین کی شرکت کے لیے حسب روایت سروے شامل ہے۔

سوالات یہ ہیں۔

(1) گلیا سال کیا رہے گا؟ کوئی ملال، کوئی خوشی، کوئی خوب صورت احساس یا آگہی؟

(2) 2012ء کی ابتداء میں آپ نے خود سے کئی عمدہ پیمائیں کیے ہوں گے۔ ان میں سے کتنے پایہ تکمیل کو پہنچے اور کتنے ادھورے رہ گئے؟

(3) اس سال جو کتابیں پڑھیں۔ ان میں سے کس کتاب نے آپ کو متاثر کیا؟

(4) کوئی شعری اقتباس جو آپ کو اچھا لگا۔

آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

نئے سال کی دہلیز پر

ادارہ

قرۃ العین خرم ہاشمی..... لاہور

میں کھو گئے ہیں اور کھوئی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ کہتے یہ بھی ہیں کہ جو چیز ہمیں بھوئے دوبارہ

وہیں ہی سے مل جاتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وقت سے کہو کہ اپنا پہلہ پیچھے گھمائے۔ مجھے بھی اپنی کھوئی ہوئی

من تلاش تو روم پایہ تلاش خود روم عقل و دل نظر ہمہ کم شدگان کوری تو میں تیری تلاش میں نکلوں یا اپنی تلاش میں جاؤں، میری عقل دل اور نظر سب کے سب تیرے کو پے



اشفاق احمد ”زاویہ“ میں عشق حقیقی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”اس دنیا میں سب سے بڑا افلاس محبت کی کمی ہے۔ جس شخص میں محبت کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی وہ اپنے پرائیویٹ دنیا میں ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ جو محبت کر سکتا ہے وہ جنت کے مزے لوٹتا ہے۔ لیکن محبت کا دروازہ ان لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنی انا اور اپنے نفس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اپنی انا کو کسی کے سامنے ہمال کر دینا ”عشق مجازی“ ہے۔ اپنی انا کو بہت سوں کے آگے پال کر دینا ”عشق حقیقی“ ہے۔“

انجیلہ انا..... چکوال

(1) عمر عزیز سے ایک اور سال ختم ہونے کو ہے۔ اس بار گزرے دنوں کا حساب لگاؤں تو..... لگتا ہے سب کھویا ہی ہے۔ میں جو بہت پر امید رہا کرتی تھی بہت قنوطی اور آدم بے زاری ہو گئی۔ میرے اندر وہ جو رنگوں، تلیوں، خوشبوؤں سے محبت کرنے ایک والی لڑکی رہتی تھی وہ مر گئی (یا شاید میں نے خود مار دیا) آگئی یہ ملی کہ ”انجیلہ! اس کہہ ارض پر تم جیسا کم تر کوئی نہیں۔“ نجانے پھر بھی ذات کا غور مٹی کیوں نہیں ہوتا۔

اور اس سال کا سب سے خوب صورت احساس..... آپ بتائیں اگر کوئی آپ کی محض مسکراہٹ یا

عرض کیا ہے کہ زندگی اتنی تیزی سے رنگ بدلتی رہی کہ خود سے باندھے عہد و بیان نہیں ہو میں تحلیل ہو گئے۔ رہ گئے تو وقت کے بتائے اور سکھائے گئے اسباق

(3) اس سال کتابیں خریدنے یہ زیادہ زور رہا۔ انہیں ہر روز بک شاپ میں لگا دیکھ کر خیال آتا ہے کہ گیان دینے کے لیے سفید داڑھی والے بزرگ ہاتھ میں لالھی ٹیکے پر سوچ نظروں سے ہمیں گھور رہے ہیں۔ مگر ہمارے ہاتھ میں ”کتاب زیست“ دیکھ کر مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔

”راجہ گدھ“ کو شروع کیا تھا مگر ابھی تک ختم نہیں

کیا۔ ہاں جہاں تک متاثر ہونے کی بات ہے تو ”کتاب زیست“ سے زیادہ کس چیز نے متاثر کرنا ہے۔

(4) کچھ اشعار ہیں جو آج کل ذہن سے چپکے بیٹھے ہیں۔

علم و حکمت کا جنہیں شوق ہوا آئیں نہ ادھر کوچہ عشق میں کچھ بھی نہیں حیرت کے سوا

مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی تو ہے موجود اس قدر مجھ میں اور پسندیدہ اقتباس میں سے ایک حاضر خدمت ہے۔



مگر کچھ لمحے کچھ روپے صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ ہمیں نیند سے جگایا جائے۔ ہمیں بتایا جائے کہ ہم انسان سیراب کو جنت بھنے کی غلطی کر رہے ہیں۔ سفر اتنی جلدی ختم نہیں ہوتے۔

اس سال بہت اچھے بہت پیارے کچھ دوست کھو گئے۔ جن پہ کمال تھا بہت..... وہ ہی اپنے نہ رہے۔ اب ان کی یادوں کی قبر پر دل اکثر درد سے رو پڑتا ہے مگر خیر..... اس کا نام ہی زندگی ہے۔

باقی اس سال ”محبت“ کا قلف بھی صحیح طرح سے سمجھ میں آنے لگا۔ نجانے اس محبت کے بھی کتنے روپ ہیں۔ ہر روپ ہی عقل کو دنگ کر دیتا ہے مگر ہر بات کا حاصل یہ ہے کہ جس کے پاس محبت ہے..... اس کے پاس سب کچھ ہے سب کچھ کھونے کے باوجود بھی..... واقعی اس دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت احساس کوئی نہیں ہے۔ محبت فلاں عالم.....

(2) آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ عشق کی گرمی ہے معرکہ کائنات علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات

میں خود سے بہت زیادہ عہد و بیان نہیں کرتی اور نہ دوسروں سے۔ اگر کروں تو بھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر دوسروں سے خود سے نہیں!!!

تماشائے ذات نے ہی اتنا دنگ کر دیا ہے کہ ہم صرف تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں نے پہلے ہی

چیزیں واپس لیتی ہیں۔

سال کے بارہ مہینوں میں کتنے دن اور شامیں ایسی ہیں جو دل کے آنگن میں رک گئی ہیں۔ ان کے ہونے کا احساس ہر بل ہوتا ہے۔

یہ سال ابتدا سے ہی کچھ مشکل سا رہا۔ کھونے کا عمل سارا سال چلتا رہا اور ہم حیران و پریشان آسمان کو تکتے اور سوچتے کہ یہ سال ہم سے کیا کچھ لے گیا ہے؟ مہینہ کوئی بھی آئے..... مہینہ کوئی بھی چائے کسی موسم، کسی رت کی ترناب نہیں باقی.....

وہ سارے مومسوں کے ساتھ بستا ہے مرے اندر

مگر اس کھونے کے عمل میں پہلے دکھ رہا پھر آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ کھونے کے اس عمل ہی سے تو آگئی نے کشید ہونا تھا۔

بہت بار ایسا ہوتا ہے ناں کہ ہم سفر کرتے کرتے راہ میں سستلنے کے لیے بیٹھتے ہیں اور آگے کا سفر بھول جاتے ہیں۔ راہ کی دل فریبی میں کھو جاتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ جو سفر کئی سال پہلے شروع کیا تھا اپنی ذات کو پانے کا، اسے تلاش کرنے کا وہ ایک جگہ آکر رگ سا گیا۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ اب اس سے آگے کیا ہے؟ اگر دنیا میں ہی ہمیں جنت مل جائے ہم محبت کے خدا بن بیٹھے تو پھر سفر سے کیا لینا دینا؟



(2) بہت کوشش کی خود سے بار بار وعدے کیے کہ کسی بھی طرح اپنی اتار بست اور ضدی طبیعت کی نفی کروں مگر وہی مرغلے کی ایک ٹانگ۔ مجھے تو لگتا ہے میں مزید ضدی اور اتار والی ہو گئی ہوں۔ اچھا کام کرنے کا کوئی عمدہ کیا ہی نہیں کبھی۔ ہاں اب یہ اور بات ہے کچھ اچھے کام جن کا کوئی ارادہ ہو نہ ہو کیا ہو خود ہی ہو جاتے ہیں۔

(3) مکتبہ تو میری زندگی کا لازمی جزو ہے اتنا کہ بہت زیادہ ٹف جاب کے باوجود میاں صاحب کو بھی عادی کر دیا مطالعے کا (سول انجینئرنگ کے بعد پاکستان کے حساس ادارے سے منسلک ہیں) کتابوں کے معاملے میں بھی ہم خوش نصیب ہیں (ہر معاملے کی طرح) بانو قدسیہ، مستنصر حسین، بی بی خان، ثارث، ممتاز شفیق، عمار مسعود، کرنل محمد خان، اشفاق احمد اور بھی کچھ نام ہیں جو عمار صاحب (بھتیجے) کے شور مچانے کی وجہ سے یاد نہیں آ رہے سب ہی کو بہت پڑھا، بہت لطف اٹھایا۔

ہر کتاب کا نیا سرور، ہر کتاب میں اک الگ ہی احساس، لیکن نجانے کیا تھا اس بار بار رمضان میں جب جب سورہ رحمن و سورہ یاسین کو تلاوت کی تو دل کی دنیا تہہ دبلا ہوئی اور اگلی بار ہوئے نہ ہوئے کا احساس بہت شدت سے دامن گیر ہوا۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقریباً ہر کتاب کے مطالعے کے دوران کہیں کہیں

یادیں شعر۔ ہر شخص کو اک وصف میں ہوتا ہے کمال بندے کو کمال بے کمالی میں ہے اب بات ہو جائے اقتباس کی تو اسکول میں قائد ڈے کے حوالے سے ایک اخلاقی خاکہ لکھا گیا، جس کے چند جملے۔ ”دنیا کی مثال بچوں کے لیے کھلونوں کی دکان جیسی ہے۔ جس کے ہر کھلونے کو دیکھ کر ان کا دل چلتا ہے، بھلے وہ کھلونان کے نفع کا نہ ہو، مگر ہم ہر کھلونے کو نہیں دلا سکتے! لہذا اسی روک ٹوک بھی از حد ضروری ہے۔“

سحر خان..... کوئٹہ

(1) گیا برس ملال و حسرت ہی نہیں خوب صورت ترین احساس ہے پناہ خوشی اور آگہی سب ہی کچھ دے گیا۔ سال کے شروع مہینوں میں تو کچھ خبری نہیں تھی مگر 4 مئی کی خوب صورت ترین دہر میں نکاح کے

بندھن میں بندھ گئی۔ عبدالرزاق میرے شوہر نے اپنا نام دے کر مجھے بہت محترم کر دیا وہ غنی رشتے جو انسان کے لیے بہت اہم ہوا کرتے ہیں۔ ان کے اسے ہونے کا اور اک تو ابو کی وفات کے بعد ہی ہو گیا تھا مگر نکاح کے بعد کچھ بے حد قریبی رشتوں کا بہت بھیاں کچھ نظر آیا۔ میرے لیے ان قریبی رشتوں کے ”اپنے پن“ سے آگاہ ہونا بیل مرنے سے کم نہیں۔

چلے آؤ، چلے آؤ، یہ رحمن کا گھر ہے مجھے قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی توفیق ملی۔ اب میں اپنے تاثرات زیر قلم لانے سے قاصر ہوں۔ چند آیات کا مفہوم ہے جن میں اللہ رب العزت اپنے لیے فرماتا ہے۔ ”سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں اور کوئی آنکھ اسے احاطہ نہیں کر سکتی۔“ ”میری تو اللہ ہے، پھر کہاں سے پھرتے ہو۔“ ”اللہ کی قدرت نہ جانی جیسی چاہیے تھی۔“ ”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔“

ہر ہر لفظ پڑھ کر لگتا دل گویا پکھل کر آنکھوں کے رستے بہ جائے گا اور پھر صد ہا صد شکر مولا کریم کا،

جس نے مسلمان بنایا اور اس عظیم کتاب کو پڑھنے کا شرف بخشا۔

(4) کوئی شعر۔ ارے جناب طویل فرست ہے پسندیدہ اشعار کی۔

سوچا ہے کہ تجھے میں بھیجوں گا انہیں آنکھیں درشن کا درشن ہو، نذرانے کا نذرانہ

وہ لمحے آئے قربت کے
ستیں وہ صدیاں لمحوں میں

آنکھوں کی نمی یا پلکوں کی لرزش سے دل کا حال جان لے تو کیسا محسوس کریں گے آپ؟

یقیناً ”بہت اچھا نا۔۔۔ ایسا ہی میں محسوس کرتی ہوں جب میمونہ (جسے بھی میں موتا، مونو یا میمون کہتی ہوں) کے دل کی بات میری زبان پر اور میرے دل کی بات اس کی زبان پر ہوتی ہے۔ جی جناب! سال 1990ء کا سب سے خوب صورت احساس میمونہ رہی ہے۔

(2) بھی میں بڑی بے قاعدہ سی بد سلیقہ قسم کی لڑکی ہوں۔ عمدہ دیکھاں کروں اور وہ بھی خود سے۔ کاش! کہ اتنی اچھی ہوئی انیقہ! اٹو کیا کہنے تھے۔ کہنے کو تو روز رات کو عمدہ کرتی ہوں۔ کئی ایک۔۔۔ پر۔۔۔ اب جانے دیں۔ کیا کہوں، میرا خیال ہے اس سوال کو یونہی چھوڑ دیتی ہوں۔“

(3) کون سی کتاب۔۔۔

بشری سعید کا ”سفال کر“ (اگرچہ تاحال کتابی شکل میں نہیں ملا) آئیہ مرزا کا ”دل اک شہزادوں“ ”نمرہ احمد کا“ ”بیلی راجپوتان“ علامہ راشد الخیری کی ”زلف و زنجیر (زبان و بیان کا شاہکار) سبھی کتابیں اپنی مثال آپ تھیں۔

لیکن ہوا یوں کہ اللہ نے مجھ پر کرم کر دیا۔

اگرچہ میں اس قاتل نہ تھی۔

جو بہت سے رے مجرم تو رحمت نے کہا بڑھ کر

میں نے اللہ کا ذکر اور قرآن کی فکر کو بار بار پڑھا اور میرے لیے یقیناً ”قرآن کریم کا مطالعہ بہترین اور متاثر کن رہا۔“

(4) سارا سال ذہن و دل میں گردش کرنے والا شعر

صرف میری ہی نہیں پورے ملک کی حالت کا غماز ہے
آپ بھی پڑھیے اور بہت نہیں تو ایک بار ضرور سوچیے گا!

قیقہتی چادریں مزار پر
زندگی بے لباس پھیرتی ہے
سحرش اسلم..... اسلام آباد

(1) دوسرے سالوں کی نسبت میرا یہ سال بہت خوش گوار گزرا۔ رشتوں کے خوب صورت احساسات سے بھرپور آگئی ہوئی۔ ہر رشتے کا خوب صورت رنگ نظر آیا۔ خاص طور پر میری فیملی کے افراد کے بارے میں جن کے بارے میں کبھی کبھی میں بدگمان ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دوستی کے رطلوں سے آشنائی ہوئی۔ اپنی دوست کے ساتھ اس سال کے بہت سے دن یادگار ہیں۔ یہ پیل ہمیشہ یاد رہیں گے۔ خدا کا شکر ہے کوئی غم نہیں ملا۔

(2) میں نے سال کی ابتدا میں نماز کی باقاعدگی کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن یہ وعدہ کسی حد تک پورا ہوا ہے۔ ویسے خدا کا شکر ہے کہ میرا اور اس کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے معاملات میں میں نے کوئی ارادہ نہیں کیا تھا کیونکہ میں کل کی نسبت آج کو بھرپور انداز میں جیتی ہوں اور آج کے بارے میں ہی سوچتی ہوں۔

(3) میں نے اس سال ہر سال کی طرح بہت سے ڈائجسٹ پڑھے جن میں خواتین ڈائجسٹ بھی شامل ہے۔ اس ڈائجسٹ کا صفحہ ”کرن کرن روشنی“ بہت سبق دیتا ہے اور اسلام کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے۔

(4) ”جھوٹ بول کے مجھے خوشی دینے سے بہتر ہے

کہ سچ بول کے مجھے دکھ دے دو۔“
مجھے علم نہیں ہے کہ یہ کس کا جملہ ہے لیکن یہ مجھے بے حد پسند ہے کیونکہ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے اور میری فطرت بھی کچھ ایسی ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ بات بہت پسند آتی ہے۔

شائستہ جاوید..... کراچی

ماہ و سال گزرنے میں دن رات کے آنے جانے میں اللہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے یہ آتے جاتے سال یہ بدلتے موسم ہمیں احساس دلاتا ہے کہ ”کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔“

سال 2012ء بھی ہمیشہ کی طرح ملا جلا رہا۔ کبھی خوشیوں مسرتوں کی ہرسات ہوئی تو کبھی غم کی لویلی۔

(1) ملکی حالات پر کیا کہوں کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہر شخص پریشان ہے ہر کوئی خوف زدہ۔ ہمارے بارے میں شہر کرچی کو کسی کی نظر لگی ہے۔ ہر روز خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے ٹارگٹ کلنگ، مہنگائی، بجلی، گیس سی این جی، پیٹرول کی کمی، آئے دن کی ہڑتالوں نے کراچی کے عوام کو خون کے آنسو رلا دیا ہے ”جائیں تو جائیں کہاں“

(2) ہر سال کی طرح 2012ء میں بھی بہت سے عہد و پیمان کیے۔ کچھ کر گزرنے کا عزم پھوٹے موٹے بڑکس بھی کیے۔ کچھ کامیاب ہوئے اور کچھ ناکام بھی۔ آج کل میری جو پوری چلا رہی ہوں کچھ فلاحی کام بھی کر رہی ہوں۔

(3) خواتین شعلع، کرن کے علاوہ جون ایلیا کی ”شاید“ سعید اقبال کی ”کہاں ہوتے ہو“ محمد عمران انجم کی مرتب کی ہوئی کتاب ”تم میری محبت ہو“ جس میں انہوں نے تمام ماہ نامہ شاعروں کے کلام کو (غالب سے لے کر وصی شاہ تک) سب کو ایک جگہ کر دیا ہے۔ پروین شاکر کی ”خوشبو اور وصی شاہ کو بھی پڑھا اور سب ہی نے متاثر کیا۔

(4) یوں تو بہت سے اشعار نے دل کو چھوا مان گنت اقتدار نے روح کو جھجھوڑا مگر ایک نظم ”ماں“

مجھے بہت اچھی لگی (ماں پر کی گئی ہر لقمہ ہر اقتباس دل کو چھو تاہی ہے)
”ماں“ یہ تو بتاؤ!

کہ گھر وندے رت کے ہی کیوں ہوتے ہیں؟
جو پاؤں باہر نکالتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں

کچی عمر کے خواب ہمیشہ شوخ رنگ کے ہی کیوں ہوتے ہیں؟
آگئی سے پہلے ڈراؤنے خواب کیوں نہیں آتے؟

لڑکیاں اتنی بڑول کیوں ہوتی ہیں؟
تم ان کی تربیت میں ”صبر“ کی سر کیوں لگاتی ہو؟
لڑکیوں کی زندگی گھومتا پیسہ کیوں ہوتی ہے؟
جانے کس پل کون سا موڑ سامنے آجائے؟
پیارے ماں!

ایک بات تو بتاؤ!
تم اپنے ہر کپ کو دودھ کے ذریعے اپنی بیٹی کی رگوں میں کیوں اتارتی ہو؟
بتاؤ ناں ماں!

بتاؤ ناں!
صائمہ گل..... گاؤں چمٹھیری ضلع مردان

(1) کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا ایک اور سنہری سال گیا
جی ہاں! انسانی زندگی تو دکھ سکھ اور نشیب و فراز سے ہی مزن ہے۔ ہر گزرتے سال کی طرح اس سال نے خوشیاں بھی دکھائیں۔ اور کچھ دکھوں کا سامنا بھی کر رہا۔ انفرادی طور پر گزشتہ سال میرے لیے خوش کن رہا۔ اپنی پہلے مہینے کی 9 تاریخ کو ”محمد طلال“ بیٹی کی آمد نے ہمارے گلشن کو مزید مرکابا۔

میرے اکلوتے بھائی کی منتی کی یادگار تقریب۔ شادی کے سارے ارمان منکلی ہی نکل لیے۔ صرف دس دو ہیں رہ گئی۔ ابھی اسے شادی پر لائیں گے نا!
(2) میں عہد و پیمان کی حامی نہیں ہوں کیونکہ وہ

کتے ہیں ناکہ! وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ جو بھی کرتی ہوں۔ وقت اور حالات کو پیش نظر رکھتی ہوں۔ عہد و پیمان میں خود کو نہیں باندھتی۔

(3) ”مصنف“ کو پڑھ کر میرے خیال میں ہر قاری بہن نے میری طرح سمجھ کر قرآن پڑھنا شروع کر دیا ہو گا۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ رمضان میں چھ بار قرآن

ختم کرتی تھی لیکن مصنف کے بعد ہر آیت کو سمجھ کر پڑھتی ہوں یوں جیسے دل میں اتر رہا ہو۔ وہ جو میں ہر مشکل اور نصن وقت میں ناامید ہو جاتی تھی اب صبر کا دامن تھامے رکھتی ہوں اور اللہ میری مشکل آسان کر رہا ہے۔

(4) اقتباسات تو بہت زیادہ ہیں کیونکہ خواتین اور شعلع کی تمام راسخ روشنی اور تجلیات باندھتی ہیں لیکن یہاں فوزیہ فرخ نے انسانی نفسیات کی ترجمانی کچھ یوں کی ہے۔

”ہر انسان کی زندگی میں عروج و زوال دونوں ادوار آتے ہیں۔ ہاں! کسی کے لیے عروج کا زمانہ طویل ہوتا ہے اور کسی کے لیے زوال کا۔ اصل میں ان دونوں ادوار کی اپنی اپنی آزمائشیں ہیں جن سے انسان کو ہر حال میں گزرتا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اس کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کو عیش و آرام مسیا کیا جاتا ہے تو وہ مذہب کو بھول کر جشن منانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ تو اس کا حق ہے یہ تو اس کے لیے ہونا ہی چاہیے تھا اور جب زوال آتا ہے تو گلے شکوے شروع کر دیتا ہے۔ تقدیر کا لگہ زبانی کا لگہ زندگی سے گلہ عمت کی خواہش گویا ہر قسم کی تاریکی اپنے گرد سجا کر بیٹھ جاتا ہے یہ سوچے بغیر کہ یہ تو زندگی کے رنگ ہیں ان سے گزرتا ہے۔ پس کر گزرو چاہے رو کر گزرو۔ کیا ہو رہا ہے کیا ہونا چاہیے یہ تو انسان کے اختیار میں بھی نہیں دیا گیا۔“



جورنگہ گراں

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بدر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گراشفق ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد بنجیدی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بنائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ”شہناز“ نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو بھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے ”سید پور کچل شو“ میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہیانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ



بانو اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلٹر اظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلٹر اظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئٹے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلٹر اظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مولوی سراج اور آپا راجہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ ہے حد زین ہے مولوی سراج اور آپا راجہ کو اس بات پر غرور ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔ ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ہر جو کرتا تھا۔ ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور پھل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کھار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیو زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہریلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔ واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعدیہ سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹے اور خون بکھرتے دیکھا تھا وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھو لاری میں بڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر کھیاں جھنجھٹائی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا راجہ سے نماز یاد کر لی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوجا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والار کی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ چکی تھی۔ اس کی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ چھو پچی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی تو سوسیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرس میں ملے آئی۔

آپا راجہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔ ماہ نور سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیا سے اس کا پ رپاٹ کی۔ وہ فرن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فرن لینڈ آئی۔

جیناں بھکانے نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کر لیا۔ ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یاد تو یازا من بانو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

فلٹر اظہور سعد کو فون پر کسی تصویر کی نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فریگٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور فاطمہ اور خدیجہ کو فلٹر اظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہابی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمی جاننے کی اطلاع دے دی تھی۔

دسویں قسط

وہ رات کا نجانبہ کون سا پر تھا جب اس کے سہل فون کی بیل بجی۔ اس کی فون کی اسکرین روشن کرنے سے پہلے کال کرنے والے کو دل ہی دل میں خوب کوسا تھا اور ساتھ ساتھ خود کو بھی کہیں سونے سے پہلے فون کو سائنٹسٹ پر لگانا بھول گیا تھا۔ سیدھے لیتے ہوئے اس نے آنے والی بیل کو نظر انداز کیا۔ کال ایک دفعہ بند ہوئی اور ایک وقفے کے بعد فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر فون کرنے والے کو کوسا اور کونٹے لے کر فون اٹھایا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے لیکن فون کرنے والے کا نام پڑھ کر اس کی جھجھلا ہٹ ہوا ہو گئی اور وہ بے اختیار مسکرایا۔

"مجھے اس بات کی کوفت کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ تم نے وہ تصویریں میرے علاوہ جس کو بھجوائیں اس کا نام فلٹر اظہور ہے۔"

فون کان سے لگنے پر اسے ایک کڑوی تلخ اور غصے سے بچھو تاب کھاتی آواز سننے کو ملی۔

"میں نے سوجا اگلی میں ہی کیوں جاگوں؟ تم کیوں نہ جاگو۔ اس وجہ سے۔" اس نے اس بات کے جواب میں منہ سے نکلنے والی ہنسی کو بمشکل دبیایا۔

"وہ تو مسٹر پولیشم تھی اسے دیکھ کر تمہیں

Strogoika Manor کا مشروب یاد آ گیا تھا۔ اچانک وہ تمہارے اتنے قریب کیوں ہو گئی کہ ایسی میل جس کا عنوان "جسٹ فاریو" ہے تم نے اسے بھی بھجوا دی۔" وہ کسی بھی ہوئی شہنی کی طرح دھاڑ رہی تھی رات کی خاموشی میں فون پر بھی اس کی سانپوں کے زبردست کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"کیا ہو گیا بھئی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" سعد نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اکھڑی نیند سے بوجھل ہوتی آواز میں کہا۔

"اپنی وہ میل چیک کر دو جو تم نے مجھے بھیجی ہے۔" وہ ایک بار پھر دھاڑی۔

"اس کے ایڈریسز کون کون ہیں ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

"اوہو! لگتا ہے کوئی ٹیکنیکل بلیٹنڈ ہو گیا ہے۔" اس کو سیکنڈ زیمں شرارت سوجھی۔ "دراصل میں نے اپنی حالیہ گرل فرینڈ کا نام فلٹر اظہور رکھا ہوا ہے اور اس کو بھی بول دیا تھا کہ اپنی آنی ڈی اسی نام سے بنائے۔"

"حالیہ گرل فرینڈ۔" دھاڑتی آواز قدرے پست ہوئی "تم گرل فرینڈ زبمی بناتے ہو؟" رقابت کا دھارا کسی اور سمت کو بہنے لگا تھا۔

"اور نہیں تو کیا۔" اب وہ مکمل طور پر جاگ چکا تھا اور اس گفتگو کا مزہ لینے لگا تھا۔ "آج کے زمانے میں وہ کون سا لڑکا ہو گا جس کی گرل فرینڈ زندہ ہوں۔"

"میرے بھائی سلمان کی تو کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "وہ آج کے زمانے ہی کا لڑکا ہے اور عظمی پچھو کے تیلو بیٹوں کی بھی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہیں۔ ساریہ کا بھائی علی۔ اتنا ہیڈ سم اتنا ڈشنگ لڑکا ہے مگر انتہائی شریف ہے اس کی بھی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"چھ تو تم مجھے بد معاش قرار دے رہی ہو۔" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔ "ٹھیک ہے۔"

"میں صرف گرل فرینڈ کی بات کر رہی ہوں۔" جواب میں اس نے بتایا۔

"ہوئی ہیں یا راسب لڑکوں کی گرل فرینڈ زبمی ہیں؟ کچھ چمچے رہتے ہیں اور کچھ میری طرح حل کے صاف اسٹریٹ فارورڈ جیسے ہیں ویسا ہی خود کو ظاہر کرنے والے۔"

"نہیں خیر exceptions بھی ہوتی ہیں۔" آواز پست ہوتے ہوئے بالکل ہی دم ہو گئی۔

"چھ! یہ بتاؤ تم خود کو کس کیٹگری میں رکھتی ہو؟" سعد نے اسے مزید ستانے کا ارادہ کیا۔ "تم میری بوائے

فریڈ توہو نہیں، کیونکہ تم ایک لڑکی ہو پھر تم میری کیسی فریڈ ہو؟

”خیر! میں تمہاری گرل فریڈ تو ہرگز نہیں ہوں۔“ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا، بات تیری طرح جا کر ماہ کے دل و دماغ دونوں کو ہی لگی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے گرل فریڈ کیا ہوتی ہے؟“ اس نے دائیں طرف کروٹ بدل کر فون کان اور تکیے کے درمیان دبائے ہوئے کہا۔

”گرل فریڈ۔“ وہ سوچنے لگی اور پھر جواب سوجھنے پر بولی ”گرل فریڈ تو وہ ہوتی ہے جو بوائے فریڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی ہے۔“

سعد اس بار اپنے قہقہے پر قابو نہیں پاسکا۔

”کیا ہوا؟“ وہ تشویش سے بولی۔

”یہ بات ہے۔“ اس نے اپنی ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر جب تم یہاں تھیں اور ہم دونوں ادھر ادھر گھومنے اور کھانے پینے کے لیے نکلتے تھے اور اس کے لیے پہلے طے کرتے تھے کہ کہاں جانا ہے وہ ڈیٹ نہیں تھی کیا؟“

ماہ نور کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ اس کو کس قسم کی لڑکی سمجھ رہا تھا۔

”میرا خیال نہیں تھا کہ تم اس کو اس طرح یعنی اس نظر سے دیکھتے ہو گے۔“ اس نے دکھ سے کانپتی آواز سے کہا۔

”میں سچ اس کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔“ اس کی آواز میں دکھ کی آمیزش محسوس کر کے اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ لفظوں اور رشتوں کو ایک ہی لفظ سے ہانکنا غلط ہے۔“

”جو بھی ہے۔“ ماہ نور اس وقت گہری باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ”میرا خیال ہے مجھے پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ تم نے وہ تصویریں کی اور کو بھی کیوں بھیجیں، میں تمہاری نیند خراب کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔“

”ماہ نور!“ دوسری جانب سے اس کا نام اس طرح لیا گیا، جیسے کسی ایسے انسان کو مخاطب کیا جائے جس پر بہت مان ہو۔ ”خبردار جو تم ناراض ہو نہیں اور خبردار جو تم نے اپنا دل برا کیا۔ اس سے زیادہ خبردار جو تم نے فون بند کیا۔“

ایک سان بھری دھمکی آئی۔

”یار! تم سے زیادہ سہل لڑکی میں نے کوئی نہیں دیکھی ابھی تک۔ اگرچہ گھٹ گھٹ کا پانی پی چکا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور ماہ نور اس کی ہر بات سنتے ہوئے بار بار یوں سر جھٹک رہی تھی جیسے اس کی کسی بات کا بھی یقین نہ کر رہی ہو۔

”پاگل! گرل فریڈ تو ایک لفظ ہے جو عام طور پر دوست لڑکی کے لیے بولا جاتا ہے، ہم نے اپنے ذہنوں میں بس اس کا یہی خاکہ بنا لیا ہے کہ گرل فریڈ وہی ہوتی ہے جو ڈیٹ پر جاتی ہے اور پھر شش کو دھوکا دیتی ہے۔ ہے نا؟“ اس نے رک کر پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ سوسوں کی آواز کے ساتھ جواب آیا۔

”تمہیں یہ تو پتا ہے تاکہ تم میری اس قسم کی فریڈ نہیں ہو نہ ہی تم ڈیٹ پر گئی تھیں کبھی میرے ساتھ۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ پھر وہی جواب تھا۔

”کم آن ماہ نور! میں صرف تمہیں تنگ کر رہا تھا۔“ ایک ذرا سے مذاق پر لینے کے دینے پڑ جانے پر بالآخر سعد نے ہتھیار ڈالے ہوئے کہا۔

”تم پلیز روؤ نہیں، تم نے اچھی مخلص اور کیئرنگ دوست بائے گاؤ! کوئی دوسری نہیں ہے۔ میں تمہیں کیسی دوست سمجھتا ہوں، تمہیں اسی دن اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ جس دن تم نے سوال کیا تھا کہ کیا وہ سب کچھ میں نے کسی اور کو بھی بتایا ہے کبھی اور میرا جواب تھا۔ میں نے تمہیں اپنے معاملے میں شیور ہونا چاہیے۔ جو تمہارا دل کہتا ہے نا کسی بھی بات پر وہی سچ ہوتا ہے وہی حقیقت ہوتی ہے۔“

”میرا دل کچھ نہیں کہتا، وہ تو بالکل بے وقوف ہے ڈمب ہے۔“ ایک اور ناراضی بھر جواب آیا۔

”نہیں، تمہارا دل تو دنیا کے خوب صورت ترین دلوں میں سے ایک ہے کیونکہ وہ صاف، سچا اور کھرا ہے۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ ماہ نور کے ہاتھ چہرے پر پھیلے آنسو صاف کرنے لگے۔

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟“ وہ غری سے بولا۔ ”جھوٹ تو وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی لالچ ہوتا ہے۔ کوئی نفع نقصان کا چکر ہوتا ہے، جہاں مصلحت ہوتی ہے اور جہاں دھوکا دینا مقصود ہوتا ہے۔ میرا تم سے اس طرح کا کوئی واسطہ نہیں، میرے لیے تم ایک بہت قیمتی دوست ہو جسے میں کسی بھی صورت کھونا نہیں چاہتا۔“

”سچی!“ ماہ نور نے رونا دھونا بھول کر سوال کیا۔

”ہاں سچی۔“ وہ مسکرایا۔

”پھر تم نے فریڈنگ فرٹ جانے سے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔“ ماہ نور ابھی تک اس بات کو نہیں بھولی نہیں تھی۔

”غلطی ہو گئی۔“ وہ فوراً بولا۔ ”کان پکڑ کر معافی مانگتا ہوں اور خشک تم معاف نہیں کرو گی۔“ کان نہیں چھوٹوں گا۔“

”پہلے وعدہ کرو جہاں جاؤ گے مجھے ضرورتاً کر جاؤ گے۔“ ماہ نور نے موقع غنیمت جانے ہوئے مزید زحمت سے بچنے کا وعدہ لینے کی کوشش کی۔

”وعدہ کرنا ہوں۔ جہاں جاؤں گا، تمہیں ضرورتاً کر جاؤں گا۔“

”اور آئندہ تمہاری طرف سے آنے والی میل جو تم مجھے کرو گے میرے علاوہ کوئی ایڈریس نہیں ہو گا۔“

”وعدہ کرنا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اف ماہ نور! میرے کان لپے ہو جائیں گے۔ کب سے پکڑے ہوئے ہیں، اب معاف بھی کرو۔“

”ہاں۔ تم نے ابھی تک پکڑے ہوئے ہیں؟“ ماہ نور نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”تو اور کیا لال ٹائمر ہو گئے میرے کان۔“

”چھوڑو، چھوڑو پلیز۔“ وہ بے قراری سے بولی۔

”اف شکر ہے۔“ وہ شکر کا سانس لیتا ہوا بولا۔ ”کان لپے ہو جاتے تو لوگ تمہیں کہتے کس خرگوش کو دوست بنایا ہوا ہے۔“

”خرگوش۔“ وہ ہنس دی۔ ”پتا ہے جو کھاری ہے نا۔ اس نے ایک چینی یا شاید جاپانی خرگوش سے دوستی کر لی ہے۔“

”خرگوشوں کی بھی کوئی فیشننلٹی ہوتی ہے۔“ اس نے حیرت سے پوچھا ”گھوٹوں، ہاتھیوں، شیروں کی سنی تھی۔“

”ادو بھی! یہ اصلی والا خرگوش تھوڑی ہے یہ تو خرگوش کے کاسٹیوم والا چینی یا جاپانی لڑکا ہے جو بنگالی بھی بولتا ہے۔“

”کمال کا بندہ ہو گا بھی وہ ملٹی نیشنل انسان۔“ وہ ہنسا۔

”اب یہ پوچھنے میں بھی کوئی حرج ہے کہ اماں! یہ بتا دیں میرے کوئی ماموں، خالہ، پھوپھو، چچا یا نہیں۔۔۔ نہیں ہیں تو صاف کہہ دیں۔ یوں جھڑکیاں دے کر ٹالنا کیا بات ہوئی۔“

سعدیہ کی بات نے چوہے میں لڑکیاں رکھتی آپا رابعہ کو جیسے زوردار برقی جھٹکا لگایا تھا۔ انہوں نے چونک کر سعدیہ کی طرف دیکھا۔ اسکول کی نیلی قمیض، سفید شلوار اور بڑے سے سفید دوپٹے والی رووی میں ہلوس سعدیہ کو شاید ان دو تین سالوں میں پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ سعدیہ نے قد نکال لیا تھا۔ اس کا جسم بھر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچپن کے نشان معدوم ہو چکے تھے۔ اب ان کے سامنے اپنے آپ سے لا پرواہ، گلنڈری بات بے بات ڈر جانے والی سعدیہ کی جگہ ایک ذمہ دار، سمجھ دار اور پہلے کی نسبت پر اعتماد لڑکی بیٹھی تھی جو لڑکھن سے جوانی کا سفر طے کرنے میں مصروف تھی۔

”تم نے اس طرح بات کرنی کس سے سیکھی؟“ آپا رابعہ نے اس واضح طور پر محسوس ہوتی تبدیلی سے آنکھوں میں پیدا ہونے والی جھپٹ کا احساس کم کرنے کے لیے پوچھا۔

”بات کرنا کون سیکھتا ہے بات کرنی خود بخود آجاتی ہے۔“ وہ اسی لمحے میں بولی جس نے انہیں چونکا دیا تھا۔

”ماں سے بات کرنے کی نیز کس نے بھلا دی نہیں؟“ انہوں نے سلور کا فرائی پین اٹھا کر اس کے گھٹنوں پر مارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سعدیہ نے اپنے گھٹنے پیچھے کر کے خود کو اس وار سے بچا لیا۔

”جہاں کسی انسان کے پاس کسی بات کا جواب نہیں ہو مانتا، وہیں وہ دوسرے پر حملہ آور ہوتا ہے اماں؟“ سعدیہ نے آپا رابعہ کو سب کچھ بھول کر اپنا منہ تکلنے پر لگادیا۔

”آپ نے کوئی بہانہ ہی بنانا ہے نا غلط بیانی ہی کرنی ہے نا تو کہہ دیں کہ سارے رشتہ دار مر کھ پ گئے، کیونکہ جس گاؤں میں وہ رہتے تھے۔ وہاں طاعون کی بیماری پھیل گئی تھی اور اس گاؤں میں چوہوں کو پیچھے لگا کر دریا کے حوالے کرنے کے لیے کوئی باجے والا شہزادہ نہیں آیا تھا۔“ سعدیہ کی آواز بلند ہو گئی۔

”یہ کیا کہ جب کوئی سوالی پوچھو جواب میں ڈنڈے، برتن، بجوتے کھاؤ۔ کب تک کھاؤ بھئی۔“ وہ سراٹھا کر بول رہی تھی ”اور کیوں کھاؤ۔ کوئی ناجائز بات کی ہو تو بندہ کھا بھی لے۔ میرے تو سیدھے اور جائز سوال ہوتے ہیں پھر بھی پتا نہیں آپ کو کیوں غصہ چڑھتا ہے خیر۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی اور اپنا ملل کا سلیقے سے اوڑھا دیا غانا نا ”ایک دفعہ انا کر دو بارہ سر پر رکھ کر کندھوں پر پھیلاتے ہوئے مضبوطی سے بکل باندھ لی۔“

”نانگہ آنے والا ہے، میں اب جاتی ہوں، خدا حافظ۔“ وہ اپنے سفید فلیٹ بوٹوں سے صحن کے کچے گیلے فرش پر نشان چھوڑتی ڈیوڑھی کے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

ہاتھ میں گندھے آلے کا پیرا پکڑے آپا رابعہ وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ مولوی سراج سرفراز نے مسجد سے واپسی پر گھر کے داخلی دروازے کا ایک پٹ کھلا دیا۔

”دروازے کو کنڈی تو دھیان سے لگا لیا کو آپا رابعہ بی بی!“ وہ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر ڈیوڑھی کا پردہ ہٹاتے ہوئے صحن میں آکر بولے۔ ایک غیر متوقع منظر ان کا منتظر تھا۔ چوہے میں آگ جل رہی تھی اور اس پر دھڑے توے میں سے نہ صرف دھواں اٹھ رہا تھا بلکہ اس کے جلنے کی بو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلور اور پیتل کے گلاس، پلیٹوں، کٹوریوں اور ڈول پر رکھیاں، جھنڈا رہی تھیں، سلور کا فرائی پین الٹا پڑا تھا، خشک کی پرات قریب دھڑے آپا رابعہ ہاتھ میں گندھے آلے کا پیرا پکڑے کم صم بیٹھی تھی۔

اس صورت حال نے کم صم مولوی سراج سرفراز کی چھٹی تو نہیں گولی دوسری یا تیسری حس ضرور جگادی تھی جو انہیں کہہ رہی تھی کہ کچھ کر بد ضرور تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تو چوہے سے اتار کر نیچے رکھا۔

”خیر ہے بھئی، کیا ہوا؟“ انہوں نے ناکوں کے ڈبے میں رکھے گندھے آلے کو نکھیں سے بچانے کے لیے

”لکھاری تیار تھا یہ خرگوش پہلے کسی سرکس وغیرہ میں کام کرتا تھا۔ اس بات سے مجھے سارہ یاد آگئی۔“ ماہ نور حسب عادت دوش آکر لوتی جا رہی تھی ”سارہ سے یاد آیا وہ کیسی ہے اب؟“

”سارہ بہتر ہے اور اس کے مزید بہتر ہونے کے چانسز بھی ہیں، تم اس کے لیے دعا کرنا پلینز۔“

”ہوں ماہ نور نے مختصر جواب دیا۔“ تم اس سے ملنے گئے تھے؟“

”ہاں! گیا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ گفتش لایا تھا وہ اسے دینے تھے اور اس کو دیکھنا بھی تھا۔ اس لیے گیا تھا۔“

سعدیہ اس بات نے ماہ نور کے ہلپوں اچھلتے دل کو زیر کر لیا تھا۔

”اچھی بات ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”اوہو کتنا نا تم ہو گیا تمہیں سونا بھی تو ہو گا۔“ پھر وہ بولی۔

”میری پھوپھو، مجھے تو تم جگایا بھی ہو اپنی بتاؤ تم نے سونا بچا یا نہیں؟“

”ہاں سونا تو ہے۔“ وہ اسی بچی آواز میں بولی ”کل میری ایک کزن کی مایوں کا فنکشن ہے۔ بہت بڑا فنکشن ہو گا۔ ہم سب بہت ایکساٹنڈ ہیں۔“

”تم سب؟“

”ہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے میں اور میری بیانی کزنز۔“

”گڈ ایچرائج بوائے کرو۔“ وہ ہنسا۔

”ٹھیک ہے اب تم سو جاؤ۔“

”ہاں پلینز اب تم بھی سو جاؤ۔“ وہ بولا اور کال منقطع ہو گئی۔

”میں جاگ گیا ہوں ماہ نور اور اب ساتھ لینے جا رہا ہوں۔“

”میں نے ہاتھ لے لیا ہے اور اب میں تیار ہو کر ناشتا کرنے جا رہا ہوں۔“

”ناشتے کے بعد اب میرا آتش جانے کا ارادہ ہے۔“

”میں ابھی ایک مینٹنگ میں جا رہا ہوں۔“

”مینٹنگ سے فارغ ہو کر اب میں واپس اپنے آتش جا رہا ہوں۔“

”آج میں آتش سے جلدی اٹھ جاؤں گا کیونکہ آج مجھے ابراہیم کے ساتھ ملنے پر جانا ہے۔“

”لنچ لے لیا اب میں فارن آتش جا رہا ہوں۔ ایک کام ہے وہاں۔“

اگلے روز ماہ نور کو صبح سے شام تک سعدیہ کی طرف سے اسی قسم کے میسجز موصول ہوتے رہے۔

”یہ کیا ہے بھئی؟“ شام تک ان میسجز پر حیران ہوتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”ابھی آؤمی رات ہی کو تو تم نے وعدہ لیا تھا کہ جہاں جاؤں گا، تمہیں جتا جاؤں گا۔“ جواب میں اس نے لکھا تھا۔

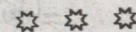
”اف! ماہ نور نے کہا۔“ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔“

”تمہارا جو بھی مطلب تھا، مجھے تو وعدہ نہا ہے گڈ ایسے میسجز کے لیے تیار رہو۔“

”نہیں۔۔۔ میں نے صرف یہ کہا تھا اگر ملک سے باہر جانے کا ارادہ ہو تو مجھے ضرور بتادیا کرو۔“ ماہ نور کو اگرچہ سعد کے اس قسم کے پیغامات پر دلی مسرت محسوس ہو رہی تھی مگر وہ ان سے ایک ہی دن میں دستبردار ہو گئی تھی۔

”سوچ لو پھر اس بات پر فخر نہ ہو جانا۔“

”نہیں! ٹھیک ہے، ٹھیک یو فار یور کسرنر آئی ویز۔“ ماہ نور نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔



اس پر دھک رہا اور خود آپا راجہ کے سامنے رکھی بیڑھی پر مڑیوں کی طرح بیٹھ گئے۔
 ”راجہ بی بی! خیر ہے کیا بات ہوئی؟“ اپنے سوال کے جواب میں جلد خاموشی پر انہوں نے آپا راجہ کا کندہ
 جھجھوڑے ہوئے ایک مرتبہ پھر سوال کیا۔
 ”ہوں۔“ آپا راجہ جیسے بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آئیں۔
 ”خیر ہے نا۔ کیا ہوا؟“ مولوی صاحب نے رنگ برنگ مولے نگ جڑی چاندی کی انگوٹھیوں والا ہاتھ ہلا کر
 پوچھا۔

”خیر کدھر ہے۔“ آپا راجہ نے دیوانوں کی طرح ہاتھ میں پکڑا بیڑا خشکے کی پر ات میں پٹختے ہوئے کہا اور سر
 اترا دینا سر پر جمایا۔
 ”ہوا کیا ہے؟“ مولوی صاحب کا چوہے جیسا دل انجانے خدشات کے تصور سے لرزے لگا۔ ”رنق رنق“
 مسجد کی چاکری! ان کا دل ان تینوں چیزوں کے جانے کے خوف سے ہی لرزتا تھا۔
 ”سعدیہ بچی نہیں رہی مولوی سراج! سعدیہ جوان ہو گئی ہے۔“ آپا راجہ نے وحشت زدہ نظروں سے مولوی
 صاحب کی طرف دیکھا۔
 ”وہ سراٹھا کر بولے لگی ہے اور اسے اپنے سوالوں کے جوابوں کے متعلق اندازہ بھی ہونے لگا ہے۔“
 ”آرام سے راجہ بی بی! آرام سے۔“ مولوی صاحب نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ راجہ بی بی کی یہ حالت
 نوکری روزی روٹی کے جانے کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔
 ”کب تک آرام سے بات کروں مولوی سرفراز؟“ آپا راجہ کو مولوی صاحب کے اطمینان بھرے لہجے پر طیش
 آگیا۔

”سعدیہ نے جوان تو ہونا ہی تھا نا راجہ بی بی! اب تک وہ چھوٹی بچی ہی رہتی ہے۔ دس پاس کر لے گی تو اس کا نکاح
 پڑھا کر رخصت کر دیں گے۔ کوئی سراٹھانے پر سر قلم کرنے کے بھی طریقے بتاتی ہیں کتا ہیں۔“
 ”میں نے اسے ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھ رکھے ہیں مولوی سرفراز! سفید کوٹ والی ڈاکٹر دل کی دھڑکن چیک
 کرنے والا آلہ گلے میں ڈال کر کٹنے والی ڈاکٹر۔“ آپا راجہ وحشت زدہ لہجے میں چلا میں ”پر وہ انہی سے نشتر کا
 چیرھا کرنے کی خواہش کرنے لگی ہے۔“
 ”میں بڑی بڑی باتیں نہیں جانتا راجہ بی بی!“ مولوی صاحب نے بیڑھی پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں
 ٹکاتے ہوئے کہا۔ ”مگر اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ ڈاکٹر چیرھا ڈکڑخوں اور بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ وہ جب تک
 جان نہ لیں بندے کے اندر مرض کیا ہے، مریض کی صرف نبض دیکھ کر دوائی نہیں دیتے، صرف تھرمیٹر کے
 پارے کا نشان دیکھ کر آگے نہیں بڑھتے۔ وہ میٹ کرواتے ہیں، ایک سرے کرواتے ہیں۔ ان کی رپورٹیں دیکھ کر
 فیصلہ کرتے ہیں۔“

”آپ کو یہ پتا ہے تو اتنا بھی پتا ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کس کس مرض کو اندر چھپائے بیٹھے ہیں۔“ آپا راجہ نے
 ترچھی نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔
 ”ہمیں ہمارے مولانا سر چھپانے کو اچھا ٹھکانہ دے دیا۔ کھانے پینے کے مسئلے سے آزاد کر دیا۔ اب ہم
 امراض کے گند کیوں کھچیں؟“ مولوی صاحب نے وہی کے ڈبے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
 ”ہم کیوں کھچتے لگے۔“ آپا راجہ تیزی سے بولیں ”سعدیہ کلثوم کھنچنا چاہتی ہے۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ
 ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے پیچھے کوئی گڑبڑ ہے۔“
 ”کافی ہے ابھی سعدیہ۔“ مولوی صاحب کے معدے نے بھوک اور بوجھل باتوں کے زیر اثر دہائی دینی شروع

کر دی تھی ”تو ایسے سوال کرنے لگی ہے۔ ذرا اور بڑی ہوگی تو سوچ لو اپنے طور پر کیا کیا نہ جانے کی کوشش کرے
 گی۔“ مولوی صاحب نے آپا راجہ کی سوچ کو مزید انجانے خدشات سے لرزایا۔
 ”وہ۔“ پھر مولوی صاحب صاف کے نیچے چھپے بالوں کو کھجاتے ہوئے بولے ”ایک روٹی ڈال دو۔ اب تو دن
 چڑھنے کو آیا۔“
 ”ان کی ساری فکریں بھوک اور کھانے سے شروع ہو کر بھوک اور کھانے پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ انہیں کیا خیر
 میرا دل کیسے کیسے واہمیں سے لرزتا ہے۔“
 آپا راجہ نے دل میں کستے ہوئے خشکے میں چٹا پیڑا اٹھایا اور روٹی بنانے لگیں۔
 ”مٹی ذرا زیادہ لگا لو۔ دہی پر شکر ڈال کر زیادہ مٹی والی روٹی کے ساتھ کھانے کا مزہ دیا ہوتا ہے۔“ مولوی
 صاحب نے سر پر لگی آنکھوں سے دہی مٹی والے ڈبے کے اندر جھانکتے ہوئے فرمائش کی۔
 ”کھانے جائیں مٹی میں تر تر رائیخے مولوی جی۔ بھلے جسم کے ساتھ ساتھ عقل پر بھی چڑھتی چلی جائے
 اور وقت کے ساتھ اتنی چڑھ جائے کہ انسان اور جانور کا فرق بھی سمجھ سے باہر ہونے لگے۔“
 دل ہی دل میں کلکستی آپا راجہ نے سوچا، لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ شوہر کی نافرمانی کرنے والی عورتوں
 کی بابت وہ اتنی حکایتیں سن چکی تھیں کہ انہیں لگتا دھران کے منہ سے کوئی غلط لفظ ادا ہوا، دوسرے آگ کے
 شعلوں کے مزید قریب ہوئیں۔

اس نے چند ہوس دفعہ لچک دار آٹے نما ربڑ سے گھوڑا بنانے کی کوشش کی اور پھر اس کی شکل بگاڑ دی۔ گھوڑا
 اس سے بن نہیں پایا۔ اب وہ مختلف رنگوں کے ڈوبے کھول رہی تھی۔ ان ڈوبوں کو کھولنے کے بعد اپنے
 ہاتھوں اور پاؤں کو تیزی سے حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مختلف شکلوں میں ڈھالنے لگی۔
 سبکی آئی نہ بچن میں کھانا بناتے ہوئے دوبارہ بچن اور کمرے کی درمیانی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا۔ وہ
 میز پر جھکی اس لچک دار ربڑ سے کھیل رہی تھی۔ تیسری بار انہوں نے چشمہ آنکھوں پر لگا کر دیکھنے کی کوشش کی کہ
 وہ کیا بنا رہی تھی۔ پیسے رنگ سے اس نے ایک لمبی سی رسی بنانے کی کوشش کی تھی۔ نارنجی رنگ ایک سر، ایک
 دھڑ، دو بالوں کی اور دو ٹانگوں میں ڈھالا پڑا تھا۔ یہ تمام اعضاء الگ الگ رکھے ہوئے تھے اور اب وہ بھورے رنگ
 سے نبرد آزما تھی۔

اس کا انہماک اور مسلسل اس کام میں جتنے رہنا سہی کو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ رونے، کڑھنے، ناپوس رہنے اور
 حسرت بھری سانس لینے کے دور سے ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کا یہ قدم کافی لکیر
 کے بجائے مثبت لکیر کو چھو رہا تھا۔

”مجھے امید ہے، نمائش اچھی رہی ہوگی۔“ سعدیہ کافی سے لبریز بی بی کی اوپری سطح پر تیری جھاگ کو دیکھتے
 ہوئے کہا۔
 ”ہوں!“ کافی کا ایک سب لینے پر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے منہ سے نکلا۔ ”آپ کافی اچھی بناتی ہیں۔“
 ”یقیناً!“ جواب میں وہ اپنے بے اثر چہرے کو ذرا سا ہلا کر بولی۔ ”میں ہر وہ کام اچھا کرتی ہوں جس میں مٹی کا
 عنصر موجود ہو۔“
 ”یقیناً سمجھتے یہ بھی ایک آرٹ ہے۔“ سعدیہ نے ساختہ کہا۔ ”اور بہت دلچسپ آرٹ ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے سعد کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر اپنا دھیان اپنی پیالی کی طرف کر لیا۔

”لوگ مٹھاس سے رغبت رکھتے ہیں عموماً۔“ وہ مسکرایا۔ ”تخی میں دلچسپی رکھنے والے لوگ یقیناً“ برعکس مختلف اور بہت خاص ہوتے ہوں گے۔“

”یقیناً“ تم بہت اچھے انگریزی اسکولز میں پڑھے ہو گے۔ کان لچونیورسٹی میں بھی ضرور ٹاپ کیا ہو گا، پھر تمہاری اردو اتنی اچھی اور خالص کیسے ہے؟ تمہارا بلبلو لہجہ بھی بہت درست ہے، جبکہ تمہاری عمر کے لڑکے ”مخصوصاً“ جو تمہاری کلاس سے ہی تعلق رکھتے ہیں ان کو تو اس زبان سے اب خار آنا شروع ہو چکی ہے۔“ اس نے موضوع کو بالکل ہی بدلتے ہوئے کہا۔

”میں“ جیسا دس ویسا بھیجیں گا قائل ہوں۔ اس لیے۔“ سعد نے برجستہ جواب دیا۔ ”مجھے پتا تھا آپ عصر حاضر کے علامتی مصوروں کے بجائے ایک ایسی مصورہ ہیں، جس کا رشتہ اپنی زمین، ثقافت اور زبان سے بہت گہرا اور مضبوط ہے، لہذا آپ کے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

”تم بہت بڑے فنکار ہو“ وہ خلاف توقع مسکرائی۔ ”بلکہ بہت بڑے ڈراما باز ہو۔“ کیوں ایسا ہی ہے کیا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔

”بجاء فرمایا آپ نے۔“ سعد نے ادب سے جواب دیا۔ ”بندہ ناچیز تو ٹکی کا بادشاہ ہو گا غفریب۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیماً ”سر کو ہلکا سا جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میرے مستقبل کے منصوبوں میں یہ منصوبہ سرفہرست ہے۔“

”فضل اور میمونہ کو جانتے ہو تم؟“ جواب میں اسے ایسا سوال سننے کو ملا، جس کی اسے قطعی توقع نہیں تھی۔

”یہ کون؟“ اس نے ذہن میں اٹھتے چار قسم کے جوابوں میں سے ایک جواب کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔

”تھی ایک جوڑی۔“ وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ”جس کسی گھر میں ان دونوں نے بطور آیا وکل وقتی ملازم نوکری کی، اس گھر کے بچوں کو خالص اردو اور درست لب و لہجہ سکھا کر ہی نکلے۔ میں نے سوچا شاید تمہارے بچپن میں وہ تمہارے گھر میں بھی کوئی تین چار سال لگا گئے ہوں، جب ہی تم اتنی خالص زبان بول رہے ہو۔“

”اچھا!“ سعد نے کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب کہاں رہتے ہیں یہ دونوں؟“

”ہیں ایک قریبی گاؤں میں۔۔۔ اب تو صرف زبان ہی باقی رہ گئی ان کے پاس۔ باقی تو سب پر جھانڈو پھر گیا۔۔۔ تم کافی اور لوگے بناؤ گے؟“

وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور سعد کا ذہن اس کی بات میں انک کر رہ گیا تھا۔

”سعد۔۔۔ تم اور کافی لوگے؟“ اس نے کافی کی پیالی سے چمچ نکلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

”جی۔ ضرور لوں گا۔“ وہ چوتلے ہوئے بولا۔ ”آپ کو اس گاؤں کا نام معلوم ہے کیا، جہاں وہ دونوں رہتے ہیں؟“

”تم کہاں انک گئے بھی؟“ وہ پیالی میں کافی چھینٹتے ہوئے بولی۔ ”عرصہ ہوا مجھے ان کی کچھ خبر نہیں ملی۔ یہ تو آخری خبر تھی جو میں نے تمہیں سنائی۔“

”پلیز فلز ایم! مجھے اس گاؤں کا نام یاد کر کے بتائیے گا۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”اچھا! ٹھیک ہے۔ میں اپنی ڈائریاں دیکھوں گی کسی وقت۔ شاید کسی یادداشت کے خانے میں ان کا ذکر بھی موجود ہو۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”بہت شکریہ میم!“ وہ مسکرایا۔

”وہ لڑکی آج کل کہاں ہے جو تمہارے ساتھ آئی تھی یہاں؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”وہ جو آپ کے پاس آپ کی کسی دوست کا پیغام لائی تھی؟“ سعد نے جوابی حملہ کیا۔

”ہاں ابھی!“ اس نے اپنا ہتھکڑیا لے کر ہالوں والا سر ہلایا۔ ”کرل فرینڈ تھی تمہاری کیا؟“

”اوہ!“ سعد نے پیالی میز پر رکھ کر ہنسنے لگا۔ ”بھی وہ نظر آئے یا لے آپ سے تو اس سے پوچھ مت لیجئے گا کہ وہ میری کرل فرینڈ ہے یا نہیں۔ وہ بہت پرانا تھی اس لفظ پر۔“

”ہوں!“ جواب میں ہتھکڑیا لے کر ہال پھر بلے۔ ”پھر کون تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”خدا کا خوف کریں فلزا ایم!“ سعد نے زور سے اسے دیکھا۔ ”آپ اس سے مجھے مار پڑائیں گی!“

”پھر کون تھی وہ؟“ اس نے توری چڑھا کر پوچھا۔ ”تم نے جو غیر متوقع میل مجھے بھیجی تھی جن میں تمہاری وہ تصویریں تھیں یہ بتانے کے لیے کہ آج کل کے لڑکے کیا کچھ بولتے ہیں وہی میل تم نے اسے بھیجی تھی۔“

سعد نے فلزا ظہور کی اس بات پر نظریں قالین کے ڈیزائن پر نکاتے ہوئے کچھ دیر غور کیا۔ اسے آج کل کے لڑکوں کی سوچ پر کیے جانے والے تبصرے پر اچانک آجانے والی ہنسی کو قابو کرنا تھا اور اس اتفاق کو بھی ہضم کرنا تھا کہ ایک میل کو دو مختلف موصول کرنے والوں کا رد عمل کیسا تنگ کرنا تھا اور چہتا ہوا تھا۔

”ہوں!“ کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھائیں اور فلزا ظہور کی طرف دیکھا۔

”میں نے آپ کو وہ تصویریں اس لیے نہیں بھجوائی تھیں کہ آپ کو بتاؤں میں کیا کچھ ہوں بلکہ یہ بتانے کے لیے بھجوائیں کہ میں کیا کچھ نہیں ہوں۔“

”جو کچھ تم نہیں ہو وہ تم سے پہلی ملاقات میں ہی میں اندازہ کر چکی تھی۔“ فلزا نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”پھر یوں سمجھ لیں کہ اس لیے بھجوائیں کہ آپ کو بتا سکوں میں آپ سے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا چلو! یوں ہی سہی۔ اور اس لڑکی کو؟“ وہ ابرو چڑھا کر بولی۔

”اسے اس لیے کہ دراصل اسی کو بھجوائی تھیں۔“ سعد کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیلی۔

”ہوں!“ فلزا نے اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”اچھی گئی تھی وہ مجھے۔“ اس کا کالج بھی نرم ہو گیا۔ ”اور میری جن دوستوں کے حوالے سے یہاں آئی تھی وہ بھی شائد اسی منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھ سکوں؟“ سعد نے اچانک موضوع بدلا۔

”یہاں کیا ہے۔“ فلزا نے اپنے پھول دار جپر کو ہاتھ سے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ رنگ جو خشک ہو چکے، کچھ ادھورے کیٹس، کچھ آجڑے برش۔“

”جو بھی ہے مجھے بہت شوق ہے مصوروں کے اسٹوڈیو دیکھنے کا۔ کوئی دو سارا برا مصور تو شاید مجھے قریب بھی پہنچنے نہ دے، لیکن آپ نے اتفاق سے مجھ جال پر نظر کرم فرما ہی دی ہے تو کوئی حرج تو نہ ہو گا جو ایک نظر دیکھ لوں۔“

”ہوں!“ فلزا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ آؤ! اسٹوڈیو دیکھتے ہیں۔“ وہ خلاف توقع جلد مان گئی۔

”ادھر سے آجاؤ۔“ وہ چھوٹے سے لوگ روم سے ملحقہ اوپن کچن سے گزر کر اس کا دروازہ ایک مختصری راہداری میں کھولتے ہوئے بولی۔ یہ مختصر راہداری ایک طرف سے بند تھی اور اس کے دوسرے سرے پر سے

سیڑھیاں اوپر کو جاری تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کشادہ جگہ نہ ہونے کے سبب سیڑھیاں ہر تیسری سیڑھی پر جا کر دوسری طرف کو گھوم جاتی تھیں۔

”زرا دھیان سے قدم رکھنا۔ سیڑھیاں کم چوڑی ہیں۔“ فلزا نے بجلی کا ایک مٹن دیا کر ان سیڑھیوں کی چھت پر موجود واحد انرجی سیور روشن کرتے ہوئے کہا۔ کم طاقت کا یہ انرجی سیور بد قسم سی رہی پھیلائے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔

سیڑھیوں کے آخری چکر پر لکڑی کا کمزور سا لکڑی رنگ اڑا دروازہ جڑا تھا جس کی سنہری تاب بھی برائی ہونے کے سبب اپنی آب کھو چکی تھی۔ فلزا نے تاب کھما کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے دوسری طرف موجود کمرے سے بجائے کب سے بند ہوا کو باہر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ سعد نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ رکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”تھوڑی دیر ادھر ہی رہو۔“ فلزا نے سعد سے اگلی سیڑھی پر کھڑے کھڑے کہا اور پھر آگے بڑھ کر کمرے کی ٹیبل لائٹ روشن کی۔ سعد نے تھوڑا آگے جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ کمرہ بہت عرصے بعد کھلا تھا۔ اس کے فرش کی گرد باہر ہی سے نظر آرہی تھی۔

”آجاؤ!“ فلزا نے اپنے اوّل جلول سے ٹراؤزری کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے ہوئے کہا۔

سعد اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں مختلف سائز کے اینل اور ان پر رکھے کیٹس دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر کچھ ادھورے چار کولر اسکیچز لگے تھے اور ان پر مٹری نے خوب صورتی اور مہارت سے اپنے آثار پھیلارکھے تھے۔

”کافی ٹھن ہے یہاں۔“ سعد نے دو قدم آگے بڑھ کر اس مختصر سے کمرے میں موجود واحد کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر جس کے پٹ باہر کو کھلتے تھے۔

”ہاااا۔۔۔ نہیں کھلی۔“ مختصر کمرے میں فلزا کی ہنسی کی آواز یوں گونجی کہ ایک لمحے کے لیے سعد کا دل بھی لرز گیا۔ اس نے کھڑکی کی بجٹی اتار کر اس کے پٹ باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ کھڑکی واقعی نہیں کھل رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کے اوپری حصے میں جڑے گرد آلود شیشوں کو دیکھا اسے سبز پتوں کی مہموں سی شبیہ نظر آئی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ پوری طاقت سے باہر کی طرف دھکیلے۔ دونوں پتوں کی درمیانی جگہ سے اسے کسی بیج دار تیل کی موتی شامیں کھڑکی سے لپٹی محسوس ہوئیں۔ اس نے دونوں پتوں کی درمیانی جگہ سے آنکھیں جوڑ کر باہر جھانکنے کی کوشش کی پتہ پتہ تیل کی تیلی اور موتی شامیں نے کھڑکی پر قبضہ کر رکھا تھا۔

”ہاااا۔۔۔“ عقب میں ایک بار پھر فلزا ظہور کے قبضے کی آواز ابھری۔ گرد جالے ادھورے کیٹس رنگوں کے زنگ آلود بے کھڑکی سے لپٹی تیل اور یہ قبضہ۔ سعد کو یوں لگا جیسے وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو اسے فلزا ظہور کے بجائے بے دانستہ منہ سے باہر نکالے خون آلود ہونٹوں والی خوں آشام چیل کھڑکی ملے گی۔

”واہ! ایسا فیئر ٹیل چویشن ہے۔“ اس نے کھڑکی کی طرف رخ کیے سوچا۔ پھر آدھرا کانٹن ڈائل کی کسی کمائی کے منظر کا اسے خیال آیا۔

”وہیے! اگتا کھڑکی کے کسی کردار کی طرح جو یہاں ابھی میرا قتل ہو جاتا ہے تو اخبار اور ٹی وی کیسے اسکو پس تیار کریں گے۔“

اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے تیل فون پر بغیر دیکھے ایک پیغام ٹائپ کیا اور ایک نمبر پر بھیج دیا۔

مہسج ڈیلور ہو جانے کی ٹون سن لینے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے پیچھے کی طرف مڑا۔ اس کی تمام توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ اس کے سامنے فلزا ظہور اپنے جپر اور اوّل جلول ٹراؤزری میں ملبوس سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے نکل کھڑی تھی۔

”دیکھا میرا سٹوڈیو۔ کیا لگا؟“ وہ مسکرائی۔

”یسا ہی جیسا بڑے مصوروں کا ہونا چاہیے۔“ سعد نے اب وہاں موجود کیوس ایک ایک کر کے دیکھنے شروع کیے۔

”کافی تیز رنگ استعمال کرتی ہیں آپ؟“ اس نے تصویق کیا۔

”کرتی تھی۔“ جواب آیا۔

”تھی کیا مطلب؟“ سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے اب پینٹنگز اور چار کولر اسٹیج بنائے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ میرے آخری آخری اور ادھورے کیوس ہیں۔ یہ وہیں رک گئے جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔“

”مگر کیوں چھوڑا؟ یہ کمال کا کام ہے۔“ سعد نے ایک کیوس پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھ پھیرنے سے کیوس پر بڑی گرداس کی انگلیوں پر چپک گئی۔ اس کیوس کے نیچے اس ادھوری پینٹنگ کا عنوان لکھا تھا۔ سعد نے تیزی سے ان لکھے ہوئے الفاظ پر سے گرد صاف کی۔

I want to be a bride when I grow up

(میں بڑی ہو کر دلن بننا چاہتی ہوں۔)

اس نے یہ عنوان پڑھا اور پینٹنگ پر غور کیا یہ سلک پروائر ٹکڑ میں بیٹھ کیا گیا ایک ادھورا منظر تھا۔ ایک بچی کے دھڑلے ایک دلن کا سر جس پر تیز رنگوں کی آمیزش سے ادھورا سادہ بناؤ ڈھایا گیا تھا۔ وہ دلن جس سمت دیکھ رہی تھی وہ حصہ بالکل ادھورا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے ادھورے حصے میں کچھ تلاش کرنے کے لیے اس پر ہاتھ پھیرا۔

”یہ سلک خاصا پرانا ہو چکا ہے۔ اتنی زور سے اسے ہاتھ سے صاف کرو گے تو پھٹ جائے گا۔“

اسے فلزائی آواز سنائی دی۔ اپنی کوشش ترک کرتے ہوئے وہ دوسرے کیوس کی طرف متوجہ ہوا اور بُری طرح چونک گیا۔ اس پینٹنگ میں ایک لڑکی کے بچہ پیدا کرنے کا ادھورا منظر تھا۔ اس تصویر پر سرخ رنگ کا راج تھا۔ اس نے درد زدہ لڑکی کے چہرے کے تاثرات پر نظر ڈالی جو گرد کی تہہ کے نیچے بھی اتنے واضح نظر آ رہے تھے کہ وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

”Midnight in heaven“

(جنت میں آدھی رات۔) اس پینٹنگ کا عنوان بھی انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ اس نے مڑ کر فلزائی کو دیکھا۔

”یہ اب تک کی آخری پینٹنگ ہے۔“ وہ جیسے نیند میں بول رہی تھی۔

”اس کے بعد میں نے کچھ شروع کیا، نہ اس کو مکمل کیا۔“ اس کی آواز جیسے نامحسوس ہوا میں سرسرا رہی تھی۔

سعد نے کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے فلزائی کو دیکھا اور پھر ہاتھ آگے کرتے ہوئے بولا۔

”چلیں۔“

”ہاں! چلو۔“ فلزائی سر ملاتے ہوئے اسے دیکھا۔ سعد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خاموشی سی تن گئی تھی۔ شاید اس کے جڑے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے تھے کیونکہ اس کے جڑے کی ہڈیاں صاف کھینچی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بیڑھیاں اترتے ہوئے بھی وہ خاموش رہا تھا۔

لونگ روم میں واپس پہنچ کر اس نے میز پر رکھے نشوونما پاکس سے نشوونما نکالا اور اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

”بچن کے سنک پر سینٹائزر (sanitizer) رکھا ہے۔ ہاتھ دھولو۔“ فلزائی نے اوپن بین کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بغیر کچھ کے سنک کی طرف چل دیا۔

ہاتھ دھونے کے بعد وہ فلزائی کی طرف مڑا۔

”کچھ چیزوں کا نہ دیکھنا ان کو دیکھنے سے بہتر ہوتا ہے نا؟“ فلزائی نے کہا۔

”میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔“ اس نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ ”جیسے اور حقیقتیں کیسی ہی

ظالمانہ کیوں نہ ہوں؟ انہیں دیکھنے کی ہمت ہونی چاہیے۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں اب چلتا ہوں۔“

”عشائے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔“ اس نے جیسے سعد کا موڈ خوش گوار کرنے کے لیے گاڑھی اردو

کا استعمال کیا۔

”پھر کبھی سہی۔“ اس نے کہا۔

”میں اب منی ایجنٹ اور کیلی گرائی پر کام کرتی ہوں۔ وہ الگ کرو ہے جہاں بیٹھ کر میں خطاطی کرتی ہوں۔ وہ

نہیں دیکھو گے؟“

”میں آپ کے پاس اکثر آیا کروں گا۔ لہذا اسے پھر کسی دن دیکھ لوں گا۔“

”میں زیتون اور مشروم کا سلاؤ بہت اچھا بناتی ہوں۔ اگر تم مجھے صرف پندرہ سے بیس منٹ دو تو۔“ فلزائی اس

کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ کو بتایا نا۔ میں آپ کے پاس اب اکثر آیا کروں گا۔“ اس نے نرمی سے فلزائی کا ہاتھ ہلاتے

ہوئے کہا۔

”میں آپ کے اس عشائیے، ظہرانہ اور فجرانہ سب کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”تم یقیناً بہت مختلف ہو۔“ فلزائی نے کہا۔

”نہیں! میں بالکل ویسا ہی ہوں۔ صرف میں کہنے والی بات دل میں رکھنے کے بجائے کہہ دیتا ہوں۔“

سعد نے جواب دیا اور لونگ روم کے میز سے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل آیا۔ پھوٹے سے پور نیکو میں

فلزائی کو (Vitz) کھڑی تھی۔ وہ گاڑی کو کراس کرنا گیٹ کے قریب پہنچا اور لا شعوری طور پر سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

اس گھر کی مشرقی دیوار پر نیچے سے لے کر اوپر تک نیل پینٹ تھی۔ رنگ رنگ کر اوپر چڑھتی نیل پینٹ کوٹم کا شاہکار

نیل اور نیل پینٹ اور جا کر گلابی کی اس رنگ آڑی کھڑی پر بھی چڑھی تھی جس کے نیچے فلزائی ظہور کا ادھورا جہاں

ویران پڑا تھا۔

”آپ بن سرکس میں کام نہیں کرتے ہو؟“ کھاری نے لاہور میں اپنے واحد دوست سے پوچھا۔ یہ دوست بھی

چوہدرائی کے اس دورہ لاہور کے دوران ہی ملا تھا، جس میں چوہدرائی کے ساتھ کھاری اپنی ڈیوٹی لگ جانے پر کبھی

خوش ہوا اور کبھی اس سے اوجھ جاتا۔

”نہیں یار! اب سرکس میں کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔“ اس کے دوست نے جواب دیا تھا۔

”اچھا جی! پر میں نے سنا تھا (کالی) پیسے لہہ (مل) جاتے ہیں سرکس میں۔“ کھاری نے چوکیدار کافون ایک کان

سے اتار کر دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”یہی ہی کماتے ہیں نا کھاری صاحب! تو سرکس میں نہ سہی کسی اور جگہ لوگوں کو ہنسا کر کمالیں۔ کیا فرق پڑتا

ہے۔“

”آہو! یہ تو سولہ آنے سچی بات آکھی تاس نے اپنا۔“ کھاری نے نام یاد کرنے کی کوشش کی۔ ”کیا نام بتایا تھا

”ہیں جی! کھاری اتنے زیادہ اسلامی نام کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔“

”ادھر ہمارے فارم ہاؤس پر جو آتے ہیں ناجانی اور چینی ان کے نام تو اوکے اوکے (مشکل) ہوتے ہیں۔ پنگ کر کے، کبھی چنگ کر کے، کبھی ژاؤ ژاؤ۔ نام لو تو ہنس ہنس کے پیٹ دہرا ہو جائے بندے کا۔“ کھاری زور سے ہنسا۔

”میں مسلمان ہوں کھاری بھائی! الحمد للہ۔“

”اوہ بونی (بھئی) کوادھی واہ۔“ کھاری بچوں کی طرح خوش ہوا۔ ”تساں نے نماز تے قرآن سیکھ لیا ہوا ہے؟“

”ہاں! وہ بھی آتا ہے الحمد للہ۔“

”واہ بھئی بھائی محمد رضوان الحق! تمسی ادھر ہمارے فارم ہاؤس پر ضرور آنا۔ میں آپ کو اپنی بھین جی سے ملاؤں گا۔ وہ بڑے خوش ہوں (ہوں) کی تساں نال مل کے۔“

”ضرور کھاری بھائی! میں تب آؤں گا جب میلہ ہو گا۔ مجھے میلوں کے ہنگھو ٹوں والے جھولے بہت پسند ہیں۔“

”اویے ہوئے ہوئے۔“ کھاری نے خوشی سے اچھلتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

”ایک واری جب میں ٹکا کا کھانا مانائی جتنے کے ساتھ ہنگھو ٹوں والے جھولے پر بیٹھ گیا تھا۔ اوجناب! ہمارا والا ہنگھو ژاہی الٹ گیا۔ دب کے سٹ (بری طرح چوٹ) لگی میرے پیٹ پر گڑمو (سوچن) پڑ گیا تھا۔ گڑمو

بچھتے ہو تھسی؟“ کھاری کو اچانک مخاطب کی مختلف قومیت یاد آئی۔

”مجھے سب سمجھ ہے کھاری بھائی! آپ بولیں۔“

”تساں مینوں بھائی بول دیا میں تساں کو بھائی بن کے دکھاؤں گا جی۔“ کھاری نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے

ادرو بولنے کی کوشش کم کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں محمد رضوان الحق کی ہنسی کی آواز آئی۔

”تمسی کتنا بیٹھا ہسڈے اوجی! کھاری نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ کھاری بھائی! اور آپ بھی بہت میٹھی باتیں کرتے ہو۔“

”چلو فیرکا ہو گیا ناں تمسی میلے پر آرہے ہو۔“

”ضرور ان شاء اللہ لیکن واپس جانے سے پہلے آپ نے میرے پاس چکر لگانا ہے ضرور ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔“

”او ایڈر جی۔“ کھاری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑی مشکل ہے۔ میں جن کے پاس کانا (ملازم) ہوں

انہاں دی فلی وچ بڑی وڈی شادی ہو رہی ہے اور مجھے وہاں تہاڑے پاس لے کے جانے والا کوئی نہیں۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے پتاؤ کھاری بھائی! میں خود آپ کو لے جاؤں گا۔“

”اچھا جی! کھاری سوچ میں پڑ گیا اچھا فیرا لے لو بھائی چوکیدار نال گل کر ڈھو ڈھو سبھا تا ہے آپ نوں۔“

گل خان نے کھاری کے دوست کو ایڈر بس سبھایا اور فون بند کر کے کھاری کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”کی ہویا جی؟“ کھاری نے چوکیدار کے دانت نکوسنے پر پوچھا۔

”یہاں بھی دوستیاں بنائیں تم نے کھاری! تم بادشاہ آوی ہو بھئی۔“

”بندہ ہی بندے دادا دو (ساحمی) ہوتا ہے بھائی جی! کھاری نے جواب دیا۔ ”اس غریب کا بھی آکا چچا کوئی

نہیں تے میرا بھی کوئی نہیں۔“

”کونسیں تو چوکیدار صاحب نے شہزادوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ تمہارا آکا بھی وہ، تمہارا چچا بھی وہ۔“ چوکیدار نے اسے یاد دلایا۔

”اے تے ہے۔“ کھاری نے سر ہلایا۔ ”پر بھائی گل خان جی! دنیا تو سگے ماں پو کا پو جیتی ہے نا، جب پار (بچھلے سال) نوں روٹ بنے تھے نا اس وقت چوکیدار صاحب نے میرا روٹ بھی بنوایا تھا، پھر شناختی کارڈ بھی۔ اب دوسرے

وہ جو والد صاحب کا نام لکھواتے ہیں نا۔ جدھر وہاں چوکیدار صاحب کیا لکھواتے؟“

”پھر انہوں نے کیا کیا؟“ گل خان سگریٹ کا شش لگانا بھول کر پوچھنے لگا۔

”بس کوئی وال دلیہ کر لیا چوکیدار صاحب نے۔“ کھاری نے وائس ٹانگ بائیں گھٹنے پر رکھ کر شان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے چوکیدار صاحب مشکل سے مشکل کام بھی کر سکتے تھے۔

”بلے بھی بلے۔ جب ہی چھوٹی پارٹیاں روتی ہیں کہ بڑی پارٹیاں جعلی شناختی کارڈوں پر روٹ بنواتی ہیں۔“ گل خان نے اپنی شہری معلومات جھاڑی۔

”جعلی کیوں بھئی؟“ کھاری نے بُرا ماننے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں ہوں نہیں بھلا ہوں نا تو پھر شناختی کارڈ کیوں جعلی ہو گیا۔“

”یہ بھی ہے۔“ چوکیدار نے سر ہلایا۔ اسی وقت گھر کی اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر ماہ نور باہر نکلے۔

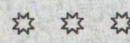
”کھاری! تم ادھر بیٹھے ہو میں نے رضیہ کو کارٹر ز کی طرف بھیج دیا، تمہیں بلانے کے لیے۔“ ماہ نور نے دائیں ہاتھ سے اسے شانوں سے ذرا نیچے تک آتے ہال سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! کھاری مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”آؤ زرا قاطمہ خالہ کی طرف چلتے ہیں میں نے ان سے کہا تھا تم سے ملو اوں گی۔“ ماہ نور آگے چلتے ہوئے بولی۔

کھاری نے سوالیہ نظروں سے گل خان کی طرف دیکھا اس نے ساتھ والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

شانے اچکا دیے۔



”اتنی مزے کی اور انوسینٹ باتیں کرتا ہے کھاری کہ کیا بتاؤں میں آپ کو۔“ ماہ نور نے قاطمہ خالہ کے ٹی وی

لاؤنج کے صوفے پر آتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سفید شلوار قمیض میں ملبوس، سر پر کروشنیے کی سفید ٹوپی رکھے اور پیروں میں نیلی ہوائی چپل پہنے کھاری ایک طرف ہونٹوں کی طرح کھڑا تھا۔

”آؤ کھاری بیٹا! بیٹھ جاؤ نا کھڑے کیوں ہو؟“ گوری چٹی مائی نے کہا۔ جو اس دن ماہ نور بی بی کا پوچھ رہی تھی اور

انگریزی بھی بول رہی تھی۔

کھاری بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایسے لاؤنجز اور ڈرائنگ رومز میں مہمانوں کو مختلف چیزیں پیش کرنے ان کی خدمت

خاطر کرنے کا عادی تھا۔ خود مہمان بن کر ایسی جگہ پر بیٹھنا اسے کہاں آتا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور چپل اتار کر

نیچے بیٹھ کر قائلین پر بیٹھ گیا۔

”ارے بیٹا! ادھر کیوں بیٹھے ہو۔ اوپر بیٹھو چلو شاپاش۔“ خدیجہ نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

”نہیں جی! ادھر ہی ٹھیک ہے۔“ کھاری کے لیے یہ بہت نیا اور انوکھا تھا۔

”مجھے تو یوں بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ پلیز بیٹا! ادھر اوپر اس اسٹول پر ہی بیٹھ جاؤ۔“ خدیجہ نے ایک سنگل

صوفی کے آگے رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اتنے اصرار پر کھاری کو اوپر بیٹھنا ہی پڑا۔
 ”ہاں اب بتاؤ کیا کرتے ہو؟ کیا شوق ہیں تمہارے؟“ فاطمہ نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 ”شوق؟“ کھاری نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

”کھاری کو بابے منگو کے میلے پر جانے اور سائیں کی کافی سننے کا شوق ہے صرف۔“ ماہ نور نے فاطمہ کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ تو کھاری بھی سائیں کا فین ہے۔“ فاطمہ نے ماہ نور کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”اُوئے ہوئے جتنے پوچھو خالہ جی! سائیں جی کی آواز میں کیا بات ہے جی۔“

کھاری اتنا آرام دہ ماحول پا کر تھوڑا سا کھلا۔ ”سائیں ہو راں کو ماہ نور بی بی نے پچھیا تاڑی آواز میں اتنے درد و راز کی ہے، تے پتا جے کی بولے۔ او آکھیا۔ ایس وارا ز عشق ہے۔ ہے نامہ نور بی بی لیکر ہی ویسا تھا نا! کھاری نے ماہ نور سے تائید چاہی۔

”اچھا عشق میں جیتا تھے سائیں جی! فاطمہ نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ب پتا نہیں یہ عشق مجازی تھا یا حقیقی۔ کیا خیال ہے ماہ نور! فاطمہ دانستہ ماہ نور کو بولنے پر اکسانے کے لیے بولیں۔

”ہمیں کیا پتا۔“ ماہ نور نے ان کے سوال سے نظریں چرائیں۔ ”اچھا کھاری! وہ تو سناؤ۔ بندر والے کا قصہ جس کی بندر یا لنگڑی اور بندر بھینکا تھا۔“ ماہ نور نے بات بدلی۔

اور کھاری کو تو ایسی باتیں سننے کا موقع درکار تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے ایسے ایسے قصے سنائے کہ مدتوں سے کھل کر نہ ہنسنے والی خدیجہ اور فاطمہ کی آنکھوں میں ہنس ہنس کر پانی بھر آیا۔

”اف تو بے کھاری بیٹا! تم تو دوائے لا مرض ہو۔“ خدیجہ نے چشمہ اتار کر اپنی آنکھیں ٹشو پیپر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب خدیجہ خالہ؟“ ماہ نور نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ کچھ مرض لاوا ہوتے ہیں یعنی جن کی کوئی دوا نہیں ہوتی اسی طرح کھاری ایک ایسی دوا کی طرح ہے جو کوئی مرض نہ ہوتے ہوئے بھی مریض بنے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔“ خدیجہ نے وضاحت کی۔

”توبہ! ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔“

”اس لیے تو اسے آپ سے ملوانے لائی ہوں! آپ نے دیکھا کچھ لوگ کتنے پیور اور نیک فطرت ہوتے ہیں۔ کھاری کو کسی سے کچھ لینا دینا نہیں، لیکن اگر یہ کسی کی زندگی میں شامل ہو جائے تو کیسا ان ڈس ہینس میل (ناگزیر) ہو جاتا ہے۔ جیسے سردار چاچا اور صابرہ چچی کی زندگی میں یہ ایسے داخل ہے کہ وہ اس کا دم بھرتے ہیں۔ دونوں کو اتنا مان ہے اس پر کہ کیا بتاؤں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ خدیجہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں اور اس کو دیکھو کیسا خود رو ہوا ہے، جدھر کوئی جگہ ملی ادھر ہی کو بڑھ گیا۔ نا تراشیدہ، یہ اسے یہ ہے۔“

”ب تو کھاری قرآن پاک پڑھنا بھی سیکھ رہا ہے۔“ ماہ نور نے بتایا۔ ”کیوں کھاری! کتنے سپارے پڑھ لیے؟ ماہ نور نے کہا۔

”ہمیں ایسے ہی بات کرنے لگا تھا۔“ کھاری نے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مہ نور بی بی! جو ج پوچھو تو انہماں خالہ جی کا مندر (چرو) ساڑھے پچھن جی نال بوت ملا اے۔ بالکل اوہی نین نقش۔“

خدیجہ زہری سے مسکرائیں۔ ”اگر تمہاری بھینجی میری عمر کی ہیں کھاری بیٹا تو ایسا ممکن ہے، کیونکہ اس عمر میں اگر اکثر لوگ ایک جیسے ایک پریشن چہلوں پر سجالیتے ہیں۔“

”ایکسپرس واٹو مجھے نہیں بتائی۔“ کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”پرماندار ویسا ہی ہے۔ بھینجی سے میں سیپارے کا سبق لیتا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کھاری بیٹا! تمہاری بھینجی بہت لکھی ہیں۔“ فاطمہ نے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کو دہاتے ہوئے کہا۔

”ماہ نور! میں نے تمہارے لیے گول گپے بنائے ہیں، کھاؤ گی؟“ خدیجہ کو اچانک یاد آیا۔

”گول گپے؟ آپ نے بنائے؟“ ماہ نور نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! بالکل۔“ خدیجہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”گول گپے بنانا تو بڑا مشکل کام نہیں فاطمہ خالہ۔ یہ خدیجہ خالہ نے کیسے بنالے۔“ خدیجہ نے کچن کی طرف چلے جانے کے بعد ماہ نور نے فاطمہ سے پوچھا۔

”بیوی کے کوکنگ شوز سلامت رہیں۔“ فاطمہ نے صوفے کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سارا دن بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں۔“

”گول گپے تو جی چاہے خدا بخش دے کھانے والے ہوتے ہیں جی۔“ کھاری کو اس گفتگو میں بھی کوئی یاد آیا۔

”نٹائی بالکل نہیں ڈالنا جی پانی وچ، بڑی صفائی ہونی ہے اس کے برتنوں میں۔ مہ نور بی بی! آپ خالہ جی کو بھی لے کر آنا کبھی فارم ہاؤس، چاہے خدا بخش کر دے سمیت لے آؤں گا۔“

”ضرور کھاری بیٹا! ہم تمہارے فارم ہاؤس پر ضرور آئیں گے، ان شاء اللہ۔“ فاطمہ نے اس کی پر غلوص دعوت کا مسکرا کر جواب دیا۔

”محمد رضوان الحق نے بھی وعدہ کیا ہے۔ اودھوی آئے گا فارم ہاؤس۔“ کھاری مسکرا کر بولا۔

”محمد رضوان الحق؟“ ماہ نور نے حیرت سے کھاری کو دیکھا۔ ”وہ کون ہے؟“

”اودھوہ ای جیانی کہ پتا نہیں چینی خرگوش۔“ کھاری نے سر کے اشارے سے اسے یاد کروایا۔

”چھا۔“ ماہ نور کو ہنسی آگئی۔ ”اس کا اتنا مشکل اور بھاری بھر کم نام ہے کیا؟“

”چینی خرگوش کا نام ہے یہ؟“ فاطمہ حیرت سے بولیں۔ ”نا قابل یقین۔“

ماہ نور، خدیجہ اور فاطمہ کو محمد رضوان الحق کی تفصیل سنائے گئی۔ اس دوران کھاری نے کھانے کی چیزوں سے بھری اس پلیٹ کی طرف توجہ رکھی جو خدیجہ نے اسے پکڑائی تھی۔

”گاڑی لے توں ہے برہے چھوٹی۔“

”تم کبھی شکر نہ کرنا کسی بات پر۔“

”ہم نے ہمیشہ اونچے محلوں اور بڑی گاڑیوں کی دعائیں دے کر ویلیں وصول کی ہیں۔ ہم بھاگ لگے ہیں جی دعا جو دیتے ہیں، اس کا مطلب ہوتا ہے کہ قسمت اونچی چکے نشان دار ہو، اسی لیے تو چھوٹی چیزوں پر حیرت ہوتی ہے،“

دعا دینے کے لیے اتنا گلا بھاڑا اور چڑھنے پر آئی تو اتنی چھوٹی۔“

”بھی گاڑی میں بیٹھے کا تصور بھی کیا تھا تم نے؟“

”جھوٹ کیوں بولوں، کبھی نہیں کیا تھا۔ ہم تو چور ہوں اور ٹریفک کے سرخ سگنل پر رکنے والی گاڑیوں کے شیشے

بھاگ، لوگوں کو شیشے نیچے کرنے پر مجبور کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کو دعائیں دیتے اور ان کے ڈیش بورڈوں میں رکھے سکوں میں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہوئے یہ بھی نہیں دیکھتے کہ گاڑی اندر سے ہے کیسی۔ اب سکہ سکہ جو ذکر جمع کر بھی ہیں تو گاڑی خریدنے جو گے پیسے تو دزدانہ گپاں مل جائیں، پھر بھی اکٹھے نہیں کر سکتے۔“

”تو پھر شکر کیوں نہیں کرتیں کہ چھوٹی ہی سہی گاڑی آئی تو سہی۔“

”یہ جو میں چھوٹی بڑی کر رہی ہوں، اپنے لیے تھوڑی کر رہی ہوں۔ یہ تو میں تمہارے لیے کر رہی ہوں، کیونکہ چھوٹی گاڑی تمہاری شخصیت سے چھوٹی لگتی ہے، میں جانتی ہوں تمہارا خاندان بڑا، اس کا نام بڑا، اس کے بھاگ بڑے، پھر تم کیسے چھوٹی، گاڑی میں بیٹھو گی۔“

”میرے خاندان کے بھاگ بڑے نہیں بہت چھوٹے ہیں۔ تم کیا سمجھو اس بات کو۔ جو خاندان بیٹیوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر انہیں معاف کرنے کے بجائے انہیں دھکا دے دس ان کے بھاگ بہت چھوٹے ہوتے ہیں، بڑے نہیں ہوتے اور نہ کھا، اتم پھر میرے خاندان کا ذکر لے کر بیٹھ گئیں، اتنی بار تم سے کہا ہے میرے خاندان کا نام نہ لیا کرو میرے سامنے۔“

”اودھوہ! غلطی ہو گئی سرکار! کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگتی ہوں جناب۔“

”اسلام آباد والے کا برنس ابھی دھنگ سے جمانہیں، پھر بھی اس نے یہ چلتی چلاتی گاڑی لے کر ختے میں دے دی۔ سو جو گاڑی چھوٹی سہی پر دینے والے کا دل کتنا بڑا ہے۔“

”یہ تو ہے، وہ جو مونو سیٹھ ہے، بھکج والا۔ اس کے پاس انت کا پیسہ ہے، مگر جتنے اور پیسے کے برعکس دل اتنا سا ہے چڑی جتنا۔ جتنی دیر یہاں رہتا ہے، بوی کے خوف سے لرزتا رہتا ہے۔ نہ غزل کا لطف اٹھاتا ہے، نہ گیت کا اور اتنے وقت دہرائی کی طرح گئے ختے پیسے دے کر چلتا ہوتا ہے۔“

”دل اور پیسہ دنیا اور لوگ زندگی کے اس سیاہ دور میں داخل ہونے کے بعد ہی تو دیکھے ہیں میں نے۔“

”تم نے اب دیکھے ہوں گے میں تو آٹھ کھلتے کے ساتھ ہی دیکھ رہی ہوں۔ میرا ابا اپنے گاؤں کا واحد میراثی تھا۔ جد بھر کہیں شادی بیاہ ہوتا اپنی ٹیم اور اپنے بچوں کی فوج لے کر چل پڑتا۔ جگتیں کستا، ویلیں وصول، بھاگ لگے ہیں کے تحریے بار بار میراثی۔ ہم بہن بھائیوں کی فوج بارات آنے پر باراتیوں کی طرف سے کئی کئی سوٹ (پیسے پھیلنا) لوٹنے آئے کی جگتیں سننے اور بات میں پکڑے ڈول کلفافے اور ڈبے اٹھائے روٹی کھانے کا انتظار کرتے۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے ہمیں جگتیں کرنے، دعائیں اور ویلیں لوٹنے کے فن کے قواعد اذہر ہوتے گئے۔ سو بچپن میں ہی دل بھی دیکھ لیے پیسہ بھی دینا بھی اور لوگ بھی۔“

”چھا چلو لطف نہ جھانسی کوئی مہمان آتا ہے غزل یا گیت سننے تو تمہاری شکل پر زمانے بھر کی مسکینی چھا جاتی ہے۔ تمہاری نظریں بھاگ گئے، زریں کی دہائی دینی محسوس ہوتی ہیں اور تمہاری ہر حرکت میں ایسا اندیدہ پن ٹپنے لگتا ہے کہ آنے والا تمہیں علیحدہ سے کوئی چھوٹا مونو ٹائوٹ پکڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

”کیا کریں عادت سے مجبور ہیں۔“

”تمہیں عزت کی زندگی، عزت کی روٹی راس نہیں آتی کیا۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ میرا ساتھ بھی تمہاری کچھ تربیت نہیں کپا رہا ہے۔“

”ہا ہائے۔ اب ایسے تو نہ کوئیں کتنی بدل گئی ہوں۔ دیکھا نہیں، فیشن کے کپڑے پہنتی ہوں۔ بال بھی تیل سے چڑھنا چھوڑ دیا پلیٹ گلاس میز پر رکھ کر تمہارے ساتھ کھانا کھانا سیکھ گئی ہوں۔ میرے ہاتھ میں پکڑے چمچنے چاول سنہالنے بھی شروع کر دیے ہیں۔ آئے گئے کو ادب آداب سے سلام کرتی ہوں۔ موسم کے مطابق چائے، شربت پیش کرتی ہوں۔ نہ بھاگ لگنے کی بات کرتی ہوں، نہ سستے خیراں کا تصور کرتی ہوں۔“

”اور وہ کھانے سے پہلے کوردان میں سالن ڈال کر نعمت خانے میں کون چھپاتا ہے، تاکہ جب میں سو جاؤں تو باورچی خانے میں بیٹھ کر پاسی روٹی کے ساتھ لگا کر بھکر بھکر کھائی جائے آئے گئے کو موس کا مشروب پیش کرنے سے پہلے جھوٹا کون لازمی سمجھتا ہے بھلا اور ہا نعرے لگانے کے شوق تو وہ تم بالیاں صاف کرنے والا جعدار اور سبزی بیچنے والے تنک کو سنا کر پورا کر لیتی ہو، کانوں میں ایک وقت میں چار پانچ بالیاں پہننی تم نے نہیں چھوڑیں اور برائے کے ہتھکڑیاں بھی تنک چھنکاتی پھرتی ہو۔“

”لو جی! اتنا کچھ چھوڑ دیا، پھر بھی باتیں۔“

”جھا، جھا! اب بجائے شرمندہ ہونے کے ناراض ہونے لگیں۔ چلو جاؤ، کچھ اوروازے پر دستک ہو رہی ہے، روٹی لینے آیا ہو گا مولوانوں کا شکر دے۔“

”آئے ہائے! ایک تو میں اس مرتبے سے بہت تنگ ہوں۔ ٹیچ (مین) اپنے وقت پر آکر دستک دیتا ہے، ایک سیکنڈ نہ آگے نہ پیچھے دروازہ کھولو تو نظریں نیچے پاں کورا آگے ہوتا ہے۔“

”چلو جا کر دروازہ کھولو۔ بے چارہ انتظار کر رہا ہو گا اور ہاں دیکھو! میں نے ٹیڑھے گوشت کے سالن میں ٹینڈوں کے چھ ٹکڑے اور گوشت کی ٹین ٹیوٹیاں اس کے لیے رکھی ہیں، خبردار! جو تم نے منہ مارا اس کے حصے پر میں نے چیک کر لیتا ہے۔“

”دل تو کر رہا ہے، بتوؤں (ٹیگن) اور آلو کا سالن دوں اس مردے کو، دیکھتی ہوں اگر گرمی کے مارے بسا نہ اٹھانا نہیں شروع کیا تو وہی دوں گی۔ کم بخت کا دل چاہتا ہے گوشت کے ٹانگے والے دن بھی اس کو بکیرے کی بیٹھ اور ان کا گوشت شورے میں تیرتا ملے۔“

”اللہ جانے تمہیں اس معصوم سے کیا پیر ہے۔ خبردار! جو تم نے اسے کل والا سالن دیا۔ کیا پتا اسی کی دعاؤں سے اللہ ہمیں بھی رزق دے رہا ہو۔“

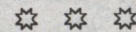
”اسی کی دعا میں تو ہمیں لگتی ہیں، پتا نہیں کہاں سے بھاگ کر ادھر کو آیا۔ وہ تو مولوانے ہیں، ذرا نیک دل جو اپنے پاس رکھ لیا تو اس کی شکل پر بھی ٹھوڑی رونق آگئی ورنہ جب آیا تھا کیسے فاتے نظر آتے تھے اس کی شکل پر۔“

”تم جاتی ہو یا میں خود اٹھوں، بے چارہ پانچویں بار دستک دے رہا ہے، مایوس ہو کر لوٹ جائے گا۔ کچھ سوچو، وہ کلام پاک حفظ کر رہا ہے، اس کے اندر پاک کلام محفوظ ہو رہا ہے۔ تم اس کے بارے میں یوں بات کرتی ہو جیسے نہ جانے کتنا حقیر ہو۔“

”تو یہ تو اللہ معاف کرے۔ کلام پاک تو سب کلاموں کا بادشاہ ہے۔ میں اندھی گوئی بہی ہو جاؤں جو اس کی شان میں کوئی گستاخی کروں۔ میں تو اس کی بات کر رہی تھی جو باہر کھڑا ہے، عمر دیکھو اس کی چالیس سال کی عمر میں حفظ کرنے کا شوق آیا ہے اسے۔“

”رکوا۔ میں خود جاتی ہوں، تم تو اس کی عمر اور حالات کا تجزیہ ہی کرتی رہو گی۔“

”نہیں ٹھہرو، میں یہ نہ کہتی۔“



”اگر آج رات تک میں تمہارے پاس نہ پہنچ پاؤں تو سمجھنا میں قتل ہو چکا ہوں۔“

ابراہیم نے اپنے فون پر آنے والا یہ پیغام پڑھا اور ان تینوں کا انتظار کرنے میں مصروف ہو گیا جنہیں اس نے سعد کی خبر لانے بھیجا تھا۔ کیونکہ اس نے پیغام کے آنے کے بعد سعد کا فون آف ہو چکا تھا۔

”چھاتو تم بینا کولاڈا نوش جاں کر کے میرے مرنے کا غم غلط کر رہے ہو۔“ دس منٹ بعد اسے اپنے قریب سعد کی آواز سنائی دی۔

”تم کم دھرتے یار! اور کون تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟“ ابراہیم اسے سامنے دیکھ کر جیسے شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا ہوا۔

”تمہیں کیا فرق پڑتا ہے تمہارے لیے تو مرنا بھی کھانے کے ساتھ اور جینا بھی کھانے کے ساتھ۔“

”نہیں یار! مذاق نہیں میں واقعی بہت پریشان تھا۔“

”ابے لکڑے! اگر تو پریشان تھا تو مجھے چیز یا کس کے بجائے پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہونا چاہیے تھا۔“

”میں نے سکندر کا شرف اور طاہر کو تیرے پیچھے بھیجا ہے۔ ابھی دو منٹ پہلے سکندر نے مجھے بتایا کہ تمہاری گاڑی بنی گالہ کی طرف بڑھنے دیکھی تھی کی نے آج تین بجے کے قریب۔“

”اؤے! سعد نے آنکھیں سیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ کسی کون تھا جس نے میری گاڑی وہاں دیکھی۔“

”یہ میں کیوں بتاؤں۔“ ابراہیم نے دونوں بازو اپنی باہر نکلتی تو بند پر باندھتے ہوئے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

”تمہارے تو اچھے بھی بتائیں گے۔“ سعد نے دانت پیسے۔

”تم یہ بتاؤ تا تم قتل کیوں نہیں ہوئے ابھی تک باؤے وے۔“ ابراہیم نے اسے تنگ کرنے کی خاطر کہا۔

”کیونکہ مجھے اپنے حصے کا قتل کرنا تھا ابھی۔“ سعد نے ابراہیم کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

”بتاؤ! خلاف پتا کون تھا وہ۔“ اس نے ابراہیم کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔

”دوست کے ہاتھوں مرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی، دیادے میرا گلا۔ میں تیرے دل کی کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دینا چاہتا۔“ ابراہیم نے زبان باہر نکال کر دائیں طرف لٹکاتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”ایک نمبر کا فراڈ ہے تو۔“ سعد نے اس کی گردن چھو دی۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔“ گردن چھوٹ جانے پر ابراہیم نے مشروب کا گھونٹ لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارا مسیح بڑھ کر میں بدحواس ہو جاتا اور اٹکل کو وہ مسیح پڑھا دیتا تو تم جانے ہو کیا ہو تا یا ر! مذاق کرتے ہوئے زار ہاتھ ہلکا کر کھارو۔“

”پھر تم نے کیا کیا۔“ نہیں بتاؤ نہیں دیا۔ ”سعد کو خطرے کی کھنٹی بجتی محسوس ہوئی۔“

”نہیں یار! میں پاگل ٹھوڑی ہوں۔“ ابراہیم نے ہاتھ ہلایا۔ ”میں نے اپنے طور پر ان تین جاسوسوں کو بھیجا تھا جنہوں نے اتنی دیر میں مجھے صرف ایک اطلاع دی، وہ بھی چار گھنٹے پرانی۔“

”اتحقول کا ابا جان سمجھتا ہے تو مجھے۔“ سعد نے ہونٹ دانتوں کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے قتل کا خدشہ ہوا اور میں ایس او ایس کل دوں گا تجھے۔“ اس نے ابراہیم کی طرف اشارہ کیا۔

”تو جو اول تو بھی جاگتا نہیں اور جاگا ہوا بھی ہو تو پیغام سمجھ کر جب تک کسی کو بتاتا مجھے قتل ہوئے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے ہوتے۔“

”میں نے پندرہ منٹ کے اندر تین ہندے بھیجے تھے تیری طرف۔“

”اور ان تین ہندوں نے دو گھنٹوں میں تجھے صرف ایک اطلاع دی اور وہ بھی بے ٹکی۔“

”تو اس شرارت کی تک کیا تھی۔“ ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا۔

”شرارت نہیں تھی، مجھے واقعی خطرہ تھا کہ شاید ایک خون آشام چنیل مجھے مار دینے کے درپے ہو گئی تھی۔“

”مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ یہ کہنی میل کا کام ہی ہو سکتا ہے اور نامسہم ہلاں۔“ ابراہیم نے کہا۔

”تو جل اور دروازہ بیٹھ کر۔“ چیز یا کس کے کاؤتھ میں سر دیے۔ ”سعد نے ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے

قتلہ لگایا۔

”میں نہیں جلتا۔“ ابراہیم نے منہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سارا دن جتنی لڑکیاں آتی ہیں نا تو نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔“

”مجھے خواب میں لڑکیاں نہیں حوریں نظر آتی ہیں محترم! میں پاکیزہ سوچ رکھتا ہوں عیسیٰ طرح بگڑے اور فاسد خیالات نہیں ہیں میرے۔“ سعد نے کہا اور ابراہیم کے منہ ہانک کر سر جھٹکنے پر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”ون اپ۔“ اس نے ہاتھ کے انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے ابراہیم کو مزید چڑایا۔ جواب میں ابراہیم نے دوش پر کولا کر اپنے لیے ایک اور ڈرنک منگوایا اور ڈرنک آنے پر سعد کو نظر انداز کرتے ہوئے کھونٹ کھونٹ پینے لگا۔

”بالا تو کئی مہینے ہو گئے بھاگ گیا۔“ اسے غم تھا کہ فقیر کے ڈیرے کی چاکری کرنے کے باوجود اسے کوئی اشارہ نہیں ملتا، جھلاتا، بجلتا، پسند تھا، انتظار کی مشقت نہیں سہہ سکا، صبر کا یہالہ نہیں پل سکا، فقیر کے ڈیرے کی چار دیواری کے ساتھ تو ہمہ وقت صبر کی چادر چٹی رہتی ہے تو کل کا سایہ ادھر سے ادھر منڈلاتا پھرتا ہے، بے نیازی بکل اوڑھے ذکر میں مگن رہتی ہے، بالا کبھی چاروں کا ڈھاتیا کر کے اور خلقت کو یہاں لے بھر بھریا لے ہی اشارہ دیا جائے گا۔ بالکے کی نظر صرف اپنی غرض پر بھی سو خظہ تھا کہ اشارہ ملنے پر بھی سمجھ نہ پاتا، سو اس کا دل ادھر سے اٹھایا گیا، وہ اپنی غرض لیے کسی اور کنیا پر، کسی اور ڈیرے پر، کسی اور بھونڈی پر، کسی اور کے مسکن پر دستک دیتا پھرے گا، بجلتا پسندوں اور بے صبروں کا علاج اسی طرح کیا جاتا ہے، انہیں انتظار کی مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے۔“

ناغلوں کے گرد بازو لپیٹے، سامنے دیکھتے اختر نے کہا۔

اج سک متراں دی بہتوی اے

اج چندڑی اداس گھنیری اے

اسے وہ شام یاد آگئی جب اس نے اختر کی کنیا کے باہر بالکے کو آخری بار دیکھا تھا۔ اسے بالکے کی اداسی اور اس کی آواز کا سوز یاد آگیا۔ تو وہ اس لیے اداس تھا اور یہاں موجود نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہونٹ میڑتے ہوئے سوچا۔

”تو اب اس کے جانے کے بعد۔“ اس نے اس تنگ سی کنیا میں جلتے واحد چراغ کی لو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب کیسے چلتا ہے سب، میرا مطلب ہے۔“

”اللہ مالک ہے باوصاب! اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک بالا گیا، کوئی دوسرا آگیا، یہ بالکے بھی سب کی طرح ہوتے ہیں، جو اللہ بندے کو اس کے کاموں کے سلسلے میں لگاتا ہے۔“

”اور جن کو سبب نہیں لگتے، وہ کس کبھٹکوی کے لوگ ہوتے ہیں؟“

”یہ نامکن ہے باوصاب! کہ کسی بندے کو عمر بھر کوئی سبب نہ لگے، فرق صرف سبب کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے پڑتا ہے۔“

”میں نے تو اکثر لوگوں کو شکوہ کرتے ہی سنا ہے کہ انہیں اچھا سبب نہیں لگا، اس لیے وہ زندگی میں اچھی چیزوں سے محروم رہے۔“

”گلوں، گلوں کا سلسلہ بھی اس دنیا کا کھیل ہے باؤجی۔“ اختر نے گڑ گڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے پہلے میں اسی جگہ پر ایک سرکاری صاحب بیٹھے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے سامیں جی ابدی باتی، بہت بڑھ گئی ہے، ہر

شخص بے ایمانی پر تھلا ہوا ہے، انہیں گلہ تھا کہ ان کا گوالا پانی کی طرح پتلا دودھ دیتا ہے۔ میں نے سنا اور خاموش رہا، جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہوں، صاحب اپنے گوالے سے پوچھو، اس کو کس سے گلہ ہے، یقیناً اسے بھی بہت سے لوگوں سے گلے ہوں گے، سبزی والے سے گلہ ہو گا کہ سبزی پر پانی چھڑک چھڑک کر اس کا وزن بڑھاتا ہے اور تول میں کمی بیشی کرتا ہے، سبزی والے کو فروٹ والے سے گلہ ہو گا چند دانے اچھے فروٹ میں گلا سڑا فروٹ ملا کر دیتا ہے، فروٹ والے کو منڈی کے آڑھتی سے گلہ ہو گا۔ وہ بلی چھڑانے میں ناٹم لگاتا ہے، اتنے میں کبھی آدھی، کبھی پوری پٹنی فروٹ گل سڑ جاتا ہے، آڑھتی کو بلی کرنے والے سلاٹر سے گلہ ہو گا، سلاٹر کو ٹھکے والوں سے گلہ ہو گا، سرکار کے دفتر سے اجازت نامے دیر سے ملتے ہیں، سرکار کے دفتر میں گوالے کے گلے جاری ہیں۔ آپ نے دیکھا باؤجی! میرا کہاں سے شروع ہوا اور واپس کہاں آکر پڑا۔“

اختر نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

”اسی طرح سبب لگنے کے سلسلے ہیں، مگر انسان گلہ گزاریوں میں اتنا مشغول ہے کہ سبب اس کے سامنے آتے ہیں گزر جاتے ہیں، اس کی عقل پر اس کی نظر پر پردہ ہی پڑا رہتا ہے۔“

”ہول۔۔۔ سامیں جی عقل اور نظر کے پردے ہٹانے کا کوئی ٹوٹکا تو بتائیں۔“

”آپ باوصاب! رہنے دو، ان سلسلوں میں مت پڑو، آپ کو تو سبب کی پیلے ہی کی نہیں، مگر آپ خود رسول کو سبب لگانے کے چکر میں پڑے ہو تو صاف بات بتاؤں، آپ نے خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈال لیا ہے، اب جو آپ رکے اور رک کر ستانے کی کوشش کی تو وقت آپ پر آزمائش کے بہاؤ کھڑے کر دے گا۔ آپ آزمائش کے ان پہاڑوں کو سر کر سکتے ہو، پر آپ اپنے من کے ہاتھوں مجبور ہو کر زان کے چکر میں چوڑ گئے ہو، وہ بھی آپ کے لیے آزمائش ہے۔“

”نہیں! کیا نہیں ہے۔“

”فقیر کی تو ناہ نظر جو دیکھ رہی ہے، وہ آپ شاید ابھی دیکھ نہ پائیں۔“

”کوئی اچھی خبر بھی ہے میرے لیے۔“

”ستے ہی خیراں ہیں۔ (سب خیریت ہے) اگر آزمائش کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو پھلانگتے آگے گزر گئے تو آپ کو من بھی ملے گا، وزن بھی اور وہ بھی جس کی تلاش میں آپ کی روح، جان اور جسم سرگرداں ہے، لیکن جو کہیں راستے میں رک گئے تو آزمائش کے بکھرے پتھر سرک سرک کر ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور کوہِ گراں ثابت ہوں گے آپ کے لیے پھر کڑا وقت آسکتا ہے۔ میری مائیں اب بھی اس چکر سے نکل آئیں، بنے یا بنے

(اس بار اس بار کی کیفیت بہت مشکل ہوتی ہے۔“

”آپ میرے حق میں دعا کیا کر سائیں جی! میں نے کتنے ہی آستانوں، کتنے ہی ڈیروں اور کتنے ہی خانقاہوں میں جھانکا ہے مگر میرے من کو جو آسودگی آپ کے پاس آکر ملتی ہے کہیں اور نہیں ملی۔“

”اس کی وجہ یہ ہے باوصاب! کہ میں بھی آپ ہی کی طرح کا عام انسان ہوں، میں نے بھی دنیا ترک نہیں کر رکھی، روح کی آنکھ سے زیادہ تجزیہ کاری اور ہشیاری کی آنکھ سے چیزوں کو دیکھتا ہوں، مجھے اس کنیا سے کاروبار نہیں چکانا، میں اپنے رزق کے لیے غلے میں جمع ہونے والے چندے اور ہدیے پر بھروسہ نہیں کرتا، میں کون ہوں، کوئی نہیں جانتا، فقیر کا یہ ذرا جتن دن اجڑا رہتا ہے اتنے دن فقیر کہاں رہتا ہے، کوئی نہیں جانتا، فقیر دفتر میں سوٹ پہن کر بیٹھا ہے یا کسی مسجد میں نمازیوں کے جوتوں پر نمبوں والے ٹوکن سجائے میں لگا ہوا ہے، وہ کسی اسمگلر کی، کسی ملک دشمن کی جاسوسی پر لگا ہوا ہے یا کسی حکیم کے مطب پر بیٹھا خاک کی بریا میں شفا لپیٹ لپیٹ کر مریضوں کو استعمال کی ہدایات کے ساتھ دے رہا ہے، کوئی نہیں جانتا، مگر فقیر خوب جانتا ہے، رزق وہی خالص ہے جو باتوں

سے نہیں ہاتھوں سے کیا جاتا ہے۔

”آپ یہ بھی دعا کریں سائیں جی! کہ ہم سب کو ایسا سوچنے کی توفیق مل جائے۔“

”دعا ہی تو کرتے ہیں دعا کرنے کے لیے ہی بیٹھتے ہیں! باؤ صاب! آپ راستے میں رکنے کی غلطی کبھی نہ کرنا جو جان جو کھوں میں ڈال ہی تو دریغ نہ کرنا۔“

”ہوں۔ سائیں جی! اس روز اس لڑکی کو کتنی مشکلات کی بات سنار ہے تھے آپ۔“

”ہاں! اختر نے کڑکڑی منہ سے ہنسا کر سر ہلایا۔ ”پتا ہے اس پر مشکل کس کی وجہ سے آئی ہے؟ سرمت جھکاؤ باؤ صاب! امن اور زن میں تو ازن پیدا کرلو! تاکہ وہ اس مشکل سے بچ جائے۔“

”میرا دل ڈر گیا ہے اس روز سے آپ ایسی باتیں مت کرو۔“

”ڈرنا نہیں! نانا ڈرنا نہیں۔“ اختر نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا من صاف ہے باؤ صاب! بس سمت کے لعین میں بھٹک رہے ہو جس دن اس کا لعین ہو گیا اس دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کمال کی بات نہیں ہے کبھی ڈراتے ہیں کبھی تسلی دیتے ہیں میں مانتا ہوں سب ٹھیک ہی کہا ہو گا مگر وہ جو من پالیتے ہیں وہ تو عبادت گزار ہوتے ہیں۔ تسبیح کے دانے کرانے والے طویل سجدوں میں راتیں گزارنے والے دیں تو برا گناہ گار ہوں۔“

”واہ باؤ جی! بڑے بھولے ہو۔“ اختر ہولے سے ہنسا۔ ”عبادت سجدوں اور تسبیحوں ہی کا نام نہیں ہے سجدے اور قیام رکوع اور تسبیح بندگی کی علامت ہے مگر عبادت کے تو کئی رنگ اور بھی ہیں وہ جو اس کی مخلوق کے لیے آسانیاں تلاش تہا ہے وہ جو اس کے بندوں کے لیے دل میں بغض اور حسد نہیں رکھتا وہ جو اس کے بندوں کا برا نہیں چاہتا وہ بھی عابد ہے اس کی عبادت کا بھی ایک راجہ ہے۔“

”کیوں گھبرا گئے باؤ جی۔“ اختر ہنس کر بولا۔ ”فقیر کو اتنی پرسنل باتیں کیسے پتا چل گئیں۔ ایک دن آئے گاجب آپ کو بھی پتا چل جایا کریں گی۔“

”چھ! میں اب چلتا ہوں۔“ وہ جیسے مزید رواشت سے قاصر ہوا۔

”ہاں۔ ایک دل ایسا ہے جس کو کبھی توڑنا نہ اس پر شک کرنا کیونکہ آپ کے معاملے میں وہ بڑا بے لوث ہے بڑا کھرا ہے جو یہ غلطی کر گئے تو جھوٹا ہی عبادت مٹی ہو گئی۔“ اختر نے اس کے اٹھتے اٹھتے ایک اور وار ٹھک دیتے ہوئے کہا۔

وہ سر کی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر تازہ ہوا تھی اور سانس لینا آسان تھا۔ اس نے ہوا کے سنگ آتے دھوپ کے پادل سے چرا چمانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر اس سمت دیکھا جہاں سے وہ دھواں پھیل رہا تھا۔ ایک نوجوان جو شکل سے تعلیم یافتہ لگ رہا تھا ہلکی موچھیں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی چہرے پر سجائے سر پر لاسنگ کی بنز ٹوپی رکھے کالا پردہ پہنی چڑھا ہے بیٹھا اس میں ڈوٹی چلا رہا تھا۔ اس لڑکے کے چہرے پر نرمی تھی اور ہلکا سا ہنسمس۔

”سلام علیکم! اس نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

”و علیکم السلام! اس نے جھکی نظروں کے ساتھ ادب سے جواب دیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”عبدالودود۔“

”کب سے ادھر ہو؟“

”کل ہی آیا ہوں۔“

”وہ پھر تو انجان ہو گے بالکل۔“

”جی الحال تو۔“

”کاڑھا بنا رہے ہو۔“

”نہیں! آلو کی قندیل پکا رہا ہوں۔“

”oh i can feel the difference“ (میں فرق محسوس کر سکتا ہوں۔)

”Every new face is different from the old one“

(ہر نیا چہرہ پرانے سے فرق ہی ہوتا ہے۔)

لڑکے کے جواب نے اسے حیران کیا۔

”بڑھے لکھے ہو۔“

”نہیں۔ لیکن بڑھنے لکھنے کے لیے آیا ہوں، طفل مکتب ہوں۔“

”اللہ کرے کئے رہو پہلے والے بالکے کی طرح جھگ نہ جانا۔“

”قسمت پر منحصر ہے دانے پانی کی بات ہے۔“

”ہوں! اس نے ہاتھ بڑھا کر عبدالودود سے مصافحہ کیا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا آپ عبدالودود کے سامنے بہت چھوٹا لگا تھا۔

”ایک دل ایسا ہے جس کو کبھی نہ توڑنا نہ اس پر شک کرنا۔“ واپسی کے سفر کے دوران اس نے بار بار یہ بات دل میں دہرائی۔

”دل کس کا تھا۔ جو اس کے معاملے میں بڑا کھرا اور بے لوث تھا۔“ وہ فوری طور پر اندازہ لگا کر کانہ فیصلہ کر سکا تھا۔

☆☆☆

”فضو! اور رازی کو ایک سفیٹیشن نہیں ملنے والی کیا؟“ بلال نے سعد کو اپنے آفس میں بلا کر کچھ اہم معاملات ڈسکس کرنے کے بعد پوچھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ اس نے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

”میرا اس بارے میں کوئی خیال نہیں ہے یہ مکمل طور پر تم پر منحصر ہے تم جو چاہو فیصلہ کرو۔“

”چھا! وہ ہنسا۔ ”کیا میں فیصلے کرنے کے لیے اتنا آزاد ہوں۔“

”نہیں کوئی شک ہے کیا؟“

”شک کا پتا نہیں میں تو متفرم کرنا چاہ رہا تھا۔“ اس نے انٹر کام کار بیورو اٹھاتے ہوئے کہا۔

”مس لینا! میں اور ڈیڈی اٹھتے سچ کریں گے اس کے لیے آپ شیڈول میں جو تبدیلی لاسکتی ہیں، لے آئیے۔“ اس نے بلال کی سیکریٹری سے کہا تھا۔

”ہوں۔“ بلال کے لیے یہ غیر متوقع بات تھی۔ انہیں لہجے کے دوران ایک اہم بزنس ڈیل ڈسکس کرنی تھی، ان کے دماغ نے لہجے نقصان کے تمام پہلو منٹوں میں کھیل کو لیٹ کیے اور کھٹ سے جواب مرتب کیا۔

”کہاں لہجے کر رہے ہیں ہم! ابراہیم کے ڈرہا ہے پر؟“ انہوں نے اپنا فون آف کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! وہ آپ کے معیار پر پورا نہیں اترے گا۔“ سعد نے سر ہلایا۔ ”ہم گھر پر لہجے کر رہے ہیں اور اس لہجے کا

اسٹینڈرڈ اور کوالٹی ہی ضوئی اور رازی کے مستقبل کا تعین بھی کرنے والی ہے۔

”وہ کیسے؟“ انہوں نے بغیر سوچے پوچھا۔

”کیا ان کی کارکردگی کا پیمانہ جاننے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ ہو گا کہ وہ دو افراد جن کے لیے ان کے درجن بھر عملہ موجود ہے اور جو کبھی اکٹھے کسی ایک بھی کھانے پر موجود نہیں ہوتے وہ اچانک اکٹھے لے کر کس کی پاس پہنچ جائیں تو ان کا رد عمل کیا ہو گا۔“

”واٹر گائے“ (مقل مندر لڑکا) بلال نے بے اختیار کہا۔

”جبکہ آپ کا خیال ہے کہ صرف آپ ہی واٹر (مقل مندر) ہیں اور باقی لوگ otherwise (یوں ہی) ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”ثابت ہوا ایم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔“ بلال کے ذہن سے سعد کی بات شاید نکلی نہیں تھی۔

”ہاں“ جب میں ان جاسوسوں کے اپنا پیچھا کرنے کا عادی ہو جاؤں گا جو میری ہر ہر حرکت نوٹ کرنے پر مامور ہیں تب ثابت ہو جائے گا۔“

”اس بات میں یہ اضافہ بھی کر لیتا تھا کہ جن کو میں اکثر چمکے دینے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔“ بلال نے ان کے ہونے کہا۔

”وہ میرا Trait (طریقہ) ہے۔ اس کو سراہا جانا چاہیے۔“

”دیکھتے ہیں۔“ بلال دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

سعد زیر لب مسکرایا اور ان کے پیچھے چل دیا۔

”یہ میں نے فکر کی ہیں“ یہ سب“ سارہ نے سر اٹھا کر ذرا سا اونچا کیا۔

”مگر کئی ایم سوری۔ اس میں بہتری کی گنجائش کافی زیادہ ہے۔“ سعد نے ان فکر زرا انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

جن میں سارہ نے رنگ بھرے تھے۔ سارہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ سعد اس کی کارکردگی پر تو حیرت سے کہنے کے بجائے اس پر تنقید کر رہا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا۔

”مچھوڑو منٹ کی گنجائش تو ہمیشہ ہوتی ہے نا۔“ وہ شاید اس کی نظروں میں چھپی حیرت اور بے یقینی کو سمجھ رہا تھا۔

”ہاں“ مگر تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ ان ہاتھوں نے کیا ہے۔“ سارہ نے اپنے ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے پھیلائے۔

”دیکھ مسسز اور نوٹ کے جڑی رگوں کے ساتھ جن میں کم رفتار سے دوڑنا خون انہیں ست اور کمزور بنا دیتا ہے۔“

سعد نے اپنے سامنے پھیلے ان ہاتھوں کو دیکھا، جن کی ہتھیلی کی کھال چرمی لائی ہوئی تھی۔ اس پر جھرمٹا سی پٹا تھیں اور جن کی کھال زردی مائل تھی، ان میں سرخی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے بے اختیار سارہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”یہ ہاتھ بہت پیارے اور بہت ہمت والے ہیں سارہ!“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ان ہاتھوں نے پہلے ہی بہت ہمت والے کام کیے تھے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ایسے ہی کام انجام دیں گے۔“

”نہیں۔“ سارہ نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھینے ہوئے کہا۔ ”یہ اب کوئی بھی کام بہتر طریقے سے نہیں کر سکیں گی۔“

”تم جانتی ہو۔ مجھ پر ایسی فیکٹوری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اب میں ان کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا۔“ سعد کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ان ڈرائنگ بکس میں زیادہ سے زیادہ طر کر اور اس طرنگ میں پرفیکشن کے لیے کوشش کرو، جس دن کسی فکرو میں تمہاری طرنگ اتنی پرفیکٹ ہو گئی کہ اس پر حقیقی رنگوں کا گمان ہونے لگے۔ اس دن میں تمہیں ایک رازی کی بات بتاؤں گا۔“

”کس کے بارے میں؟“ سارہ نے پرتخت جس کنبے میں کہا۔

”تمہارے بارے میں اور۔“

”اور۔“ سارہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اور اپنے بارے میں۔“

سارہ کے ارد گرد کوئی پھول کھلا تھا یا روشنی کی کوئی کرن چمکی تھی۔ اسے لگا اس کے ارد گرد سب کچھ روشن اور رنگارنگ ہو گیا تھا۔

”بس اس تم دیکھنا میری طرنگ کتنی بہتر ہوتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”اور یہ کیا بنا ہے خیر؟“ سعد نے لچکھلے ریز سے بے فکرو ذکی طرف دھیان کیا۔

”یہ چھ انچ کی بار ہے۔“ سارہ نے مسکرا کر کہا اور یہ سر ڈھڑ بانو، ٹانگیں میری ہیں، ان کو جوڑنا باقی ہے۔ یہ فکرو اس چھ انچ بار پر موقوف کرے گا۔“

”انٹرٹیننگ۔“ سعد مسکرایا۔ ”مجھے بھی تو بتاؤ بھی، یہ فن کیسے سیکھا تم نے۔“ سارہ سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک یہ پہلا موقع تھا جب سعد نے اس سے سرکس سے متعلق کوئی بات پوچھی تھی۔

سارہ نے جسم کے وہ مختلف حصے جوڑے اور ان کو انگلیوں کی حرکت سے ہوا میں اڑایا۔ ریز کا چلیلا فکرو ہوا میں اٹھنا بازی کھانے کے بعد میز پر گرا اور مختلف حصوں میں بٹ گیا۔

”وہ!“ سارہ نے افسردہ نظروں سے ان ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور پھر سعد سے مخاطب ہوئی۔ ”جب میں پہلی بار رنگ میں یہ کتب کرنے کے لیے داخل ہوئی تھی، اس وقت میری عمر صرف نو سال تھی، میں اس وقت اس سے بہتر تھی۔“

”نوسال۔“ سعد نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ سارہ نے سامنے کی دیوار پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔ ”میں نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس میں سنہری بوٹے جھپکتے تھے۔ میرے بالوں کو کس کر یوں باندھ دیا گیا تھا کہ وہ میری کسی جنبش کے دوران میری آنکھوں کے سامنے لہر لہر کر اسے غلط نہ کرادیں۔“

”تم بہت ایکسٹنڈ ہو رہی ہو گی، ہے نا۔“ سعد نے کہا۔

”جی نہیں وہ کیا تھا۔“ سارہ نے یاد کیا۔ ”جوش، خوشی، خوف، کچھ کرو کھانے کا شوق یا پھر مجبوری جو بھی تھا رنگ میں داخل ہو کر کچھ بھی کرو کھانے سے پہلے۔ میرے پاؤں جیسے زمین پر ہی نہیں پڑ رہے تھے۔ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے نرینر زکی تقلید میں سینٹرل لائٹ کے نیچے کھڑے ہو کر جمع کی طرف ہوائی بو سے اچھالے۔“

”نوسال کی بچی اور ہوائی بو۔“

”ہاں!“ سارہ نے سر ہلا کر کہا۔ ”یہ بھی ہماری ٹریننگ کا حصہ تھا، مجمع کو ایکسٹ کرنے کے لیے۔“

”واؤ! سلام ایسے ٹرینر ز کو۔“ سعد نے بے ساختہ کہا۔

”پھر میں نے بار بار ہاتھ ڈالے اور اس پر جھول کر اس پر تیری طرح سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس پہلے ایکشن پر

مجھے داد اور تحسین، تالیوں اور سیٹیوں کا دس منٹ تک رسائی ملتا رہا۔ بس پھر وہاں سے جو سفر شروع ہوا تو وقت تک نہیں رکا جب تک اس بارے میں میرے پاؤں کے انگوٹھے کا بار اٹھانے سے انکار نہیں کیا۔ "سارہ دوبارے نظریں ہٹا کر سجدی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

"بارے! کہا۔ سارہ خان! امیرا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا اب تمہاں سے رخصت ہو جاؤ، تمہیں کسی اور حصہ بننا ہے۔" سعد نے کہا۔

"کیا واقعی اس نے یہ کہا تھا؟" سارہ نے سجدی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں اس نے یہ ہی کہا تھا۔ شاید اتم اس کی یہ آخری سرکشی سن نہیں پائیں۔" سعد مسکرایا۔

سارہ خان کے ارد گرد پھیلی روشنی کی لوچکھ اور بڑھ گئی تھی۔

"مہندی کے فنکشن میں مجھ سے زیادہ لوگی کوئی دوسری لگ رہی ہوگی۔" ماہ نور نے آئینے میں خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ماں کو منفرد بننے کا اتنا شوق ہے کہ وہ چاہتی ہیں ان سمیت ان کے گھر کا ہر فرد اوروں سے ہر جگہ منفرد آئے۔ مجھ نے سہی ۴ نہیں تو اچھی طرح پتا تھا کہ آج کل مہندوں پر کیا ہونا چاہا ہے۔ لے کر مجھے وہی اولڈ اسٹائل مغلیہ لک دینے کے چکر میں ہنسی کا گول کپانا کر رکھ دیا سب کے سامنے۔" اس نے اضطراب کی کیفیت میں لپٹا شائع کا ایک اور کوٹ ہونٹوں پر لگا لیا۔

"۴ ماہ نور! اس کی کزن نمونے لپ شائع اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یار اتم اور ڈو کر رہی ہو خود کو اور کل کے فنکشن کے بارے میں بھی خواہ مخواہ کامپلیکس کا شکار ہو رہی ہو۔"

you were looking so beautiful baby

اس کی دوسری کزن رانیہ نے اس سے مسکرا کر اچھپتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب پتا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔ "گوئی بھی میری طرف مسکرائے بغیر نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اتنی کانفیس ہو رہی تھی مجھ سے تو ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔"

"اس لیے مسز صدیقی میری می سے پوچھ رہی تھیں کہ ماہ نور کا کس رشتہ تو طے نہیں کیا نا ابھی فائزہ نے رانیہ نے کہا۔ "یہ شاید انہوں نے اس لیے پوچھا کہ اگر رشتہ طے ہو چکا ہو تو تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے پر بھی ہنس لیں۔" رانیہ نے نمونے کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور وہ دونوں کھکھلا کر ہنس دیں۔

"ڈالو! ڈالو! میرا مذاق۔" ماہ نور نے ان دونوں سے اپنی چیزیں چھینتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ شیفون کے ڈیپ ریڈ گھیردار فرائک کے گلے اور بانوؤں پر بلیک ویلوٹ لگا کر ڈیپ ریڈ ٹیگنوں سے تیسرے کام می نے کسی ماہر کا ریکرے ہوایا تھا۔ بلیک ٹیگنوں سے اوپر ان جیوگری بھی می کا انتخاب تھی۔ اس کے بالوں کا ماہین نے اس روز ایک نیا اسٹائل دیا تھا جس سے اسے خود اپنا آپ بلابلد لاسا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ڈیپ ریڈ لپ اسٹیک بھی تھی اور چہرے پر ہلکا میک اپ تھا۔

"کیا میں نے واقعی خود کو اور ڈو کر لیا ہے۔" آئینے سے نظر ہٹا کر اس نے رانیہ سے پوچھا۔

"اسے نہیں یار! میں نے ایسا صرف اس لیے کہا کہ تم اور کافیڈنٹ نہ ہو جاؤ۔" وہ ہنسی۔

"نہیں نا، جیج بتاؤ۔" وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔

"ہم ایک دم برس لگ رہی ہو۔" شمو نے کہا۔

"جلدی کرو لو کیونکہ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" فائزہ نے ماہ نور کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

شادی کا وہ فنکشن حسب توقع شان دار تھا۔ جس میں ملک کی ہائی کلاس شرکت کر رہی تھی۔ چچی صابرہ نے خاص طور سے اس دن یہ بات نوٹ کی تھی کہ ماہ نور جو اب کی بار انہیں اکٹلی ہوئی اور ہر جے سے بے زار نظر آتی تھی۔ اس فنکشن کے دوران خاصی جھک رہی تھی۔

"تنی باری بی بی ہے فائزہ کی کاش اللہ نے ہمیں ایک ہی بیٹا دے دیا ہوتا۔" ان کے دل میں نہ جانے کیوں ہلک سی آہ تھی۔

فنکشن کے اختتام پر اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں بیلا کے کسی دیرینہ دوست کی فیملی سے باتیں کرتے ہوئے ماہ نور کو ان ہائی پلاز میں اپنے پاؤں اچانک حد سے زیادہ دکھتے ہوئے محسوس ہوئے جن پر وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے ادھر ادھر کھوم رہی تھی۔

"چلیں نا اب بیلا! میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے تیری بار بیلا سے کہا۔

"بس دو منٹ بیٹا! انہوں نے نرمی سے کہا اور اس نے روہائی ہو کر می کی طرف دیکھا جو خود بھی کسی آٹنی سے خود گفتگو تھیں اور یہ سلمان کا بچہ نہ جانے کدھر ہے اب اس کا انتظار بھی کرنا پڑے گا۔

سلمان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے اس نے دانت پیسے اور اسی طرح ادھر ادھر کھومتی اس کی نظریں اوپر سے آئی کیڈ پول لفٹ کے رکنے پر اس سے باہر نکلنے والے لوگوں کے گروپ پر پک گئیں۔ اس وقت بلاشبہ کسی نئے بہروپ میں نہیں اپنے اصلی روپ میں کھڑا کسی سے رخصت ہوتے ہوئے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو تین اور لوگ بھی تھے جو رخصت ہو رہے تھے۔

"سعد! بے اختیار ماہ نور کے منہ سے نکلا اور وہ چند قدم آگے بڑھی۔ "کیسا اتفاق تھا کہ وہ ایک ہی چھت کے نیچے کھڑے تھے۔ اسی دم سجدی نظر ماہ نور اور اس کے اپنی طرف بڑھتے قدموں پر پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ماہ نور کو وہیں رک جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے فون پر تیزی سے اس کے لیے میسج ٹائپ کیا تھا۔

"میں ابھی تمہارے شہر میں ہی ہوں، لیکن ابھی نہیں ہم پھر ملیں گے۔"

ماہ نور اس کا اشارہ دیکھ نہیں پائی یا پھر شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی، جب اس کے ہاتھ میں پکڑے فون پر میسج کی ٹون بجی تھی۔ اس نے رک کر میسج پڑھا اور بے یقینی سے سجدی طرف دیکھا۔ وہ اس انداز میں سر ہلا رہا تھا جیسے اسے یقین دلایا ہو۔

"ہاں یہ میں نے ہی بھیجا ہے۔"

ماہ نور یوں منہ کیے جانے پر ششدر کھڑی تھی۔ مگر اس میسج نے سجدی طرف اس کے پیش قدمی روک دی تھی۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)



”بیٹا! دروازہ کھولو میں آپ کی پھپھو ہوں۔“
یعنی نے کھڑکی سے جھانکا تو ایک الزمار ڈون خاتون
کھڑی تھیں۔ لوئرٹل کلاس کے محلے میں اتنی امیری
پھپھو؟ اول تو اس کی کوئی پھپھو تھی ہی نہیں تو پھر یہ
کون ہے اس نے تذبذب کے عالم میں دروازہ کھول
دیا۔

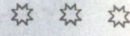
”قاسم بھائی گھر پہ ہیں؟“ خاتون نے اس سے بغل
گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں! بابا کو فوت ہوئے سال ہو گیا۔“ یعنی نے
کہا کہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
”مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ ان بنز آنکھوں میں سرخی
سی گھل گئی۔

”معذرت پھپھو! میں آپ سے کبھی نہیں ملی میں
آپ کو پہچانتی بھی نہیں۔ امی پڑوس میں گئی ہیں۔ میں
چائے بناتی ہوں۔ آپ بیٹھے تب تک تو آہی جائیں
گی۔“ اجنبیت سے بولتے بولتے اسے مہمان
نوازی یاد آئی۔

وہ بے تکلفی سے ننگے فرش پر آلتی پالتی بار کر بیٹھ
گئیں۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے نہایت قیمتی اور
نقیس لباس پہنا ہوا تھا۔

”نہ میرا بیٹا! میں چائے نہیں پیتی۔ تم اگر میرے
پاس بیٹھو۔“ ان کی صاف ستھری جلد پر آنسو اور دکھ
چمک رہا تھا۔ وہ قاسم سے ملنے آئی تھیں ان کی موت
کی خبر یقیناً ”ان کے لیے دھچکا سی تھی۔“

یہ بات کے ساتھ اسپتال گئی تھیں جانے کتنی دیر
جاتی۔



”میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے یعنی!“ اس
نے کالج کا یونیفارم بھی نہیں اتارا تھا کہ صبحت نے
سے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ وہ سیکنڈ اری کا
خری پرچہ دے کر آئی تھی۔ اس نے صبحت کے
سرے سے تاثرات کا جائزہ لیا۔ گزشتہ دن والی الجھن
اور پریشانی اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے

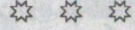
”میں نے انہیں سعودیہ سے اتنے خط لکھے
کوئی جواب ہی نہیں ملا تین دن پہلے ہی ادھر آئی
کراچی۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں۔
”تمہارا باپ بہت اچھا آدمی تھا۔“ وہ یعنی کو مخاطب
کر کے بولیں۔ یعنی نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ
لیا۔ وہ اس کی امی کی عمر کی خاتون تھیں مگر خوش حالی
بے فکری کی بدولت وہ اپنی عمر سے کئی برس کم دکھا

دے رہی تھیں۔ ریڈ شل فین کی ہوا ان کے دھڑکنے
کے نیچے چھپے سرخی بالوں کو جھانک رہی تھی۔ اسے ان کی تہذیب میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا! ہم سب
اچانک وارد ہونے والی پھپھو پر حیرت ہوئی تھی جو کہ ایک دوسرے سے انسانیت اور اسلام کا رشتہ ہے۔
طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا حلیہ چہرے کے
خود خال اور اطوار لوئرٹل کلاس سے تعلق رکھنے والے کی کوشش کی۔
ان کے چہرے پر نہ ہی اس کے بیباکی کوئی مشاعرہ
تھی۔

”بہت ہی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا تمہارا باپ
مجال ہے جو ذرا بھی غصے میں آجائے اتنے پیار
دل کا تھا کہ جیسے اللہ نے اس کا دل اپنے ہاتھوں سے
ہو۔“ اب ان کی سفید رنگت میں سرخی گھل
تھی۔
یعنی نے انہیں پانی لایا اور پھر وہیں بیٹھ گئی۔
ساتھ وہ اس سے اس کی بڑھائی اور مشاغل کے بارے
میں پوچھتی رہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کے بعد بھی
صبحت نہ آئیں تو وہ دوبارہ آئے کا وعدہ کر کے
گئیں۔ اس نے بھی نہیں روکا کیونکہ صبحت کے

صبحت چونکہ کم کم ہی نصیحت کرتی تھیں سو اس
سب باتیں دھیان سے سنا اور یلو سے باندھ

لیں۔ براہ راست کچھ پوچھنے کی اور کہنے کی اس میں
ہمت نہیں تھی۔ کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ اسے اپنے
اکلوٹے پن پر کھل کر دکھ ہوا۔ کم از کم پایا ہوتے تو وہ بھی
مجھے کچھ نہ پوچھ تو کہتے۔ اس نے سوچا وہ ماں سے زیادہ
باپ کے قریب تھی۔



”تم خوش ہو بیٹا؟“ صبحت نے نم آنکھوں سے
اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی امی میں بہت خوش ہوں۔ پھپھو کل آئیں
گی۔“ وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔ پچھلے تین
ہفتوں بعد وہ اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے
پر واقعی طمانیت اور خوشی تھی جو ان کی تین ہفتوں کی
بے چینی کو نگل گئی۔

”امی! میں اب تک نہیں جان سکی کہ وہ آخر کس
طرح میری پھپھو ہیں؟ بیباکی تو کوئی بہن نہیں تھیں نہ
ہی کوئی دور پرے کی کزن تھیں“ اس نے فرصت ملنے
ہی پوچھا جس پر صبحت مسکرا کر رہ گئیں۔

”بیٹا! یہ تو اپنی پھپھو سے ہی پوچھنا۔ میں تو بس
انتا جانتی ہوں کہ جب تم بہت چھوٹی تھیں تو یہ سلیمان
کے ساتھ آئی تھیں۔ دو دن رکی تھیں اور تمہارے
لیے دھیر ساری چیزیں لائی تھیں۔“



اس سے زیادہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ انہوں نے
لا علمی کا اظہار کیا۔

”پھو! میں ایک بات پوچھوں؟“ یعنی نے وہ وہ کا
گلاس انہیں تھملا اور سامنے بٹھتے ہوئے اجازت
چاہی۔ وہ انہیں پھپھو ہی کہتی تھی۔ بقول ان کے وہ
پھپھو کے گی تو ان کو یاد رہے گا وہ کس شخص کی بیٹی ہے
اور اسی کے گی تو وہ سانس نہ بن جائیں۔

”ہاں بیٹا! پوچھو۔“ وہ کتاب ایک طرف رکھ کر
شفقت بھرے لہجے میں بولیں۔

”آپ میری پھپھو کیوں ہیں؟ میرا مطلب بیلا آپ
کے کون تھے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ اس کے
چہرے پر الجھن اور تجسس تھا۔

”بیٹا! یہ ہے کہ بہت عرصے پہلے جب میں
تمہارے بچپن میں اپنی گاڑی لے کر باہر نکلی۔
میں ڈرائیونگ میں نو آموز تھی۔ ایک ٹھیلے والے کو
میں نے ٹھہرا دی۔ اسے کلنی چو میں آئیں بازو میں
فریچر ہو گیا پاؤں میں موج بھی آئی شاید۔ میں ایک
کم عمر لڑکی تھی۔ ڈرتے ڈرتے گاڑی سے اتری۔ اس
سے معذرت کی۔ اپنی گاڑی میں اسپتال چلنے کو کہا تو
اس نے مجھ پر صرف ایک نظر ڈال کر کہا کہ کوئی بات
نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس میں اتنا طرف تھا کہ
میں حیران رہ گئی۔ تمہیں بتا رہے وہ شخص تمہارا باپ
تھا۔ اس دن میں گھر سے لڑکھائی تھی، میرے بڑے
بھائی سلیمان کے طالب ماموں کی گھڑی، مجھ سے گر کر
لوٹ گئی تھی۔ انہوں نے اتنا غصہ کیا تھا اتنا زیادہ کہ تم
تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ پھر جب میں نے تمہارا پاپا کو
دیکھا تو مجھے اتنی حیرت ہوئی کہ اس دنیا میں ایسے لوگ
بھی ہیں جو فوراً معاف کر دیتے ہیں اور بلاوجہ غلطی
کے بے عزت نہیں کرتے۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھیں۔
”ہاں یہ تو بلیا کی عادت تھی۔“ اس نے عام سے
انداز میں کہا۔

”نہیں بیٹا! تم اس تجربے سے نہیں گزریں۔

انیس سال کی لڑکی اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے کوئی حادثہ
کر دے تو اس کا جیسا جتنا دل بہت سم جاتا ہے۔ میں وہ

ڈرائیو آج بھی جب محسوس کرتی ہوں تو قاسم بھائی
لیہل سے دعا کرتی ہوں۔“

”آپ تو پھر آپ نے کیا کیا؟“

”پھر میں نے گاڑی میں ان کا بیٹھا کیا۔ اتنی
مجھ میں بھی نہیں کہ ان کی کوئی بدکردانی میں چپکے
گھر دیکھ لیا ان کا۔“ وہ خاموش ہو گئیں۔

”آپ تو آپ نے سلیمان سے میری شادی اس
کی ہے کہ میں بلیا کی بیٹی ہوں۔“

”صباحت نہیں چاہتی تھی کہ یہ شادی ہو جائے
دل میں بہت خدشے ہوتے ہیں۔ مگر میں نے صابرا
کو قاسم بھائی کا واسطہ دیا کہ اگر میں ان سے کتنی
منع نہ کرتے اور سلیمان کو طبقاتی فرق کی وجہ سے
اعترض نہ تھا۔“

”پھر۔“

”میں نے اس سے کہا کہ اتنے بڑے دل والے
آدی کی بیٹی چاہے جیسے ہی پلی بڑھی ہو، کبھی بھی
دل نہیں ہوگی اور نہ ہی اس میں طبقاتی فرق کی
نشانی نظر آئے گی۔ یوں بھی میں تمہیں تو دیکھ ہی
تھی۔ قاسم بھائی اور صباحت نے بہت اچھی پرور
کی ہے تمہاری۔ جب میں تمہارے کالج جانے
وقت میں اگر صباحت کی مٹیں کرتی تھی تو سلیمان
کہتا تھا کہ میں بچھتاؤں گی۔ اب تم خود دیکھو وہ
خوش ہے تمہارے ساتھ۔“

”تو آپ نے شادی اتنی جلدی کیوں کی؟“ اس
سوال ختم نہیں ہو رہے تھے۔

”تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ ساس سے
سوال جواب نہ کرنا۔“ وہ مصنوعی حقارت سے بولیں۔
”کہا تھا، لیکن آپ تو میری پھپھو ہیں نا۔“

”سلیمان کو پڑنے جانا تھا۔ میں کیا کرتی تھی
سارا دن۔ میں نے سوچا کہ ہم دونوں ساتھ رہیں
پر دس میں تو اچھی گزرے گی، ورنہ تمہارا
گھس اور شادی نہ ہو جائے۔“

یعنی سوچ رہی تھی کہ واقعی اعلا طربی اور
سلوک سے بڑھ کر کوئی وہ نہیں۔



”لڑکیوں کو اتنا پڑھانے لکھانے کا کیا فائدہ بھی کرتا تو انہوں نے ہانڈی جو اہامی ہوتا ہے۔“ اس کی ساس بھیلی کی کسی خاتون سے مخاطب تھیں۔ موضوع گفتگو جانے کیا تھا مگر دور ان گفتگو اس کی ساس نے اپنا من پسند فقرہ ضرور ٹانگ دیا تھا اور وہ جو کچن میں کھڑی ہانڈی بھون رہی تھی اس کا جی چلا کہ اپنے چیز کے سوٹ کیس میں سنبھال سنبھال کر رہی گئیں ڈگریاں واقعتاً ”چولے میں جھونک دے۔ پتا نہیں ابانے اس خاندان میں کیا دیکھ کر اسے یہاں تھا۔ شاید فرقان کی ڈگری ہی ابانے کے من کو بھائی تھی لیکن فرقان کے گھروالوں پر ابانے غور و فکر کی زحمت ہی نہ کی۔

وہ لوگ ان پڑھ نہیں تھے جاہل تھے اور اپنی جمالت پر مغرور اور مسرور تھے۔ فرقان جانے کیسے پڑھ لکھ گیا تھا اور پڑھ لکھ کر اس میں بھی ایک خاص قسم کا گھمنڈ آ گیا تھا جب ہی اس نے ماں بہنوں کو بتا دیا تھا کہ اس کے لیے خاندان کی ملل پاس یا میٹرک فیل لڑکی ڈھونڈنے کے بجائے کوئی پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈیں حالانکہ اس کی ذہنی مہارت ان ہی ملل پاس یا میٹرک فیل لڑکیوں سے ممکن تھی مگر قسمت کے ستارے نگرا گئے بسکہ اکرام سے۔

بسکہ فرقان کی خالہ زاد بہنوں کو یوشن پڑھاتی تھی فرقان کی خالہ کا گھر بسکہ کے گھر کے قریب والی رہائشی کالونی میں ہی تھا۔ جب ان کی بڑی بیٹی شہر کے مشہور انگلش ایڈمیٹ اسکول میں پڑھنے کے باوجود مسلسل چار

سال تک چوتھی جماعت میں فیل ہوتی رہی تو انہوں نے اسکول بھی بدل ڈالا اور یونیورسٹی۔ نئے اسکول میں جا کر بیچی نے اپنی بہت سی کلاس فیلوز کے منہ سے بسکہ کا نام سنا جو شام کے وقت بچوں کو اپنے گھر پر کہ فیل میں زیادہ وقت دے کر بہت محنت سے پڑھاتی تھیں۔ حرا اپنی ماں کو لے کر بسکہ کے گھر پہنچ گئیں۔

بسکہ بیگم نے ناقدانہ نگاہوں سے بسکہ اور اس کے گھر کا جائزہ لیا۔ یہ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر کا گھر جس نے ہمیشہ بچوں کو اپنی دولت جانا تھا اور جو بہت بہت دولت پاس رکھتے تھے وہ اپنے بچوں کو ذہنی طور سے آراستہ کرنے پر خرچ کر چکے تھے لیکن یہ بہت رکھاؤ والا ملل کلاس گھر نہ تھا جس کی تہذیب اخلاقی اور شرافت کی دوسرے بھی گواہی دیتے تھے۔ بسکہ بیگم نے مطمئن ہو کر اپنی دونوں بیٹیوں کو بسکہ کے پاس یوشن لگوا دیا۔ ساتھ ہی باور کروا دیا۔

”دیکھو بھی افس منہ ماگی دوں گی مگر میری بیٹی پاس ہونا چاہیے۔“

”میں کو شش کروں گی اتنی اگر گارنٹی نہیں دے سکتی۔ اگر یہ خود محنت کرے تب ہی بات بنے گی۔“

بسکہ نے حرا کو دیکھا تھا۔

”میں محنت کریں گی جی۔“ حرا کو اپنی بی بی نازک نے

ٹیچر بہت پسند آئی تھی جب ہی فوراً ”محنت کرنے کی کہاں بھولی۔ حرا سے دو سال پچھلی شہزادہ بن کے مقابلے میں کچھ ذہن تھی وہ جو کچھ جماعت میں صرف دو سال

”نہیں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو بسکہ پڑھ کر فارغ ہوئی ہے۔ ان کے ابو کا نظریہ ہے کہ تعلیم کے دوران بچیوں کے رشتے کی بات چھیڑ کر انہیں دسترب نہ کیا جائے مگر یہ کیسوی سے پڑھ سکیں۔ البتہ آج کل ہم بسکہ کا رڈھونڈ رہے ہیں۔“

بسکہ کی امی نے شائستگی مگر صاف گوئی سے جواب دیا۔

”بس تو پھر ہمارا بیٹا آکر دیکھ لیں۔ ماشاء اللہ پڑھا لکھا ہے۔ اچھی نوکری ہے اور اگر نوکری نہ بھی ہوئی تو



سچی بات ہے کہ نوکری کی اسے خاص ضرورت بھی نہیں۔ اس کے ابا کا چلنا ہوا کاروبار ہے۔ مین بازار میں کراگری کی دونوں بڑی دکانیں ہماری ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ دولت کے معاملے میں تو اللہ کا خاص کرم ہے ہمارے خاندان پر بس بچے نے ضد پکڑی ہوئی ہے کہ شادی کرنی ہے تو پڑھی لکھی لڑکی سے نہ سمجھنے آپ کی بیٹی کا ذکر کیا کہ ماشاء اللہ پڑھی لکھی بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ میں نے کہا چلو چل کر دیکھتے ہیں اگر قسمت میں ہو اور رشتہ داری بن جائے گی نہیں تو خیر صلا۔

فرقان کی والدہ کا لہجہ کچھ بے نیازی لیے ہوئے تھا۔ بسمر کی امی کو خاتون پسند نہ آئیں سوٹالنے کو کہہ دیا کہ بسمر کے والد سے مشورے کے بعد جواب دیں گی پھر اکرام صاحب سے اس رشتے کے بارے میں سرسری سہی ذکر کیا تھا کہ وہ بولے، لڑکا دیکھنے میں کچھ حرج نہیں، اور پھر جانے کیسے معاملات طے پاتے ہی چلے گئے۔

مفتی کی انگوٹھی بسمر کی انگلی کی زینت کیانی کہ فرقان کے گھر والوں نے شادی کا شور مچادیا اور وہ جو تعلیم سے فراغت کے بعد لیکچر شپ کے حصول کے لیے کوشش کرنا ہی چاہتی تھی۔ زرارہ انچل اور زیور کے بوجھ سے جھکی گردن کے ساتھ جلد دعویٰ میں جا پہنچی۔

”میرے گھر والوں کو پڑھی لکھی لڑکی کے حوالے سے بہت سے تخطلات ہیں۔ تمہیں کوشش کرنی ہو گی کہ تم گھر والوں کے بے بنیاد خدشات کو غلط ثابت کرو۔“

سہاگ رات کو فرقان نے اسے منہ دکھائی کا ختفہ بعد میں دیا اور نصیحت پہلے کی۔ اس وقت تو اس نے سر ہلادیا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ جن خدشات کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی وہ انہیں کس طور ختم کرتی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلتی تو پڑھی لکھی لڑکی ہونے کا طعنہ ملتا۔ روٹی گول نہ بنتی تب اس کی پڑھائی اور پھوڑ بن پر ایک ہی ہنسلے میں بصرہ کر کے نمٹا دیا جاتا۔ اگر

کوئی ایسا تصور اس کے کھاتے میں لکھ دیا جاتا تو اسے سرزد ہوا ہی نہ ہوتا تب وہ وضاحت یا صفائی دینے کے لیے لب کھولنے کی کوشش ہی کرتی کہ آگے سننے کو ملتا۔

”دیکھا پڑھی لکھی ہے نا۔ کیسے زبان چلا رہی ہے۔“

زبان بے چاری اس الزام پر ششدر رہی۔ اس نے تو عرصہ ہوا اس کا استعمال ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو کل سرسرا میں بے زبان گائے کی مانند رہی تھی۔

پونہی وقت سر نہ کیا۔ اس کی گود میں شاہ ظل کا بے رنگ زندگی کچھ کچھ اچھی لگتی لیکن جب وہ سوچتی کہ اس کٹھے ہوئے فرسودہ ماحول میں اس بچے کی پرورش ان خطوط پر ہوا ہے گی جس کی وہ سہ ہے؟ اندر سے جواب نہیں ملتا۔ کیا اس کا بیٹا بھی ہو کر فرقان ثابت ہو گا پھر نام کا دھما لکھا مگر

اور تمہان سے کوں دور۔ اور شاہ ظل تو چلو پھر لڑکا ہے اگر اللہ نے اگلی بار اپنی رحمت سے نوازا تو ان کی بیٹی فرقان کے خاندان کی لڑکیوں کا پرتو ہوگی۔

بد زبان، جھگڑالو، فلموں و کاموں کی رسیا، اخلاقی اعتبار سے بے بسرہ گھر کے مردوں سے چھپ کر موبائل پر معاشقے لڑانے والی۔

وہ کانپ کر رہ جاتی۔ خود کو سمجھاتی کہ اس خدشے بے بنیاد ہیں۔ اس کی تربیت اس کے بچوں اس ماحول کا عادی نہ ہونے دے گی لیکن جب شاہ ظل کی تو قلی زبان سے اس نے کلمے سننے کے بجائے اسے کافی دنوں سے سکھا رہی تھی نئی اینڈین فلم کا گانا تو اس دن وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پہلی بار اس فرقان سے اپنے خدشات کا ذکر کیا۔

”مجھے ڈر ہے ہمارا بچہ اس ماحول میں رہ کر مجڑبلا گا۔“

”کیا کتنا چاہتی ہو۔ کھل کر کہو۔“ فرقان نے اپنے تیوروں سے دیکھا۔

”نہیں تو میں کیا کتنا چاہوں گی۔“ وہ سسم گئی۔ ”دیکھو بسمر! میں اپنے گھر والوں سے الگ ہونے

تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پہلے ہی تمہارے بڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اچھے بیٹھنے طے ہیں لہذا کوئی خوش گمانی دل میں مت پالنا۔“

فرقان جانے کیسے اس کے دل کے نہاں گوشوں میں چھپی خواہش بھاپ گیا تھا حالانکہ یہ صرف ایک بے ضرر خواہش ہی تھی تو بھی جس کا اس نے کبھی فرقان کے سامنے اظہار تک نہ کیا تھا اور اب بھی وہ فرقان سے اس بارے میں بات کب کر رہی تھی اس نے تو صرف اپنے خدشے، اپنے دکھ کا اظہار کیا تھا۔

اس گھر کے کلین کیسے بات پکڑتے تھے۔ اگر انسان شریک حیات سے بھی اپنی اپنی کیفیات شیرین کر سکے تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا بسمر کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

”افوہ بھی کیا کہہ دیا میں نے۔ ایک تو تم پڑھی لکھی لڑکیاں بہت چھوٹے دل کی مالک ہوتی ہو یا رازدار اور اسی باتوں کو لے کر پریشان مت ہو کر رہو۔ بہہ ہی ہے ناشاہ ظل، پھر آج کل ذیشان کی شادی کا ہنگامہ ہے۔ جو بیس گھنٹے تو بچیاں ڈھو لگی سنبھالے گائے بجائے میں مصروف ہوتی ہیں۔ اس کی زبان پر کوئی بول چڑھ گیا تو

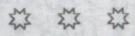
کیا ہوا۔ ذرا سبوتا ہو گا تب ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا لیا کرنا۔“

فرقان نے اس بار نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ اس نے مجازی خدا کی اسی نرم گفتاری کو بہت جانا تھا موصول سے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

”اچھا! اتنے دور بیٹھے بیٹھے کیا گردن ہلا رہی ہو۔ آج تو تم لگ بھی بہت چاری رہی ہو۔ یہاں آؤ نا میرے پاس۔“ اس نے بلایا تھا۔ بسمر کی مسکراہٹ یک لخت غائب ہوئی۔ وہ واقعی بہت خوش گمان تھی۔

”باہر میرے نام کی پکار بڑ رہی ہوگی۔ کمرے سے نکلنے میں ذرا دیر ہوگی تو کہاں تمہیں گی؟ پڑھی لکھی بیو بند کمرے میں ہر وقت ان کے بیٹے کو پٹیاں پڑھاتی رہتی ہے۔“

اسکے ہی دل اس نے زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر سر تاج محترم کو ہماری جھنڈی دکھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔



آج کل گھر میں اس کے دوپور کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ ذیشان کو فرقان کے برعکس پڑھائی لکھائی میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ روپیٹ کر میٹرنگ کرنے کے بعد اس نے باپ کے ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ اس کی شادی بھی اپنے کاموں کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔

اس شادی پر اس کے سرسرا والوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بسمر کو اپنی شادی یاد آتی۔ اس کے سرسرا والے کتنے رسمی سے انداز میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قدرے بے دلی سے اسے بیاہ کر لائے تھے لیکن اب چونکہ دلہن ان کے اپنوں سے آ رہی تھی سو وہ دل میں دبے سارے ارمان نکال رہے تھے۔

بہت دھوم دھام سے ثروت بیاہ کر آئی تھی۔ بالائی منزل پر اس کے لیے نیا پورشن تیار ہوا تھا۔ شروع شروع میں اس کے بے حد چاؤ چونچلے اٹھائے گئے۔ وہ بھی ہنستی مسکراتی اٹھ نکلتی، خیرے اٹھواتی رہی مگر پھر سو کہ سرسرا میں تھوڑے بہت اعتراضات معمولی سی روک ٹوک کا تو سامنا کرنا پڑتا ہی ہے۔ بسمر کو تو وہ واقعی بہت معمولی لگتے تھے۔ وہ ثروت کے ساتھ اپنا موازنہ کرتی تو دل پر لگے کتنے گھاؤ یاد آجاتے۔ ثروت کے ساتھ تو سب کا رویہ حیران کن حد تک اچھا تھا لیکن ثروت چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنے والی لڑکی تھی۔ محسوس کرنے کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ وہ ان باتوں کو برصا چڑھا کر شوہر کے سامنے سناتی۔

ذیشان کے ساتھ فرقان والا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ فرقان نے پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنے کی شرط کے عوض گھر والوں کی خفگی مول لی تھی اور پھر وہ اسی خفگی کو دور کرنے کے جتن کرتا رہا تھا۔

اس چکر میں اس ہستی کو بھی فراموش کر بیٹھا، جو اس کی خواہش کے مطابق ڈھونڈ کر اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کے گھر والوں کو بسمر کے ساتھ پھر نامناسب رویہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا لیکن ذیشان تو گھر والوں کی پسند پر سر جھکا تے

ہوئے ثروت سے شادی پر راضی ہوا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے اس کا محلے کی ایک لڑکی سے زوردار چکر چلا تھا لیکن لڑکی کے گھر والوں نے ایمر جی میں اس کا نکاح دھوا کر اسے رخصت کیا تو ڈیٹان نے بھی ماموں زاد ثروت کے لیے ہاں کر دی۔

شادی ہونے کی دیر تھی کہ ڈیٹان سابقہ محبوبہ کو بھول بھال کر بیوی کا دم بھرنے لگا۔ ثروت اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی دیکھتا تو گھر والوں سے باز پرس کرنے پہنچ جاتا۔ نسیمہ بیگم کو لاڈلی بیٹی سے لاکھ پیار سہی مگر بیٹی اب ہو تھی اور بیٹا بیوی کے مقابلے میں ماں بہنوں کی باتوں کو رتی برابر اہمیت دینے پر تیار نہ تھا۔

شروع شروع میں نسیمہ بیگم نے بہو کو بھی سمجھانے کی کوشش کی اور شاید زندگی میں پہلی بار بیٹیوں کو بھی بھانج کی باتوں کو درگزر کرنے کی تلقین کی لیکن ننہی بننے سے اس سبق کا اثر لیا نہ بیٹیوں کو ماں کی بات سمجھ میں آئی۔ ہر روز گھر میں نت نئے ہنگامے ہونے لگے۔

بسمہ کی مچھلی مند جو پہلے ثروت کی بیسٹ فرینڈ تھی اب اسی کو ثروت سے سب سے زیادہ شکایتیں ہونے لگیں۔

”ثروت کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔“
”دن چڑھے سو کر اٹھتی ہے۔“

”روزین ٹھن کر میاں کے ساتھ سیر پانے پر نکل جاتی ہے۔“

”ہاں ہاں تو جاؤں گی اپنے میاں کے ساتھ سیر پانا کرنے تمہاری طرح تو نہیں جو بازار جانے کے بہانے۔“

”اے اے خروار! میرے بارے میں کوئی ایسی سیدھی بات کی تو تمہارے کچے چٹھے بھی کھول دوں گی۔“

عارف نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دھمکی دی۔ ثروت پاؤں پٹ پٹ کر کمرے میں گھس گئی۔ ماضی کی بھولیاں یقیناً ”ایک دوسرے کے رازوں سے

واقف تھیں۔ نسیمہ بیگم حالات کو اس نہج پر جاتا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئیں۔ بیٹی کو بہو کی حیثیت میں لینا لائی تھیں۔ اس کے ماضی کے قصوں پر تو مٹی پڑ چکی تھی مگر یہی کو کیا رہا باقی تھا وہ ثروت کی گزیر بھی زبان سے اگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ خائف بھی ہو چکی تھیں۔ اس لیے جب ایک دن ڈیٹان نے کہا۔

”اماں! اس روز روز کی چیخ چیخ سے تنگ آ گیا ہوں میں۔ ایسا ہے کہہ کر کرائے داروں سے مکان خالی کر والوں میں وہاں شفٹ ہو جاتا ہوں۔“

نسیمہ بیگم کے پاس بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

شادی کے ساڑھے چار ماہ بعد ہی ثروت کے چہرہ سلمان دوبارہ ٹک پر لوڑ ہوا اور وہ گھر والوں پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالتی ہوئی شوہر کا ہاتھ پکڑا پٹی نئی راجد خانی میں جا بی۔ اس شام سارا گھر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”اچھا ہوا اماں! اس ڈائن سے جان چھوٹی۔ اب ڈیٹان کے سر پر چڑھ کر تلچے گی؛ جب اسے اس کی خصلت کا اندازہ ہو گا۔“ بچھلی نند نے ماں کو دلالتے دیا۔

”چاچی! چاچو کے سر پر ڈائن کر س گی۔“ شاہ ظل قلعاری مار کر ہنسا تھا۔ بسمہ نے اسے چھوڑ کر دیکھا مگر بچے کو ماں کی گھوری کی سمجھ ہی کہاں تھی وہ جیسے سنا تھا اسی کے مطابق بولتا تھا۔ نسیمہ بیگم البتہ پوتے کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

”ارے یہ ہے ناں میرے گھر کی رونق۔ ان کم بختوں کے جانے پر ہم کیوں سوگ منائیں۔“ انہوں نے شاہ ظل کی پانچ پٹلا میں تھیں۔

”اور کیا اماں! وہ لوگ اس قابل ہیں ہی نہیں کہ ہم ان کا ذکر بھی کریں۔ ثروت بھابھی تو ہماری اپنی تھیں مگر شادی کے بعد کیسا غیرین گئیں۔ ہمارے ہی بھائی کو ہم سے چھین لیا۔ ہمیں بھابھی بھی تو ہیں۔ اتنی پڑھی لکھی مگر غرور نام کو نہیں کہے کھل مل کر ہمارے درمیان رہتی ہیں۔“ اس کی چھوٹی نند کو اس پر لاڈ آیا۔

”ہاں تو اور کیا۔ ساری بات تربیت کی ہے۔ ہم

کے ماں باپ نے کتنی اچھی تربیت کی ہے اپنی بچی کی۔“ اس کی ساس نے بھی اسے پیار سے دیکھا۔

”قرب بیٹھا فرقان مسکرایا۔“
”اسی لیے تو اماں! میں پڑھی لکھی بیوی چاہتا تھا۔“

اس نے گریڈ خود لیتا چلا۔

”ہاں میرے چاند صبح کتا تھا تو۔“ انہوں نے تسلیم کر لیا۔

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

بسمہ کے لیے یہ سب سنا اتنا حیران کن تھا کہ وہ بوکھلا کر منظر سے ہی ہٹ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے سرال والوں کو بسمہ کی شادی کے اتنے عرصے بعد اس کی جو قدر آئی ہے وہ عارضی ہے یا وہ ہمیشہ ہی اس کے اتنے قدر دان رہیں گے اور رات کو جب وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آئی تو فرقان کو اپنا غصہ پایا۔ اس نے شاہ ظل کو تھپک تھپک کر پہلے ہی سلام کیا تھا۔

”سلام دیا اسے۔ میں تو دودھ لائی تھی اس کے لیے۔“ بسمہ نے دودھ کا گلاس سائیل ٹیبل پر رکھ کر سوئے ہوئے بچے کا گال چوما۔

”آج تو خوش ہو تم؟“ فرقان نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

”کس لیے؟“ اس نے سنجیدگی سے فرقان کو دیکھا۔

”اچھا اب انجان مت ہو۔ آج تو تمہاری جیت کا دن ہے۔ تم نے میرے گھر والوں سے منوا ہی لیا اپنے آپ کو۔ تمہیں دکھ ہوتا تھا نا کہ ہمیشہ تمہیں پڑھی لکھی ہونے کا طعنہ ملتا ہے دیکھو! آج تمہاری تعلیم اور تمہاری تربیت دونوں کو سراہا گیا ہے۔“

”آج یقیناً“ فرقان بھی بہت خوش تھا۔ اس کا انتخاب اس کے گھر والوں کے معیار پر پورا اترتا وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ بسمہ نے نظر بھر کر شوہر کو دیکھا۔ ایک چمکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

”ہاں فرقان! میرے والدین نے مجھے بہترین تعلیم اور تربیت سے نوازا ہے۔ لیکن میں اپنے بچے کی

پرورش ان خطوط پر کیسے کر پاؤں گی۔“ اس کا لہجہ صدیوں کی چٹکن لپے ہوئے تھا۔

”کیا مطلب؟“ فرقان نے ہنسیوں اچکائیں۔

”نہیں، کچھ نہیں۔“ تعلیم جانے بڑول کیوں بنا دیتی ہے۔ اس نے ننہی میں گردن ہلاتے ہوئے دل میں سوچا تھا۔ ذہن کے پردے پر ثروت کی شبیہ لہرائی تھی۔

کس طمطراق سے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اب وہ اپنا الگ گھر بسائے گی۔ اپنی مرضی کی مالک ہوگی۔ اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق پروان چڑھائے گی مگر نہیں۔ ثروت نے یقیناً ”الگ گھر کی خواہش اس بنیاد پر نہیں کی تھی۔

اس قسم کی سوچیں تو صرف اسی کے ذہن میں کلبلائی تھیں۔ بچوں کو صحت مند تعلیمی ماحول فراہم کرنا جو اس گھر میں رہتے ہوئے ناممکن تھا۔ فرقان کہہ رہا تھا کہ آج کا دن اس کے لیے بہت خوشی کا دن ہے۔ پہلی بار اس کے پڑھے لکھے ہونے پر تنقید نہیں کی گئی بلکہ اسے تعریف کے قابل سمجھا گیا پھر جانے کیوں خوش ہونے کے بجائے آج بھی اسے اپنے اندر سناتے اترتے محسوس ہو رہے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ فرقان نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھا تھا۔ وہ ہولے سے ہنس پڑی۔

”میں سوچ رہی ہوں کاش! میں بھی پڑھی لکھی نہ ہوتی ثروت کی طرح جاہل ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“ اس بار فرقان واقعی نہ سمجھ پایا۔

”کچھ نہیں مذاق کر رہی تھی۔“ اگلے ہی پل وہ اپنے مذاق سے خود ہی لطف اٹھاتے ہوئے زور سے ہنس پڑی تھی۔ فرقان اسے ناسمجھی سے تنکراہ گیا۔



جنوری کی شام



سوچا تھیں ہی دے دوں۔ آخر رشتے داروں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔“
نبیل ابھی بھوک کے مارے وال زہر مار کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کٹوری سمیت سحر دیوار کے بار سے نمودار ہوئی۔ گرما گرم بھری ہوئی بھنڈیاں وہ ایسی ہی تھیں۔ اپنے حصے کا سالن اس کے لیے آتی تھی۔
”ہاں مس ہیروئن! تم سارا دن چھپکلی کی طرح دیواروں سے کیوں چسبی رہتی ہو اور تمہارا کوئی احسان نہیں ہے۔ چاچی پہلے ہی میرے حصے کا سالن نکال کر رکھ گئی ہیں۔“ سحر کو دیکھ کر نبیل کی ساری بے زاری

اٹھ کر اندر چلی آگئیں۔
ارم اور صمیم سامنے برآمدے میں چٹائی پر بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھیں۔ حالانکہ وہ خود ابھی میٹرک اور فرسٹ ایئر میں تھیں مگر پھر بھی ہر بچے سے سو پچاس مل ہی جاتا تھا۔ نبیل چار بن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا مگر احساس ذمہ داری نام کو نہیں تھا۔ اس سے چھوٹا عدیل کم عمری سے ہی باپ کے ساتھ گین جانے لگ گیا تھا اور اب وہ کاروں کا اچھا مستری تھا۔
”او مسٹر ہیرو! یہ لوکل پکائی تھیں۔“ بیچ گیس سوچا تھا کی بھوکے فقیر کو دے دوں پھر تائی کی آواز آئی تو

رت بدل رہی تھی مگر اس کے دل میں جانے کب سے ایک ہی موسم ٹھہرا ہوا تھا۔ برف کی طرح سرد اور سخت تھمائی کا موسم۔ چاندنی راتوں کا سحر آسمان پر چمکتے تارے، پھول اور ان پر بیٹھی رنگ برنگی تتلیاں، بارش کی جلتے رنگ بجائی بوئیں اور ٹھنڈی میٹھی ہوا کے سبک جھونکے۔ ان سب چیزوں سے اس کا تعلق تب سے ٹوٹا ہوا تھا جب سے وہ اس پیرک میں بند تھا۔

بلال ابھی ابھی اسے ایک لفافہ دے کر گیا تھا جو ہر سال جنوری کی اولین شاموں میں اسے موصول ہوتا تھا۔ اس لفافے کی آمد جنوری کی او اس شاموں اور ٹھہرتی صبحوں کو اور بھی مشکل بنا دیتی تھی۔ اس نے سرد ہاتھوں اور بچے دل سے لفافہ چاک کیا۔ اگلے سفید کاغذ پر لکھی سیاہ روشنائی کہیں کہیں سے مٹی ہوئی تھی۔

26 جنوری کے نام

جنوری کی کتنی شائیں آئیں اور

اگر گزر گئیں

دل نے کبھی کوئی کمی محسوس نہ کی

لیکن جانے آج کی شام میں

ایسا کیا ہے

دائیں آنکھ کا دایاں کو تباہیگ گیا ہے۔

خنک و تاریک کو ٹھنڈی میں بنے روشن دان سے شام کا ٹھنڈا اجالا دھیرے دھیرے اندھیرے میں ضم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ خنک ہوا کے جھونکے نے ہاتھ میں

دبے کاغذ کے کان میں جانے ایسی کیا سرگوشی کی کہ پھر پھر کر رہ گیا۔ یادوں کے پتھری اندھیری کو ٹھنڈی سے نکل کر دور افق میں محو پرواز ہوئے تو کچھ دھندلا دھندلا سامنظر آنکھوں کے سامنے واضح ہونے لگا۔
لکڑی کا ٹھیلہ سا ٹوٹا ہوا دروازہ اس پر لٹکا ہوا ٹائٹ پھٹا ہوا پردہ۔ جن میں لگا ٹائلی کا درخت درخت کے نیچے رکھا تخت اور دو گھروں کے آگن کو جوڑتی ایک مشترکہ دیوار اور اس دیوار کے پار سے جھانکتی ایک موہنی سی صورت۔

”ارے اماں! آج پھر وال۔ قسم سے اب تو دل کھا کھا کر جسم میں خون کی جگہ مسور اور مونگ کی دل ہی دوڑنے لگی ہے۔“ نبیل نے وال کو دیکھتے ہی براہ بنایا اور پلیٹ پر بے کھ کاوی۔

”پاپ تو تو گورنگ گیا ہے۔ لال نیلے نوٹ بھر میری تھی میں لا کر دیتا ہے جو میں تیرے لیے مسکرم پکاؤں۔ کھانی ہے تو کھاو ورنہ زیادہ باتیں بنانے ضرورت نہیں ہے۔“

صفیہ کو یوں پلیٹ بٹا کر رزق کی بے حرمتی بالکل نہیں بھایا تھا۔

”آج کل حالات اور ہڑتالوں کی وجہ سے کام

مندا چل رہا ہے۔ باپ اور چھوٹا بھائی سارا دن ہاتھ

منہ کالے کرتے ہیں تو یہ وال روٹی چلتی ہے۔

مفت کی کھاتے پائیں آرہی ہیں۔“ صفیہ کا غصہ

نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بیڑی پاتی ہوئی اس کے سامنے

اڑن چھو ہو گئی تھی۔

ساتھ والا کہا اب کے تباہ زاد بھائی کا تھا۔ اماں اور چاچی کے درمیان - روایتی جھٹائی اور دیورانی کا رشتہ نہیں تھا۔ فیض چاچا کی دوی بیٹیاں تھیں۔ سحر اور نجر۔ ابانے بچپن سے ہی سحر کو نیل کے لیے مانگ رکھا تھا۔ تب سے دونوں کے درمیان چٹنی محبت ٹاللی کے درخت کی طرح تناور اور مضبوط ہو چکی تھی۔ سحر رات میں نیل کے خواب دیکھتی اور دن میں اس کا خیال رکھتی۔

نیل نے ایم اے کر لیا تھا اور آج کل صبح و شام نوکری کے لیے جوتیاں پچھا رہا تھا کیونکہ اس کے پاس نہ تو کوئی بھاری بھر کم لفافہ تھا اور نہ کوئی گٹری سی فون کال۔ سحر نے بھی اس کے ساتھ ہی ایم اے کیا تھا مگر اس نے فارغ رہنے کے بجائے گلی کے ایک اسکول میں نوکری کو ترجیح دی۔ ایک تو پاس ہی تھا اور دوسرا اس منگائی کے دور میں اپنا خرچا نکل آتا تھا مگر نیل تو اس تین چار ہزار کی نوکری کو نوکری ہی نہیں مانتا تھا۔ اس کے لیے تو نوکری کا مطلب بنگلہ، گاڑی، شو فر اور بے تحاشا دولت تھا۔

محسن میں لگے واش میسن کے میلے شیشے کے سامنے کھڑا نیل بال بناتے ہوئے بڑے مؤد میں گنگنا رہا تھا کہ اتنے میں سحر اندر داخل ہوئی۔ سرخ اور سیاہ استراج کے سوٹ میں آج وہ بہت ٹھہری ٹھہری لگ رہی تھی۔

”اماں نے دودھ میں جلیبیاں بھگوئی تھیں۔ سوچا تایا جی کے لیے لے جاؤں۔“ پیالی ہاتھ میں تھامے وہ ہنوز منہ پھیرے کھڑی تھی۔

رات ہی ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا لڑکے کا اپنا جنرل اسٹور تھا۔ پڑھا لکھا اور جتنی تھا۔ (نیل کی بے پروائی اور خیالات کی اونچائی کو دیکھتے ہوئے اماں جہیز تھیں اس لیے رشتے لانے والی کو صاف انکار نہیں کیا تھا۔)

”چاچی کہتا ہے ابا دوسروں کو گھر میں نہیں ہوتے اور پھر انہیں تو سوچی کاٹھوہ پند ہے۔ تم یہ کٹوری مجھے دے دو چاچی کو میری طرف سے شکریہ کہہ دینا۔ وہ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ میرا دل کرتا ہے ان کے ہاتھ چوم لوں۔“ وہ اس سے پیالی لیتے ہوئے پھر شروع ہو گیا۔

”نیل! زندگی یونہی بنی مذاق کرتے نہیں گزرتی۔ اسے گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔“ سحر نے بے اختیار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آنکھیں روپے کی وجہ سے سوئی ہوئی تھیں اور چہرے پر دکھ کی واضح تحریر رقم تھی۔

”تم رو رہی ہو۔ خیر تو بے کیا ہوا؟“ وہ پیالی ایک طرف رکھ کر یکدم پریشان ہو کر اس کی طرف پلٹا۔ وہ کتنا ہی لالہ پیالی سہی مگر سحر کے آنسو اس کے دل پر گرتے تھے۔ سحر نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

”سحر! مجھے احساس ہے مگر میں اپنی صلاحیت اور کامیابی کی لگن کو یونہی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ پتا ہے آج کل عادل دینی سے آیا ہوا ہے۔ اس دفعہ اس کے پاس روسی ریاستوں کے ویزے ہیں۔ میں ایک بار باہر جانے میں کامیاب ہو جاؤں، پھر دیکھنا حالات کیسے بدلتے ہیں اب مسکراؤ اور میرے لیے دعا کرنا۔“ اس نے اس کے صبیح رخسار کو چھوا اور اپنی دھن میں مسرور گھر سے باہر نکل گیا۔

”اماں! تم بس ابا کو راضی کرلو۔ ایک بار میرے جانے کی دیر ہے۔ ہمارے حالات بدل جائیں گے۔“ ابا کا بڑا سارا شو روہم پلس گینگ، ارم اور محسن کی اچھے گھرانوں میں شادی بڑا سا گھر۔

”بس کر نیل! بہت اونچے خواب دیکھنے والے جب نیچے گرتے ہیں تو بہت چوٹ لگتی ہے۔“ صنف نے سچ میں ٹوکانا ضروری سمجھا۔

اماں! بس چند سالوں کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عادل بھی تو ایسے ہی گیا تھا۔ آج اس کے

پاس کیا نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے پاس نہ کوئی ہنر تھا نہ تعلیم۔ نیل کب سے اماں کے پاس چار پیالی پر بیٹھا اماں کے کان میں کمر پھس کر رہا تھا۔

”نیل! اسی کالال منہ دیکھ کر اپنے منہ کو تھپڑوں سے لال نہیں کیا کرتے۔“ دوسری چار پیالی پر سے سر اٹھا کر ابانے دلی زبان میں گھر کا جو عدیل کے ساتھ بیٹھے کالے کالے ٹوٹوں کو جو تو ذکر حباب کر رہے تھے مگر وہ بیان شاید ان دونوں کی باتوں کی طرف ہی تھا۔ پھر انہوں نے صنفیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”اس بات کو یہی ختم کر دو اور صاحبزادے سے کہو، کل صدیقی کے پاس چلا جائے۔ ان کے داماد نے اسکول کھولا ہے اسے اپنے کمپیوٹر سیکشن میں رکھ لیں گے۔ ابھی چھ ہزار دیں گے۔ آگے اللہ مالک ہے۔“ ابانے ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک کہا۔

”ابا! میں کو لوہے کی تل کی طرح تمام عمر غربت کے مدار میں چکر نہیں لگا سکتا۔ میں زندگی بنانا چاہتا ہوں گزارنا نہیں۔“ وہ بول اٹھا۔

”نیل! امیرانہ مت کھلو۔ جو گھر بڑے وہ باہر بھی بڑے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر ایمان داری سے جان توڑ محنت کرنی پڑتی ہے جو تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر تو نے نہیں سیکھا کہ ہاتھ پیر کالے ہوتے ہیں۔ مجھے اپنا پیٹ کاٹ کر تعلیم دلائی تو تو کون سا افسر لگ گیا۔“ وہ گرج کر بولے تو دیوار کے اس پار سحر کا دل دال کر رہ گیا۔

”بیٹا! اپنا ملک، اپنے لوگ اپنے ہی ہوتے ہیں پردیس کی زندگی کانٹوں سے بھری چادر ہے۔“ ابانے ریمان سے سمجھانے کی کوشش کی۔ آخر جوان اولاد تھی۔

”کون سا اپنا ملک، کون سے اپنے لوگ ابا! یہاں اب بھوک، بے روزگاری اور ہم دھاکوں کے علاوہ وہ ہی کیا گیا ہے۔ پانی گیس اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں کے لیے تو سارا دن عوام سڑکوں پر دھکے کھاتے ہیں۔ یہاں ہے ہی کیا۔ نہ عزت نہ مزدوری اور نہ جان و

مال کا تحفظ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں باہر ضرور جاؤں گا۔ ایجنٹ کو پیسے کا بندوبست کر دیں ورنہ میں کوئی اور طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہوں جو یقیناً غلط ہی ہوگا۔ پھر شکایت مت کیجئے گا کیونکہ میں اس سیلن زہ گھر میں پیالی پیالی کا حساب کتاب کرتے ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔“ نیل نے ہر طرح کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی بات پوری کی اور زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

دیوار کے اس پار ننھا سادل دھڑکننا بھول گیا۔ آنکھوں سے ڈھیر سارا پیالی بہہ نکلا۔

اماں نے ارم اور محسن کے جینز کے لیے رکھے سونے کے بندے پہنچے۔ ابانے اپنے ایک دوست سے قرض لیا۔ کچھ رقم چاہانے فراہم کی اور یوں ایجنٹ کو پیسے دے دیے گئے۔ چھ ماہ کے اندر اندر تمام کاغذی کارروائی مکمل کر لی گئی اور بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب اگلے دن اس نے جو پورا زونا تھا۔

آج اس سیلن زہ گھر میں اس کی آخری رات تھی۔

محسن میں بڑا مسرور اور مطمئن سا ابا اور تباہ کے درمیان بیٹھا نیل، سحر کی نم آنکھوں کا مرکز تھا۔ ملن کی تمام تر دعاؤں کے باوجود آخر جبر کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

”یار! کل میں چلا جاؤں گا اور میں چاہتا ہوں کہ تمہارا ہنستا مسکراتا چہرہ اپنی آنکھوں میں بسا کر لے کر جاؤں۔“ نیل نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے کہا۔

وہ ہاتھ چھڑا کر دھڑکے اٹھی اور بیک کے اندر سے ایک سوئٹر نکال لائی۔

”نیل! اس کے ایک ایک ٹانگے میں میں نے اپنی بے لوث محبت اور انتقام بن دیا ہے۔ اپنا خیال رکھنا اور یاد رکھنا یہاں کوئی ہے جس نے اپنی تمام عمر تمہارے نام لکھ دی ہے۔ میرے انتظار کو میری ہار مت بننے دینا۔“ وہ آگے بھی کچھ کتنا چاہتی تھی مگر اس

کے گلے میں پھندا سارہ گیا۔

”تم دعا کرنا۔ میں جلد واپس آکر تمہارے تمام جملہ حقوق اپنے نام کروں گا۔“

اک شرمیلی سی مسکن حمر کے چہرے پر نمودار ہوئی اور وہ کھانا لگانے کے بہانے ہار چل دی۔

مسلمان کی پیکنگ کو آخری بار دیکھتے ہوئے ایک خاکی لفافہ ملا جس میں اچھی خاصی رُم تھی۔ وہ سمجھ گیا

اندر کہ یہ حمر نے ہی رکھا ہے۔ اپنی نغزہ میں سے کچھ پس کر کے اس نے ایک سیکنڈ ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے

وہ لفافہ اور سوٹر سنبھال کر اندر رکھ لیا۔ اسے اس کی محبت پر بے طرح پیار آیا۔

نبیل کے لیے یہ صبح بڑی اور چمکیلی تھی مگر اس کے ہونٹوں سے جدائی نہیں ہو رہی تھی۔ حمر بھی صبح سے یہیں موجود تھی۔ صفیہ نے نبیل کے دائیں

بازو پر اہم ضامن باندھا تھا۔ ابا اور عدیل نے اسے ایرپورٹ چھوڑ آنے کو کہا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار

کر دیا کہ ایجنٹ خود ہی اپنی گاڑی میں سب لوگوں کو لے کر جائے گا اور یوں وہ سیکنڈ زون ہر کی وہ پتیار کر گیا۔

دوپٹے کے پلو سے چہرے کو صاف کرتے ہوئے حمر نے سوچا، جانے کیسی نئے سال کی صبح نوپے جو ملن کے بدلے جدائی کا سیب بن گئی تھی اور جانے اس

جدائی کے آگے منزل بھی باندھ گئی۔

☆☆☆

آج اس قفس میں اسے ڈھائی سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا ایک پاکستانی نژاد سار جنٹ

سے اس کی سلام دعا ہوئی تھی اور چار ماہ کی طویل خاموشی کے بعد۔ بلال کے ایڈریس سے ایک خط

ارسال کر دیا تھا جس کا لب و لباب کچھ یوں تھا کہ اسے یہاں قانونی طور پر کچھ مسائل کا سامنا ہے اور فی الحال

وہ یہاں کوئی نوکری وغیرہ نہیں کر سکتا اور اس کے کاغذات بھی اس کے پاس نہیں ہیں۔ واپسی میں کچھ

عرصہ لگ جانے کا مگر وہ حیرت سے ہے۔ بلال کے ایڈریس پر ہی ابا کے ہاتھ کا لکھا خط

موصول ہوا تھا۔ اس خط کے اک اک لفظ میں ایپنوں کی پریشانی، اداسی، دکھ، آنسو اور دعائیں رُم تھیں۔ اسے اس کے لیے الفاظ یاد آنے لگے۔

”اونچے خواب دیکھنے والے جب نیچے گرتے ہیں تو بہت چوٹ لگتی ہے۔“

وقتاً فوقتاً وہ خیریت کی اطلاع گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ حمر کے انتظار اور محبت میں ڈوبے خط موصول ہوتے

تھے مگر اس کے جواب دینے کا خود میں حوصلہ نہیں پاتا تھا۔ اسے لگتا وہ اپنی کم عقلی اور شارٹ کٹ کی لکڑی

میں زندگی کی سب سے اہم بازی ہار گیا ہے اور اب پردیس میں کئی دہائی ہر گزرتے سمجھ اپنوں کی یادیں

اسے چوکے لگاتی تھیں۔ وہ جنوری کے مہینے میں یہاں آیا تھا اور اب اس کی ذات پر انہوں نے دروا ہوئے وہ

جنوریاں گزر چکی تھیں۔ اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں آنکھوں کے سامنے وہ منظر واضح ہوتا چلا گیا۔

جب وہ خوش و خرم گھر کی دہلیز سے نکلا تھا اور پیچھے اپنوں کی محبتیں اور رُم آنکھوں کی اسے کوئی پروا نہیں

تھی۔ سب کے چہرے ایک ایک کر کے سامنے آتے چلے گئے۔ نبیل نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اب

کھلی آنکھوں میں اک اور دردناک منظر در آیا تھا۔

☆☆☆

اس کنٹینر کے ارد گرد آگ کے غلے رقصاں تھے۔ کنٹینر کی دیواریں اور فرش ناقابل حد تک گرم ہو رہے

تھے۔ اندر کثیف دھواں بھرا تھا۔ تمام نوجوان کھائیں کھائیں کر رہے حال ہو رہے تھے کھاتے ہوئے نبیل

کو یاد آیا کہ ایجنٹ نے پہلے انہیں کچھ سفر پذیر جہاز کروایا پھر اک انجان اور پھوٹے سے ملک میں انہیں

اتار کر کہا کہ سفری کاغذات میں تھوڑا مسئلہ ہو گیا ہے اس لیے تھوڑا سفر ایک کنٹینر میں کرنا ہو گا۔ کانڈی

کارروائی مکمل کر کے پھر ڈائریکٹ فلائٹ میں منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ دو تین لوگوں نے اعتراض بھی کیا مگر انجان لوگ انجان ماحول اور پھر

وہ سب اس وقت ایجنٹ کے رحم و کرم پر تھے اس لیے

ناچار کنٹینر میں سوار ہو گئے۔

سب لوگوں کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ خوابوں سے بھری آنکھوں میں دھوس کے باعث پانی

بھرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ نبیل کے ہاتھ سے زندگی کی ڈور چھوٹی اس نے کنٹینر کے باہر لوگوں اور

فائر بریگیڈ کی گاریوں کے سائرن سے اور پھر وہ ہوش و حواس سے بگاڑ ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ ایک اسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا اور بہت ساری فلکیاں اس کے بازوؤں میں پوسٹ

تھیں۔ جسم کا کٹنی حصہ جل چکا تھا مگر سرہانے لگی مشین میں نظر آتی آڑی تر پچی لکیریں اس کے زندہ

ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اس نے نظریں کھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس کے سرہانے کانٹیل جیسے

ٹیلے میں ایک بندہ بیٹھا تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ کنٹینر میں زندہ بچ جانے والوں میں جو چند خوش نصیب ہیں

تم بھی ان میں شامل ہو مگر غیر قانونی طور پر ہمارے ملک کی سرحد عبور کرنے کے جرم میں تم پولیس کی

تخویل میں ہو اور تمہارے پاس سے ایک نقشہ بھی برآمد ہوا ہے جس کے بارے میں ابھی جانچ پڑتال کی

جاری ہے۔ تمہارے علاج کے ختم ہو جانے کے بعد تمہاری سزا کا تعین کیا جائے گا۔

ساری تفصیل سننے کے بعد نبیل کو لگا سب کچھ ایک دم گول گھوم گیا ہو۔ چند لمحے تو اسے یہ سمجھے اور

ماننے میں لگے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہے۔

اب اسے یاد آ رہا تھا ایجنٹ نے جاتے ہوئے اسے ایک لفافہ پکڑ لیا تھا کہ وہاں اس کا بھائی لے لے گا۔

اک لمحے کے لیے اس کے دل میں آیا تھا کہ لفافہ لوٹا دے مگر وہ ایجنٹ کو انکار کر کے اس سے بگاڑا نہیں

چاہتا تھا اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ نقشہ یقیناً اس ملک کی کئی اہم تنصیب کا ہو گا جس میں وہ بذریعہ

کنٹینر غیر قانونی طور پر داخل ہوئے تھے۔ نبیل نے بار بار اپنی بے گناہی کا اعتراف کیا مگر اسے

پانچ سال کی سزا سنائی گئی تھی۔ دوسری طرف

حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور

جنوری 2013 کا شمارہ ”سائلگرہ نمبر“ شائع ہو گیا ہے
جنوری 2013 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ اداکارہ ”حنا دلپزیر“ سے ملاقات،

☆ ”محبت کو آباد کرنا ہے“ ہمام احمد کا مکمل ناول،

☆ ”ایک کہانی میری ذہانی“ صبا احمد کا مکمل ناول،

☆ ”اس چاہت کے دھوکے میں“ رمشا احمد کا مکمل ناول،

☆ ”کاسٹنڈل“ سندس جیل کا مکمل ناول،

☆ ”محبت دھنک کے رنگ“ مصباح نوشین کا مکمل ناول،

☆ اس کے علاوہ عشاء بھٹی، ناز، بی بی کرن اور

حمین اختر کے افسانے،

☆ ”وہ ستارہ صبح امید کا“ فواہ غزل کا

سلسلے وار ناول،

☆ ”تم ہی آخری جزیرہ ہو“ ام مریم کا

سلسلے وار ناول،

☆ اس کے علاوہ

بی بی عتیقہ کی باتیں، انشاء تادمہ، اختر و یو اور شوہر کی دنیا کی

دلچسپ معلومات کے علاوہ تا کہ سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں

جنوری 2013

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی ایک اسٹال سے طلب کریں

ہوئے اماں کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں نیل کو جانتی ہوں وہ ضرور کسی مشکل میں ہے۔ بس اماں! چند برس اور ٹھہر جاؤ، پھر جیسا تم لوگوں میں مان لوں گی۔“

اماں نے اختیار اسے گلے سے لگایا اور خود بھی روتے ہوئے اس کے نیک نصیب کی دعا کرنے لگیں۔

نئے سال کی صبح کے سورج!

جو جاؤ اور۔۔۔

تو ان سے کتنا!

تمام عمر کے دکھ اپنے نام کرنے کا سمجھو تاکر کے

خوشیوں کی کروں سمیت

کوئی محو انتظار ہے!!!

آج جنوری کی اوائل تاریخی تھیں۔ یاسیت، تنہائی اور دکھ میں اب کمی آگئی تھی کیونکہ تھوڑے دنوں میں نیل کو رہائی کا پروانہ ملنے والا تھا اور پھر اسے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ اس نے سحر کے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے والدین اس کی طرف سے واپس ہو کر اس کی شادی کسی اچھی جگہ کر دیں۔ ابانے بھی دو تین بار ذکر کیا تھا مگر اس نے دل کے لاکھ کر لانے کے باوجود چپ سا دل ہی تھی۔ اس جیسا نکما اور ناکارہ شخص بھلا اسے دے بھی کیا سکتا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا مگر مذمت کے ساتھ اور خالی ہاتھ۔ اور آگے بھی جانے کب نصیب یاوری کرنا مگر سحر اور اس کی محبت مستقل مزاج ثابت ہوئے تھے اس کا نصیب اچھا تھا یا پھر اپنوں کی دعائیں کہ وہ زندہ سلامت واپس لوٹ رہا تھا۔

اس نے کانڈو کو مسکراتے ہوئے تہہ لگا کر بقایا خطوط کے ساتھ رکھا اور لفافہ بند کر دیا کیونکہ اب اس کی زندگی میں اداسی، دکھ اور یاسیت سے بھری یہ آخری جنوری تھی۔ ملین کی اک نئی اور روشن صبح اپنی سرزمین پر اس کی منتظر تھی اور اس نے سوچ کیا تھا کہ وہ اسے اپنے زور بازو سے مزید روشن اور تابناک بنائے گا۔

پاکستان میں ابا اور چچا نے بڑا زور لگایا کہ کسی طرح ایجنٹ کا ہانگ جائے۔ حکومتی دفاتر کے چکر کاٹے مگر وہاں غریب کی کون سنتا ہے بالآخر مجبور ہو کر چپ سا دھ کر بیٹھ گئے۔ وہ اسی میں شاکر تھے کہ وہ جہاں ہے صحیح سلامت ہے۔ دوسرے بد نصیب لوگوں کی طرح انہیں جوان بیٹے کی میت کو کندھا نہیں دینا پڑا تھا۔

☆☆☆

”سحر! ان چار سالوں میں کوئی درجن بھر اچھے رشتے تم نے ٹھکرا دیے ہیں۔ جبراً شاء اللہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہے اور تم اک نفل سی ضد کے پیچھے لگی بیٹھی ہو۔ اسے تمہاری یا اپنے گھر والوں کی فکر ہوئی تو یہ قدم ہی نہیں اٹھاتا۔ کتنا منح کیا تھا اسے بھائی صاحب اور بھابھی نے مگر اس پر تو امارت اور آسمانوں کا بھوت سوار تھا۔ آج وہ اپنی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے سب کے لیے دکھ اور آفت کا باعث ہے۔ بھابھی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی اور نیل سے تو پہلی اولاد ہونے کے ناتے فطری طور پر محبت زیادہ تھی، بھائی صاحب اندر ہی اندر کھل رہے ہیں۔ اب جا کر بے چارے عدیل کی انتھک محنت سے قرضے سے جان چھوٹی ہے اور پھر اگر فجر کا یور اتنا اچھا نہ ہو تا تو بغیر ہینر کے ارم کی ڈولی اٹھتی؟“

سحر سر جھکائے اماں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی حالت کسی مجرم کی تھی۔

”اماں! میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔ ابھی تو میں نے لیکچر شپ جوائن کی ہے۔ ابھی مجھے پوری توجہ سے جاب کر لینے دیں۔“ وہ دھیرے سے بولی کہ اپنا، اپنی محبت کا اور نیل کا دفاع کرتے کرتے وہ تھک چکی تھی۔

”اللہ جانے خود تو وہاں مزے کرتا ہو اور ہمیں یہاں ٹانگ رکھا ہے۔ آنے دو تمہارے ابا کو کتنی ہوں دو ٹوک بات۔“ اماں کا غصہ بجا تھا۔ آخر وہ بھی ایک ماں تھیں۔ بیٹی کی اداسی تنہائی اور ڈھلتی عمر سے انہیں خوف آنے لگا تھا۔ اس نے ہتھیلی سے آنسو پونچھتے

ہم سے رسول

داوی کا آنگن (داوی کے خیال میں) اس وقت تک لوگوں کی پر مغز ہدایت باتوں کی وجہ سے امن و سکون اور پاکیزگی کا گوارہ بنا ہوا تھا۔ زرینہ بیگم جھوم جھوم کر باجی اللہ والی کے کارنامے بیان فرما رہی تھیں۔ جتنا وہ جھوم کرتا تھیں، اس سے زیادہ جھوم کر داوی ”سبحان اللہ! واہ واہ! اللہ اکبر“ کی صدا میں بند کرتیں۔

جواوی، شبلی شان کی نئی فلم دیکھ کر شان کے اسٹائل میں ہی گھر میں داخل ہوئے تھے مگر اس نئی صورت حال نے چکر اکر رکھ دیا۔ زرینہ بیگم سر پر دوپٹا اوڑھے اتنی شیرینی لہجے میں سو کر آخر کہہ کیا رہی ہیں۔ اصل میں چونکا دیا زرینہ بیگم کے اس سروپ نے ہی تھا۔ ابھی کل ہی تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے انہوں نے خود زرینہ بیگم کو عقلمند بیگم کے گھر میں ان کے پوتے کی مبارک باد دینے آنے والے کھسروں کے ساتھ ناچتے ٹھمکے لگاتے دیکھا تھا۔ شبلی نے تو برہ کے مشورہ بھی دیا تھا۔

”آئی زرینہ! ان سے اچھا تو آپ ملتی ہیں۔ ہماری مائیں، ان کے ساتھ ہی چلی جائیں۔“ ساری عورتیں متفق تھیں مگر زرینہ نہیں مائیں۔ النان سے

خفا ہوئی تھیں اور آج آنگن میں ایک بالکل ہی دوسرے موڈ کے ساتھ۔ ”کمال ہے بھئی۔“
”یہ کس حرافہ کا ذکر ہو رہا ہے؟“ جواوی کی زبان پہ کھلبلی ہوئی تھی۔
”ادبی اور زرینہ بیگم تھرا کر چیخ اٹھیں۔“ ”آپا بیگم! اب تو آپ کے گھر پہ آفت آئے ہی آئے۔ یہ بے

نار و لٹ

ہدایت لڑکے ضرور کسی شیطان کے چیلے ہیں۔ جہاں شیطان ہو وہاں باجی اللہ والی نہیں آیا کرتیں۔“
”وے جواوی! بولنے سے پہلے سوچ لیا کر۔ کم از کم باجی اللہ والی کے لیے تو یہ لفظ استعمال نہ کرتا۔“ داوی صدمے سے چور تھیں۔

”مقامی نیک، ایسی پاک خاتون ہیں، ایسی ایسی کرامات ان سے منسوب ہیں کہ سن کر بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکلتا ہے۔“

”اچھا آپ ان کا ذکر فرما رہی تھیں۔“ جواوی نے پینٹر بدلا تھا۔

”جج داوی! ان کی کرامات تو ایسی ہیں، بے اختیار سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ پچھلے دنوں پچھلے محلے کی ایک عورت اپنے گوارے، نمازوں کے پالنے دیور کے ساتھ باجی کے آستانے پر دعا کے لیے گئی تھی۔ بے چاری کی شادی کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک گود ہری بھری نہیں ہو رہی تھی۔ ساس، مندوں نے طعنے دے دے کر کلیہ چھٹی کر دیا تھا۔ خاتون دیور کو ساتھ لے کے آستانے پہنچی۔ ادھر حاضری کے لیے آواز پڑی، ادھر موبائل پر ایک پچھڑی سیہیلی کا میسج آگیا۔ خاتون تو میسج پڑھنے میں مصروف ہو گئی دیور نے باجی کے پاس جا کے دکھڑا رو دیا۔ باجی نے فکر نہ کرنے کا پکا وعدہ لیا اور جلدی ہی گود ہری ہونے کی گڈ نیوز بھی سنا دی۔ اب جی کرنا خدا کا یہ ہوا کہ یورے نو مہینے بعد دیور

کی گود ہری تے سارے خاندان کی شکلیں نیلی نیلی ہو گئیں۔“
”تبا! دیکھو، دیکھو! اپنے پوتوں کو، انہوں نے کل بھی بڑی بے عزتی کی ہے میری۔ سن رہی ہو ان کی بکواس نا! ان کا مطلب ہے میں جھوٹ بکواس کر رہی ہوں۔ میں اپنے پاس سے قصے گھر گھر کے سنار ہی



ہاں پہلے شہرے کان کی لوئیں سرخ کیں پھر دھیرے سے بولے۔
 ”میں اپنا سونا کرا آباد کرنا چاہتا ہوں۔“
 داوی نے چونک کر ابراہیم کو دیکھا اور اس لمحے میں گویا ہوئیں جو پہلی ہوا دی کے لیے مخصوص تھا۔
 ”وے بے حیا! بے غیرت! اب اس عمر میں تو کمر آباد کرنے کی سوچ رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے نہ میں نہیں کرواتی ایسی دعا۔ میں تو تجھی تو کاروبار میں ترقی کے لیے دعا کروانا چاہ رہا ہے۔“
 ”نانا! ماموں! ہزار ہزار کا نوٹ پکڑائیں ہم دعا کروانے کا خاطر خواہ انتظام کروادیں گے۔“ دونوں نے تسلی داری اور زبردستی نوٹ وصول کیے۔
 حالانکہ دو ہزار میں دعا کا سن کر نانا ماموں ارادہ ہی بدل رہے تھے۔

”ہاں۔“
 ”تم ہی سادہ خوراک یہ تو ہمیں بہت ہی اپنی اپنی لگی ہیں۔ عمر کیا ہے ان کی؟“ جوادی نے بے صبری سے پوچھا تھا۔
 ”زیر نہ گمرانی نہیں ناپ سکی۔ جھٹ بولی۔“ عمر تو زیادہ نہیں ہے۔“
 ”بس چرے پر خزانہ پن کی وجہ سے بڑی لگتی ہیں۔“ شہل نے بات مکمل کی۔
 ”دیکھیں دیکھیں آپا جان! زہرینہ پھر چلی۔ داوی بھی جلال میں آئیں۔“
 ابھی تھوڑی دیر پہلے تک جو نیکی کی باتیں ہو رہی تھیں، خواب و خیال ہوئیں اب داوی پوری آب و تاب سے پوتوں پر گن برس رہی تھیں۔

”داوی! میں نے آخر ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتیں مجھے کوئی نیک، ہم سفر نصیب ہو جائے؟“
 ”ہم سفر نہیں تیری باجی۔ اللہ والی۔“ داوی تو غش کھائے کر گئیں۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو ایک ہی بات پر اصرار کرتی رہیں۔
 ”توبہ کروے توبہ کر۔“
 جوادی اس وقت فلم دیکھ رہا تھا کہہ دیا۔ ”اس وقت تو ایک اور گناہ میں مصروف ہوں۔ زندگی رہی تو ساری توبہ اٹھی ہی کر لوں گا۔“

چار دن تک گھر میں خوب افرا تفری رہی۔ کوئے کوئے کو پونچھا مانچھا جا رہا تھا۔ جیسے باجی اللہ والی صفائی کی چیکنگ کے لیے ہی آ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ نانا ماموں نے اپنے سالوں سے ان دھلے گرم کپڑے بھی نکال کر ڈرائی کلین کروا لیے تھے۔
 ”آپا میرے لیے دعا ضرور کروائیے گا۔“ اٹھتے بیٹھے وہ داوی سے التجا کر رہے تھے۔
 ”یہ بھی تو تائیں دعا کروائی کیا ہے؟“ شہل نے آخر پوچھ لیا۔

پر خوشی کی لہر دوڑائی پھر بولی۔
 ”بات اصل میں یہ ہے کہ یہ سب کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ باجی اپنے آستانے سے باہر کم ہی تشریف لے جاتی ہیں۔ اصل میں کتنے ہی غریبوں کے لیے روزانہ ننگر کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ لوگ آستانے پر حاضر ہوتے ہیں۔ نذرانے دیتے ہیں۔ تب ہی ننگر چلے بہتا۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔ بھوکے ننگے انجوس کبھی چوس لعتی، ہم بھی نہیں ہیں۔ وہ تشریف تو لائیں نذرانوں سے جھولی بھر دیں گے۔“ شہناز نے عقیدت سے کہہ کر جوادی کو صدمے سے دوچار کیا تھا۔
 ”کل میں نے ہزار روپے مانگے تھے۔ جواب میں اماں نے ہزار صلواتیں سنائی تھیں۔ اس چیزیل کے لیے کتنا بدل ہے اماں کا۔“

”چپ کر جا دوست! میں آنے والے وقت کی چاپ بن رہا ہوں۔ دولت کی جھنکار کو محسوس کر رہا ہوں۔“ شہل کی سرگوشی پر جوادی نے شہل کی طرف دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”تو باجی اللہ والی داوی کے آگن میں تشریف لارہی ہیں۔ چشم روشن دل ماشاء۔“
 زہرینہ نے کہا تھا باجی آج سے ٹھیک پانچویں روز اس گھر میں رونق افروز ہوں گی۔ آس پیوس میں بھی اطلاع کر دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خواتین رخ زیبائی زیارت سے مستفید ہو سکیں۔

پہلے تو داوی کا ارادہ شہل جوادی کو محلے میں دوڑانے کا تھا مگر زہرینہ نے سنا تو صاف انکار کر دیا۔
 ”بھئی! آپا جان! مجھے تمہارے ان چھلاؤں پر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو ان کے بتائے کارناموں کی وجہ سے ادھر محلے میں داخل ہوں، ادھر محلے والے ان پر نوٹ پڑیں۔ میں آپ ہی سارے محلے میں اطلاع کروں گی اور ہاں خیال رکھنا باجی ناشتے میں میٹھی لسی پسند فرماتی ہیں۔ ساتھ میں دسی بھی کارپاٹھا اور دو فرنی انڈے۔ دوپہر میں چوزے کی سبزی گلاب اور تھوڑا سا بھنا گوشت۔ رات کو البتہ پراشوق سے نوش فرمائی

ہوں۔ میں ذلیل بھوتی عورت ہوں؟“
 ”آپ نے اپنے منہ سے اقرار کر لیا ہے اب اللہ یقیناً آپ کو بخش دے گا۔“ مسلسل بولنے میں مصروف انہوں نے سنا ہی نہیں۔
 ”تم دونوں شرم کیا کھول کے پی گئے ہو؟“ داوی نے جلا کر پوچھا۔

”کھول کے نہیں گھوٹ کے۔“ جوادی نے اطلاع دی۔
 ”دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ تم دونوں نری شرمندگی ہو میرے لیے۔“
 ”تو بھلا۔ آپ کا اس میں کیا تصور یہ کرامت تو سراسر باجی اللہ والی کی تھی۔ اب شرمندہ ہوں باجی یا پھر وہ دیور یا اس کے گھر والے۔ شہل نے ڈھارس بندھائی۔

داوی نے ادھر ادھر دیکھا پھر قریب رکھا جگ اٹھالیا۔ ارادے خطرناک تھے۔ دونوں کو ٹھسکا پڑا۔

محفل گرم تھی۔ داوی کے آگن میں شہل جوادی کی والدہاں کے ساتھ سویرا کی بھائی، زیبا اور اس کی والدہ بھی موجود تھیں۔ عربزی شہو بھی فرش پہ پوچھا لگانا بھول کے محفل کی رونق بڑھانے آ موجود ہوئی تھیں۔ زہرینہ بیگم مہمان خصوصی کی طرح اکڑ کر کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اب تک چار کپ چائے کے چڑھا چکی تھیں اور باجی اللہ والی کے کارنامے تھے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ حاضرین کی آنکھیں نمناک تھیں۔ چہرے عقیدت سے ہنستا رہے تھے۔
 جوادی شہل نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا صورت حال نے ٹھنک دیا۔ آگے بڑھنے کے بجائے وہیں دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے۔
 ”زہرینہ! ابوس کسی طرح باجی اللہ والی کو میرے اس غریب خانے پہ حاضر ہونے کے لیے راضی کر لے۔ ساری عمر دعائیں دوں گی۔“
 زہرینہ نے پہلے اشارت میں سر ہلا کر سب کے چہرے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم

مریم عزیز

قیمت 250 روپے

تنگے پاؤں

نگہت سیما

قیمت 250 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

شام کو سویرا دو عدد دئے جوڑے کپڑوں کے پکڑے اٹھلاتی پہنچ گئی۔
 ”آئی شہناز کدھر ہیں؟“ جوادی سامنے تھا مگر وہ اسے نظر انداز کر کے آئی کے نام کی مالا چپ رہی تھی۔
 ”کیا کام پڑ گیا ہے میری اماں سے؟ اور یہ زرق برق کپڑے اٹھائے کدھر گھوم رہی ہو؟“
 ”وہ بابی اللہ والی آنے والی ہیں نا۔“
 ”تو؟“ جوادی نے بھنوں اچکا میں۔
 ”تو ظاہر ہے ان کے سامنے حاضری دینی ہے۔ پتا ہے جوادی! میں نے سوچ لیا ہے ان سے تمہارے اور اپنے لیے دعا ضرور کروانی ہے۔“
 ”کیوں؟“ جوادی نے پھر اسی انداز میں سوال کیا۔
 ”کیوں۔ کیا مطلب ہے تمہارا، کیا مجھے دعا نہیں کرانی چاہیے؟“
 ”بابی اللہ والی سے تو بالکل نہیں کرانی چاہیے۔ پتا ہے پہلے یہ بھی ہمارے ہی گینگ میں شامل تھی۔ ہم نے زیادہ لفٹ نہیں کرانی تو اب اس نے اپنا الگ گروپ بنالیا ہے۔“
 ”تو یہ کرو جوادی توبہ کرو! ایسی بے ادبی پر سویرا آنسو ہمانی شہناز کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
 زہبا کی حالت سویرا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہ اس وقت داوی کے گھر میں تھی۔ زہینہ بیگم نے آج ہی خوش خبری سنائی تھی۔ بابی ایک رات ان کے ہاں قیام پر بھی راضی ہو گئی ہیں۔ سو اب زور و شور سے ان کے لیے کھانے بنائے جا رہے تھے۔ کباب فریز ہونے تھے۔ چھلی کو مسالا لگا کر کھنا تھا۔ زہینہ بتا رہی تھی، اگر گاجر کا حلوہ بھی بنالیا جائے تو دعا بابی کے دل سے نکلے گی۔ اب زہبا کچن میں موجود تھی اور دل سے دعائیں نکالنے والے تمام ٹوکوں پر عمل ہو رہا تھا۔
 شبلی بھی کچن کے دروازے کے باہر کرسی والے

بیٹھا تھا۔ زہبا کا اسے دیکھ دیکھ ڈھیروں خون بڑھ رہا تھا۔ جبکہ شبلی کا خون گاجر کا حلوہ، کباب اور چھلی کھا کر بڑھنا تھا۔
 ”پتا ہے شبلی! میں بابی سے تمہارے لیے دعا کراؤں گی، اللہ تمہیں بھی نیک بنا دے۔ سیدھے راستے پر چلا دے۔“
 ”مٹی خدمت تم میری کردنا تو میں ویسے ہی اچھا ہو جاؤں۔ کسی ایری غیری سے دعائیں کرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔“
 ”شبلی! اتم صراط مستقیم سے بھٹک چکے ہو۔“ زہبا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اطلاع دی تھی۔ جس پر شبلی نے دل پر ہاتھ رکھ کر دہلنے کی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔
 ”بابی جان عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔“ انگلی نشست جب زہینہ بیگم کے ساتھ جمی تو سب سے پہلے یہ انوکھا انکشاف کر کے انہوں نے محفل کو گرمایا۔
 ”ضرور شکل میں عیب ہوگا۔“ جوادی نے جھٹ کہا۔
 ”اماں! اگر ایسا ہے تو میں ان سے شادی پر راضی ہوں، قسم سے ساری عمر تک چسپی یا بے ناک کلن یا بے وائٹول کی ہونے کا طعنہ نہیں دوں گا۔“
 ”تمہارے منہ میں خاک۔ بابی کا حسن تو چاند کو شرماتا ہے۔“ زہینہ نے تپ کر انکشاف کیا۔
 ”سید نور اپنی آنے والی فلم کے لیے نئی ہیروئن کی تلاش میں ہے۔“ شبلی نے زہینہ کو بتایا۔
 ”تم بابی کے عتاب کو دعوت دے رہے ہو۔“ زہینہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔
 ”دفع کرو ان کو۔ ہم نے بھی ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا ہے۔ تم یہ بتاؤ بابی صاحبہ تشریف کب لا رہی ہیں؟ میں نے تو اماں جی کی بیٹھک میں اپنے گھر سے لاکے نواں کور بستر بھی بچھا دیا ہے۔ شہنیل کی نرم ملائم رضائی تے سنبل کی روٹی والا ٹکیہ۔“ شہناز بابی کے دیدار کو بے تاب بتا رہی تھی۔

”بس جی اب تو ایک ہی دن ہے بیچ میں۔ پھر بابی جلوہ افروز ہو جائیں گی اور ان کے آتے ہی آپ کو نذرانے ضرور جمع کرانے ہوں گے۔“
 ”ہاں ہاں، پکوں نہیں، کیوں نہیں۔“ سب ایک زبان ہو کر چلائی تھیں۔
 ”اب تم ساری باری باری مجھے اپنی اپنی حاجتیں بھی لکھو اور۔“
 زہینہ کی اس بات پر دونوں چونکے تھے۔ پہلے ایک دوسرے کو پھر گہری نظر سے زہینہ کو دیکھا تھا، وہ کاپی پٹل پکڑے اس وقت سب کی حاجتیں لکھنے میں مصروف تھیں۔
 ”ویسے آئی زہینہ جی! آپ یہ کس سلسلے میں نوٹ فرما رہی ہیں؟“ شبلی خاموش نہیں رہ سکا۔
 ”بابی اللہ والی ان سب کے ناموں کے ساتھ ابھی سے دعا کا سلسلہ شروع فرمائیں گی نا۔“ حاضرین ایک بار پھر جھوم اٹھے اور وہ درل میڈم زہینہ کی اس بات پر جھوم اٹھے۔
 ”ویسے فی دعا کتنا نذرانہ لیا جاتا ہے؟“
 ”پانچ ہزار۔“ زہینہ کی بات پہ جوادی گرتے گرتے پچلا۔
 ”شبلی یا! مجھے بھائی جان اللہ والا بننے کا خیال کیوں نہیں آیا۔“
 ”یار! ہم دونوں تو زہبا اور سویرا کی زلفوں کے خواجواہ اسیر ہو چکے ہیں، اگر نانا، اماں، بابی اللہ والی کے دل میں اپنی محبت کی شمع روشن کریں تو سوچو ذرا دنوں میں امیر ہو سکتے ہیں۔“
 ”آنے دو بابی صاحبہ کو پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“ جوادی کی بات پر شبلی نے پر سوچ انداز میں کہا تھا۔

آج کل ساری گلی میں بس بی بی چڑھا تھا۔ افضل رات بارہ بجے اچانک آن دھمکا۔ آج شبلی بھی جوادی کے گھر میں اور اس کے کمرے میں ہی تھا۔ افضل پہلے

تو کمرے میں آیا، پھر ان دونوں کو دیکھ کر ناراض صورت بنا کر خاموش بیٹھ گیا۔ دونوں نے توجہ نہیں دی۔ آخر خود ہی بولنا پڑا۔
 ”میں تم دونوں سے سخت ناراض ہوں۔“
 ”اچھا! دونوں نے کہا، پھر باتوں میں لگ گئے۔“
 ”پوچھو گے نہیں کیوں؟“
 ”بتانا مناسب سمجھو تو خود ہی بتا دو۔“
 افضل بتانے ہی تو آیا تھا، جھٹ بولا۔ ”تم لوگوں نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔ سارے محلے کو اطلاع دے دی، نہیں بتایا تو ایک مجھے، ایک میری ماں کو۔“
 ”مگر کیا؟“ دونوں حیران تھے۔
 ”تمہارے گھر میں ایک بزرگ ہستی تشریف لا رہی ہے تم نے بتایا ہی نہیں۔“
 ”بزرگ ہستی ہمارے گھر میں کوئی پہلی دفعہ تشریف نہیں لا رہی۔ دو بزرگ ہستیاں آل ریڈی موجود ہیں۔ ان کی بڑی قدر کرنی ہے تم نے جواب نہی آنے والی کی کرلو گے۔“
 ”بور نہیں کرو یا! تم کہاں سے بزرگ ہستیاں ہو گئے، یہ بتاؤ بابی جی کب تشریف لا رہی ہیں؟“
 ”جب نذرانے کی رقم پوری ہو جائے گی، آجائیں گی۔“
 ”کب پوری ہوگی؟“ اشتیاق سے پوچھا۔
 ”پتا نہیں، ابھی تو پورے دس ہزار کم ہیں۔“ جوادی نے آہ بھری۔
 ”دس ہزار! ماپوسی پھیل۔“
 ”ہاں تو تم دے دو، دعائیں کرانے کو سب سے آگے، نذرانہ دیتے موت پڑتی ہے۔“ شبلی نے خفگی دکھائی۔
 ”مم۔ میرے پاس صرف تین ہزار ہیں۔“
 ”چلو یہی دے دو اور خوش خبری سنو، تمہارا نام دعائیہ لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔“ روپے چھپٹ کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے جوادی نے خوش خبری سنائی۔
 ”کیا میں ان کا دیدار کر سکوں گا؟“ وفور عقیدت

سے کانٹی آواز میں افضل صاحب انگلی چاہ رہے تھے۔

”ہاں! کیوں نہیں۔ ان کا ایک رات کا قیام بھی ہماری طرف ہے۔ تم رات کو ایک ڈیڑھ بجے کھڑکی پھلانگ کے ان کے کمرے میں آجانا اور لحاف چرے سے ہٹا کر نظارہ کر لیتا۔“ شبلی کی بات ابھی افضل کے لیے نہیں بڑی تھی۔

”پر وہ کرتی ہیں نا! جوادی نے سمجھایا۔“

”تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟“ افضل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہارا کہنے کا مطلب ہے، ہمیں بھی پردہ کرنا چاہیے؟“ جوادی نے پوچھا۔

”نہیں تم لوگوں سے بات نہیں کر رہا، بس اسی وقت اسوں کا جب باجی تشریف لے آئیں گی۔“

”ہاں! ہاں جاؤ، یہاں کون مرا جا رہا ہے تمہارے لیے۔“

”یہ نذرانہ تم نے کیوں وصول کیا ہے؟“ جاتے جاتے افضل ٹھٹکا۔

”داوی نے یہ ذمہ داری ہمیں سونپی ہے۔ بے شک پوچھ لو جا کر۔“

اب داوی سے کون جا کر پوچھتا اور خواہ مخواہ میں عزت افزائی کرتا۔ افضل کو نہ چاہتے ہوئے بھی اعتبار کر کے گھر کی راہ لیتی پڑی۔

”تین ہزار یا رہا یہ باجی اللہ والی تو واقعی نیک بخت ہے۔ دیکھ! انہی قدم ہمارے گھر میں پڑے نہیں، نوٹوں کی برسات شروع ہو گئی۔“ جوادی نے نوٹ لہرائے۔

”ہاں! ہاں! میں بھی متاثرین میں شامل ہو رہا ہوں۔“ شبلی نے عقیدت سے نوٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شبلی! مجھے زینہ آئی کے گھر جانا ہے۔“ جوادی نے اچانک کچھ یاد آنے پر اتھلی رازداری سے کہا اور جیب میں رکھا کاغذ پھینک دیا۔

”کیوں...؟“

”تو، آتو سہی راستے میں بتاؤں گا۔“

”کیا خیالی ہے تمکے کباب نہ کھائے جائیں؟“

”وہ بھی کھائیں گے، شبلی تو میرے ساتھ تو آ۔“

جس وقت یہ زینہ بیگم کے ہاں پہنچے وہ سیل فون کان سے لگائے کسی کو باجی کی کرامت بتانے میں مصروف تھیں۔ دونوں نے ادھر ادھر دیکھا، پھر بیٹھ گئے۔

”ہاں اس وقت کہے آتا ہوا؟“ کال سے فارغ ہو کر زینہ نے خاصی رکھائی سے پوچھا۔

”وہ جی! داوی نے بھیجا ہے، اصل میں کچھ اور عورتیں آئی تھیں، مگر رہی نہیں، ہم بھی باجی کی دعا یہ لسٹ میں اپنا نام شامل کرنا چاہتی ہیں۔ داوی نے کہا۔ بھاگ کے جاؤ زینہ کے پاس جو لسٹ رکھی ہے اس میں ان بے چاروں کے بھی نام اور تاکم تمنا میں نوٹ کرا آؤ۔“

”مجھے وقت پہ آئے ہو، میں تو بس گھر سے نکلنے والی تھی۔“

”کہیں جا رہی ہیں آپ؟“

”ہاں! بس ایک ضروری کام ہے۔“ ٹالنے کے انداز میں کہہ کر دروازے لسٹ نکالی۔

”یہ جی! سہانا نام تو رشیدہ بی بی کا ہے۔ بے چاری کے پانچ بیٹے ہیں۔ بیٹی ایک بھی نہیں۔ کہتی ہے بے اب بھی بیٹا ہواتے میں کچھ کھا کے مر جاؤں گی۔“

”رشیدہ بی بی! زینہ نے نام نوٹ کیا اچانک شبلی کو شدید گھبراہٹ آئی۔

”پانی پانی لے کر آئیں۔“ جوادی نے زینہ سے کہا۔ وہ لسٹ میں چھوڑ کر پانی لینے بھاگی۔

یہی تو مناسب موقع تھا جوادی نے جیب سے اپنی بنائی لسٹ نکالی اور زینہ کی لسٹ کی جگہ رکھ کر اس کی بنائی لسٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی جب ایک منٹ کے وقفے سے زینہ پانی کا گلاس لے کر کمرے میں آئی تو شبلی شاش بشاش بیٹھا تھا۔

”جھاجی! ہم اب چلتے ہیں۔ اصل میں ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“

زینہ نے بھی اصرار نہیں کیا، دونوں گھر سے باہر آ گئے۔

”دوڑی آئی باجی اللہ والی۔“ باہر آ کر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگائے۔

☆ ☆ ☆

باجی کے کمرے کی تیار کی قریب قریب نئی نوٹیل دہن کے کمرے کی تیار کی جیسی ہی تھی۔

”ہانا! ماموں! اس کمرے کو دیکھ کر آپ کے دل کو کچھ نہیں ہو رہا؟“ شبلی نے کمرے کے معائنے کے دوران سرگوشی کی تھی۔

”نہیں ہاں، تمکبابی کے حسن کے بارے میں بہت سنا ہے۔ دیدار کو جی چل رہا ہے۔ تم تو جانتے ہو، میں ہمیشہ سے ہی حسن پرست رہا ہوں۔“

”میں کیسے جان سکتا ہوں، میں کوئی آپ کے ساتھ کھیل کے جوان تھوڑی ہوا ہوں۔“ لے کر آپ باجی اللہ والی کے نام کوئی نوٹ لکھنا چاہیں تو لکھ کر مجھے دے دیں، میں پنچاؤں گا۔“ ہانا ماموں نے گھور کر دیکھا۔

”وہ میں تو بھول گیا، یہ لیٹر لکھنے کا زمانہ کہاں ہے۔ میں باجی کا سبیل نمبر حاصل کرنے کی کوشش کروں گا، پھر آپ دن رات انہیں دل بھانے والے میسج کر سکتے ہیں۔“

”کیا تم دونوں نے انہیں میرا جیون ساتھی بنانے کا مقصد ارادہ کر لیا ہے؟“

”ہانا! ماموں! بڑی امیر عورت ہے، ایک دعا کے پانچ ہزار وصول کرتی ہے، دارے نیارے ہو جائیں گے آپ کے۔“ جوادی نے بھی سمجھایا۔

”لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھو، اللہ والے ناراض ہو جائیں تو زندگی برباد کر سکتے ہیں۔“ ہانا ماموں ان کے اندازوں سے بڑھ کر بے وقوف تھے۔

”باجی رات سونے سے پہلے باوا ماموں والا گرم دودھ پیتا ہے۔“ زینہ کی طرف سے نیا اعلان ہوا تھا۔

”زینہ آئی! لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں باجی جی

ہاں سے کے لیے چورن کون سا استعمال کرتی ہیں۔“

”حلوے، کباب، پھلی، بادام، دودھ، الا بلا سبحان اللہ سبحان اللہ۔“

☆ ☆ ☆

محلے کی نیک بی بی دوپہر کو کھانا بنانا مگول کر کے بچوں کو ٹائیوں، نمکوپے، رٹھا کے شبلی کے آنگن میں اٹھائی ہونے لگی تھیں۔ زینہ نے اعلان کیا تھا۔

”باجی صاحبہ کی آمد کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ آپ سب ذرا خاموشی اختیار کریں۔“

مگر خاموشی اختیار کرنا بس کی بات نہیں تھی۔

”زینہ! باجی صاحبہ کہیں آنا بھول تو نہیں گئیں؟“ آخر داوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”گاڑی بھجواؤں گی تو ہی آئیں گی نا! زینہ نے کمال بے نیازی سے مطلع کیا۔

”جھاجی! گاڑی، ہم نے بھجوائی تھی۔“ دے جوادی! جا اپنے باجی کی گاڑی لے کے آ جلدی کر پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی ہے۔“

گاڑی آئی تو زینہ بیگم بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔

”آخر کو رستہ تو میں ہی بتاؤں گی نا۔“

باجی اللہ والی کا آستانہ یہاں سے کافی دور تھا... مگر کہاں تھا یہ ان دونوں سے خفیہ رہا کہ زینہ بیگم نے گاڑی خاصے فاصلے پر رکوا لی تھی۔ گلیاں تنگ و تاریک، گند امند اسلاط تھا۔ کچھ ہی دیر بعد زینہ کی واپسی ہوئی، مگر اب وہ اسکی نہیں تھی، ساتھ میں ایک برقعہ پوش دجودھی تھا۔

”مٹی جی! جوڑی شبلی! ایسا یہ واقعی عورت ہے؟“

”وے منڈیو بے ادب! بے ہدایتو! انکھیں نیچی کر۔“ زینہ نے خفگی دکھائی اور دید کی پیاسی اکھیاں پیاسی ہی رہ گئیں۔

”چلو یہ سلمان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔“ تھک گئی ہوں میں تو۔“ زینہ گاڑی کی سیٹ رٹھ گئی۔

جوادی نے سلمان اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔

”او یہ کبوتر۔ کیا بائی آج بھی صدیوں پرانے ڈاک کے نظام پر قائم ہے۔ ڈھولن یار کوچھٹیاں کبوتر کے ذریعے پہنچائی جاتی ہیں۔“

گاڑی روانہ ہوئی، بائی صاحبہ نے برابر بیٹھی زرینہ کے کان میں کچھ کہا۔

”وہ بائی صاحبہ کو کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ گاڑی بازار کے قریب روک دینا۔“

”شاپنگ!“ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اس بازار میں نہیں اگلے بازار میں روک دوں گا۔“ جوادی نے جواب دیا۔

”نہیں، نہیں، اسی بازار میں۔“

”وہ کیا ہے کہ اس بازار میں کچھ دکان داروں کے مقروض ہیں ہم۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو چھوڑیں گے نہیں۔“ شبلی نے وجہ بتائی۔

”مگر اگلے بازار میں کوئی ادھار سودا دینے پہ تیار نہیں ہو گا یہاں تو اکثر بائی کے عقیدت مند ہیں۔“

”ہوں تو اندازہ درست تھا یہاں سے ادھار شاپنگ ہونا تھی اور یقیناً یہ بل کل پر سوں تک واوی کو ادا کرنا تھا۔“

”آپ کو جو بھی لینا ہے، ہمیں بتا دینا۔ ہم کل سویرے ہی لا دیں گے۔“ جوادی نے گاڑی نہیں روکی۔ زرینہ کافی شور اٹھاتی رہی۔

بائی نے کان میں پھر کچھ کہا۔ زرینہ نے ترجمانی کی۔

”ادھر اس چکن تکے والے ہوٹل پہ روک دو۔ بائی کا دل چکن تکے کو چاہ رہا ہے۔“

”کیا یہ بھی ادھار لیا جائے گا؟“ جوادی نے پوچھا۔

”نہیں، نہیں۔“ نہیں شرم نہیں آئے گی خیم اپنی طرف سے کھلاؤ ناپائی کو۔“ زرینہ نے برا مانا۔

”ہم تو پیسے نہیں لائے۔“

”کیا مطلب! ہزار دو ہزار بھی نہیں ہیں تمہارے پاس؟“

”نہیں۔“ بغیر کسی شرمندگی کے نفی میں سر ہلائے

گئے۔

”اچھا میں تم لوگوں کو ادھار دیتی ہوں۔ گھر جا کے واپس کرونا۔“

دونوں نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی کو اقرار جان کر زرینہ نے دو ہزار شبلی کی جانب بڑھائے۔

چکن تکے واقعی بے حد لذیذ تھا۔ بائی صاحبہ نے تو پلیٹوں پر پلیٹیں پیچوں پر پیچیں صاف کی ہی تھیں۔ یہ دونوں بھی پیچھے نہیں تھے۔

پوری طرح انصاف کرنے کے بعد گاڑی آگے بڑھائی۔ بائی، زرینہ کے کان میں پھر منمنائی۔

”بائی! فرما رہی ہیں، ادھر مائیں ہاتھ پر منے پہلوان کی کھیر بھی بڑی مزے کی ہوتی ہے۔“

”اچھا گوچی! ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔“ شبلی اس اطلاع پر خوش ہو کر چکا۔

”کھیر سے یاد آیا، پچھلے مہینے ہم نے بھی کھیر پکائی تھی۔ دس کلو دودھ، آدھا کلو چاول۔ بڑے سے پیلے میں کھیر ساری رات پکتی رہی تھی۔ امی نے سبز الائچیاں بھی پیس کر ڈالی تھیں۔ میں اور شبلی چاندی کے خالص ورق حکیم جی کی دکان سے خرید کر لائے تھے۔ میوہ جات شبلی کی امی جان نے کاٹے تھے۔

ساری رات کتنی رونق، کیسارت جگا سا رہا تھا مگر جب امی نے میٹھا کھنے کے لیے ایک چمچ کھیر کا بھر کر منہ میں ڈالا تو چیخ اٹھیں۔“

”ہیں کیوں؟“ بائی اور زرینہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

”میٹھے کی جگہ نمک ڈال دیا تھا امی جی نے۔“

اس بات کے دوران کھیر کی دکان پیچھے رہ گئی تھی اور جوادی، شبلی کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

گاڑی محلے میں داخل ہوئی، پھر گھر کی طرف بڑھی جہاں شبو دو روزے سے منہ باہر نکالے یقیناً اہل خانہ کی طرف سے مقرر تھی۔

اسے بائی صاحبہ کی آمد کی اطلاع بروقت دینا تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں شبو بیگم کے لمبے دانت دور ہی سے چمکتے واضح دکھائی دے گئے تھے۔

”آپ کا انتظار بے تلی سے ہو رہا ہے بائی!“

شبلی نے مڑ کر بائی صاحبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو مائیک انداز میں کہا تھا۔

”ساڑے گھر آئی بھر جانی لکھاں خوشیاں مل لیاں!“

جوادی عقیدت سے گنگنا رہا تھا۔ بائی نے تیوری چھاکر آنکھوں میں غصہ بھر کر زرینہ کی طرف دیکھا اور اس موقع پر ایسے گیت کا مقصد جانتا چلا۔

بائی نقاب گرائے زرینہ بیگم کے ساتھ آنگن میں داخل ہوئی۔ جوادی، شبلی بھی عقیدت مندوں کی طرح ہاتھ باندھے ان دونوں سے دو قدم پیچھے چلے آ رہے تھے۔ خواتین پر بائی کو دیکھ کر رقت، جبکہ شبلی کے خیال میں بائی کا ڈول دیکھ کے دہشت طاری تھی۔ اسی لیے ہر سو مکمل خاموشی کا راج تھا۔ ایسے میں جوادی نے غصہ منانہ بلند کیا۔

”بائی ساڑی۔“

خواتین اور شبلی جذباتی ہو کر چلائے۔

”آؤ، ہی آؤ۔“

اور پھر جو شور ہوا تو خاموشی خواب ہوئی۔

”شبلی! چپ کر! ان بد مزیز عورتوں کو۔ بائی یہاں دوٹ لینے نہیں آئیں، دعا میں دینے آئی ہیں۔“ بائی نے زرینہ کے کان میں کچھ کہا تھا جس کے بعد زرینہ نے اعلان کیا۔

”بائی بہت تھک چکی ہیں۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام فرمنا چاہتی ہیں۔“

”تھکی ہوئی ہیں! اوئے شبلی، جوادی! کیا لڈی رستے میں خراب ہو گئی تھی۔ پیدل آ رہے ہو؟“ شہناز کے سوال پر دونوں نے نفی میں سر ہلائے اور بتایا۔ ”بائی کھا کھائے تھک گئی ہیں۔“

”ویسے بائی! اے کوئی گل تے نا ہوئی عمورتیں نمایاں دوسرے اپنے کاکے اور کاکوں کے ابا بھلائے دیوار کو کھینچی ہیں اور آپ آتے ہی تھکن کا سامنا بنا کے کمرے میں بھاگ رہی ہیں۔“ شبلی کے اعتراض پر

بائی کو کچھ دیر کے لیے صحن میں بچھی دریوں کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔

”بائی! یہ لڈو میں تھے۔“ سامنے والے گھر کی بھابھی نرسن نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ بائی اللہ والی نے پلیٹ میں رکھا لڈو اٹھایا اور نقاب کے اندر سے منہ میں ڈال لیا۔ یہ دیکھ کر بھابھی نرسن کامنہ پہلے کھلا پھر مزید کھلا اور اس کے بعد زبان بھی کھل گئی۔

”بیرہ غرق بائی! یہ لڈو تو میں نے اپنی کہتی (تیز مزاج) ساس کے لیے بنایا تھا، دعا کرانی تھی اس پہ کہ اسے کھاتے ہی اس کی زبان بند ہو جائے۔ آپ نے لڈو ہی ہڑپ کر لیا ہے۔“

”یہ وہی لڈو ہے نا بھابھی نرسن! جس میں آپ نے کتنا زہر بھی ملایا ہوا تھا؟“

جوادی کی بات پر بائی نے چچیں مارنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ تب کہیں نرسن نے بتایا۔ ”خوش قسمتی سے میں زہر پانا بھول گئی تھی۔“

”بائی! امیر خیال ہے آرام کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“ زرینہ اس سارے ہنگامے سے آپ بڑی گھبرا گئی تھی۔

”میرے کبوتر۔۔۔ لڈی کی ڈنگی میں کہیں دم ہی نہ گھٹ گیا ہو۔“ بائی کے کچھے پہ ہاتھ پڑا تھا۔

”نہ گھبراؤ۔ میں ابھی لے کے آتا ہوں۔“ شبلی نے تسلی دی۔ جا کے ڈنگی کھولی، کبوتر مزے سے سو رہے تھے۔

”باہر آؤ اوئے! کیا خالہ جی کا گھر سمجھ لیا ہے۔ لعنتیو! اتنے مزے سے سو رہے ہو۔ واہ! واہ! صحت میں یہ بھی بائی سے کم نہیں ہیں۔ گوشت بھی کافی لذیذ ہو گا۔“

”گوشت۔۔۔!“

کسی خیال سے آنکھیں چکیں۔ پہلے کبوتر اٹھا کر کچن میں آیا۔ ادھر ادھر دیکھا مناسب جگہ۔ پھر فریق کھول کر کبوتر اندر ڈال دیے۔

پھر خالی ڈباڈنگی سے نکال کر بائی اللہ والی کے کمرے میں رکھ دیا۔

”یہ تو بڑے مزے سے سو رہے ہیں جی۔“ پیار سے بند ڈبے پر ہاتھ پھیرا۔

”شور نہ ڈالو، نیند کے کپے ہیں۔“ باجی نے دھیرے سے کہا۔

گھر میں خوب چل پل ابھی تک تھی۔ داوی بدر بنی سب کو سمجھا رہی تھیں۔

”باجی جیسی عورتیں کہیں صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔“

”ہن جی! تانا ماموں سے بھی بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، جناتی قد قامت، سبحان اللہ! غالب نے ایسی ہی چندال عورتوں کے لیے فرمایا تھا۔

”تیرے سرو قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں۔“

جواوی نے اپنے انداز میں تعریف کی تھی۔ عورتوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کے واہ واہ کہیں یا اس موقع پر فتنے منہ کہنا مناسب رہے گا۔

”یہ چندال کس کو کہا ہے؟“ داوی کو اعتراض کے لیے ایک نکتہ ہی گیا۔

”یہ باجی کا پیار کا نام ہے۔ اوہ ان کے محلے میں سارے انہیں اسی نام سے بلاتے تھے۔“

بات یقین کرنے والی نہیں تھی، لیکن جواوی کے چہرے پر چھائی سنجیدگی انہیں کچھ کہنے سے بھی روک رہی تھی۔

”باجی نقاب کب اٹھائے گی؟“ زیبا کو دیدار کی ہڈی آرزو تھی۔

”یقیناً“ ساگ رات کو۔“ جواوی نے مسکرا کر حاضرین کو بتایا تھا۔

”یار! یہ نقاب والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔“ رات کے ڈیڑھ بجے بھنے ہوئے مزے دار کوتر کھاتے جواوی اس شخص کو سلکھانے کی ناکام کوشش کے بعد کہہ رہا تھا۔

”سنائیں تم نے؟“

”پرے میں رہنے دو، پردہ نہ اٹھاؤ۔“ جواوی کو شبلی کے گلے پر بیٹھ اعتراض ہوتا تھا۔ آج اعتراض کرنا د نہیں رہا۔

”کیا باجی اللہ والی اصل میں پائی جان شیطان کا پر ہے؟“

”پہلے میرا بھی یہی خیال تھا، مگر اب جب کہ کوتروں کا بیڑ روم ان کے کمرے میں رکھے گیا۔“

نقاب اٹھائے بیٹھی دلوں پر بیت طاری کروانے والی موڈ میں بیٹھی تھی۔ ہے خاتون ہی، مگر گریز ضرور۔“

”ہوں۔ کڑی نظر رکھنی پڑے گی۔ ویسے کوتر ہے بہت لذیذ۔“

”یقیناً“ اس میں تو شک ہی کوئی نہیں۔“

”مگر مجھے باجی پر شدید شک ہے۔ بار! آج رات سونے کے بجائے جاگتے رہنا اور ان کے کمرے پر نظر رکھنا خاصا ضروری ہے۔“

”ان کے کمرے پر نظر رکھنے کے بجائے اگر انہیں لاؤنج میں بلا کر ایک دلچسپ سی فلم دیکھنے پر لگائیں تو کیسا رہے گا؟“ جواوی مسکرایا۔

”مگر ان جاں تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔“ دونوں نے جا کر ان کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی مگر اندر سے زینہ اور باجی کے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ انہیں واپس آنا پڑا۔

”جواوی! شبلی! پھر تم نے بتایا نہیں۔“ تانا ماموں خیالوں میں اک نئی دنیا بسائے بیٹھے تھے، جبکہ یہ بھول بھال چکے تھے۔

”کیا تانا ماموں! کیا پوچھ رہے ہیں آپ؟“

”اوہ بے ہدایت! باجی اللہ والی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

”اسے بھول جائیں تانا ماموں! وہ آپ کے قاتل نہیں ہے۔“

”تو پھر کس کے قاتل ہے؟“

”ہو! ایک تو یقیناً“ وہ ہے مگر شادی کے لیے نیک سے زیادہ خاتون ہونا ضروری ہے اور ان کے ہاتھ پاؤں اتنے فراخ ہیں کہ جن، بھوت بھی دیکھیں تو شرما کر اپنے ہاتھ پشت پر چھپا لیں۔ قد اونٹ سے بھی لمبا ہے۔ آواز سو مردوں پر بھاری ہے اور کھاتی، سو

کوئروں کے برابر ہے۔ میرا تو خیال ہے ان ہی خوبوں نے انہیں باجی اللہ والی بننے پر مجبور کر دیا ہے کیونکہ وہ شوہر والی کبھی نہیں بن سکتی۔“

یہ سب سن کر تانا ماموں خامے یاوس ہوئے۔

”تو پھر وہ یہاں کرنے کیا آئی ہے۔“ جیجی واپس اسے اس کے آستانے پر۔ گھر کا سارا نظام ڈسٹرب ہو رہا ہے۔

”چل جائے گی بے چاری، دو! ایک دن کی توبیت ہے۔“

”جواوی! شبلی! میرے دو ہزار واپس کرو۔“ زینہ انہیں ڈھونڈتی ڈھانڈتی تانا ماموں کے کمرے تک چلی آئی۔

”کون سے دو ہزار؟“ دونوں نے حیران ہو کر زینہ کو دیکھا۔

”ارے وہی جو گاڑی میں تم نے مجھ سے ادھار لیے تھے۔“

”کمال ہے آئی! ہم بھلا آپ سے ادھار کیوں لینے لگے۔“

”پاکتے فراڈیے ہو تم۔ گاڑی میں باجی صاحبہ کے لیے تھے کباب نہیں خریدے تھے۔“

”وہ تو باجی صاحبہ کی فرمائش پر خریدے تھے۔ جائے! پیسے بھی ان ہی سے وصول کریں۔“

بڑے چال باز بنتے ہو۔ میں کہتی ہوں باجی کے غضب کو آواز نہ دو، اگر اس نے بدعادے دی تو کہیں کے نہیں رہو گے۔“

”مجھے تو وہ آپ بد دعا لگائی ہوئی لگتی ہے۔“

”بڑے بے ہدایت ہو، میں بتاتی ہوں باجی صاحبہ کو۔“ زینہ دھمکیاں دینے پر اتر آئی۔

”صرف اتنی سی بات، ابھی تو اور بہت سے انکشاف باقی ہیں۔ ایک ساتھ ہی بتا دینا۔ اب منٹ منٹ بعد کیا شکایت لگائے بھاگیں گی۔“

”تانا! کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”وقت آنے پر سارے مطالب روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیں گے۔ بس تھوڑا انتظار کرو۔“

نوجوان حینہ! ان آخری دو لفظوں نے جواوی اثر کیا۔ اب آئی زینہ کے چہرے پر نرم نرم سا تاثر پھیلنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئیں۔

تانا ماموں نے بے اختیار امنڈنے والی مسکراہٹ روکی اور دونوں کو ڈانٹا۔

”کے ڈراے باز لگتے ہو تم۔“ اور پھر ہنسی پر قابو نہیں پاسکتے۔

یہ دونوں تانا ماموں سے داد وصول کر کے داوی کی کمرے میں چلے آئے، جہاں اس وقت گھر کی ساری خواتین موجود تھیں اور فکر مند تھیں۔ کہیں باجی اللہ والی کی خدمت میں کوئی سرکاری نہ رہ جائے۔

”ویسے اماں جی! ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ایسا باپرکت وجود ہمارے گھر تشریف لایا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا۔ میں اس کے لیے کیا کیا نہ کروا لوں۔“

یہ اظہار شبلی کی امی حضور فرما رہی تھیں۔

”آہو! دیکھو نا! اک نظر ڈال کے ہی پتا چل جاتا ہے۔ یہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔“ شہناز نے جذباتی ہو کر بات آگے بڑھائی تھی۔

”ہاں جی عام عورت نہیں ہے، اس میں بہت سی خصوصیات کھسوں والی بھی پائی جاتی ہیں۔“ جواوی کے لہجے کی عقیدت ماں سے کم نہیں تھی۔

”تانا! کیا مطلب ہے جواوی تیرا؟ انہوں نے اوہر آتے ہی جھمکے لگائے۔ او کچھ ارے، او کچھ ارے، گاہے ڈالیں شروع کر دیتا تھا۔ یا تجھے دیکھ کے آنکھ ماری تھی؟“

شہناز بیگم غصے میں آئیں تو وہ وہ بولیں کہ جوادی سے زیادہ گستاخی آپ کر گئیں۔

”چپ کر جاشہناز! بس کرو۔“ داوی کو دہائی دینا پڑی۔

”گھبرا کر دل لیا جی! یہ بے ہدایت غصہ چڑھا دیتا ہے مجھے۔ وہ کل کھول کے سن لے جوادی! میں اس نیک معصوم عورت کی شان میں اب کوئی گستاخی برداشت نہیں کروں گی۔“

”میں نے کب ان کی شان میں گستاخی کی؟“ جوادی کو سرے سے انکار تھا۔

”داوی! زرنہ آئی سے پوچھیں تو سہی! باجی اللہ والی سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔“ زرنہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”وہ اللہ والی ہے۔ ساری رات عبادت کرتی ہوگی۔ کھوتے کی بجلی نہیں ہے کہ اندھیرا بڑھتے ہی سو گئی ہوگی۔“ شہناز کو زرنہ کی بات بھی گستاخی معلوم ہوتی تھی۔ اسی لیے عقیدت کے چند تازہ پھول برسادیے تھے۔

”نہیں ممبائی! میں سوچ رہی تھی کہیں آنٹی لبرین کے لٹو میں واقعی زہر تو نہیں تھا۔ اگر باجی ادھر ہی فوت ہو گئیں تو پھر کیا ہوگا۔“

”ہائے! ہائے! کئیے! ساری خواتین کو اختلاج ہونے لگا تھا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ اس طرح کے لوگ اتنی جلدی نہیں مرا کرتے۔ آپ کی تسلی کے لیے جا کے ابھی پتا کر لیتے ہیں۔“ دونوں اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

”وے گل تے سنو! کدھر بھاگے جارہے ہو۔“

شہناز کی آواز پر قدموں کو بیک لگ گئے۔

”جے زندہ ہے تے پھر سو۔ بسم اللہ! اس کا رہنا سر آنکھوں میں۔ تے جے مر مرا گئی ہے تو گڈی میں ڈال کے اسی گے محلے میں پھینک آنا۔ ہماری عقیدت اپنی جگہ پر بندھ چھائی تو نہیں چڑھ سکدانا۔“

شہناز کے خیالات پر دونوں نے داودی اور یقین دلایا کہ فوری عمل کیا جائے گا۔

وہ تو باجی کی قسمت اچھی تھی، زندہ تھی اور اپنے محلے میں پھینکے جانے سے بچ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج شام باجی نے سب کی حاجات کے مطابق دعا میں کرنی تھیں اور کچھ کرامات دکھا کر مریدوں کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا۔ وہ صبح ایک بھاری ناشتے کے بعد کمرے میں بند بیٹھی اس لسٹ کو یاد کر رہی تھیں۔

زرنہ نے انہیں دی تھی۔ سلطانام حسینہ بی بی شادی پانچ سال ابھی تک بچہ نہیں ہو۔ دوسرا نام جنت بی بی شادی پسند سے کرنا چاہتی ہے۔ تیسرا نام زینبا علیہ۔ بار بار دہرا رہی تھی کہ اسے شام کو خواتین کو ان کے بتانے سے پہلے ہی ان کی مراد بیان کر کے حیران کرنا تھا۔

”یہ پیری مریدی آسان کام نہیں ہے۔ ہر بار غیروار بن کر لاکھوں عقیدت مندوں سے فراڈ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے بڑی عقل اور ہاتھوں کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شام کو کبوتروں سے بھی کام لیا ہے۔ اس لسٹ کے مطابق حاجات بیان کر کے بھی عقیدت مندوں کی عقیدت کو بڑھانا ہے۔ اٹھ لے والا کرتب بھی دکھانا ہے۔“

وہ تعویذ بھی دیتے ہیں جو بظاہر ایک سادہ کلمہ ہے لیکن موم بتی کی روشنی میں دیکھنے سے اس پر حروف ابھرے نظر آتے ہیں۔

تو آج کا دن بے حد مصروف ہے۔ بہت سے کام باقی ہیں۔ اوہو ایک تو یہ لڑکے پتا نہیں بار بار کیوں دروازے پر آجاتے ہیں۔ اب پھر دستک ہو رہی ہے۔ اٹھنا ہی پڑے گا۔“

دروازہ کھلا۔ سامنے شبلی اتار کے جوس سے لبالب بھر اگلاس پکڑے کھڑا تھا۔

باجی نے کھونٹھٹ کی اوٹ سے لال لال جوس دیکھا منہ میں پانی بھر آیا مگر بولیں تو یہ فرمایا۔

”تم بار بار ہمیں تنگ کرنے کیوں آجاتے ہو؟“ عبادت کا وقت ہے۔“

”الکل بجایا آپ نے۔ میں تو خود بھی آتا نہیں چاہتا، مجھے پتا ہے آپ جیسے اللہ والوں کو بار بار یہ کھانا پینا کمال پسند ہوتا ہے۔“

یہ کہا اور جوس کا گلاس لبوں سے لگالیا۔ مارے صدمے اور غصے کے باجی کی زبان مبارک سے کئی چہلیاں بس برآمد ہوتے ہوئے رہ گئیں۔ پورا گلاس ختم کر کے وہ سکرایا۔

”آپ عبادت کریں، میں جا کر کہہ دوں گا، جوس آپ نے نوش فرمایا ہے سب کو تسلی ہو جائے گی۔“

”داوی! آپ کے لیے گلاٹ کے کباب بنوا رہی ہیں وہ بھی میں کھاؤں گا، آپ اطمینان سے عبادت کریں۔“

باجی نے کچھ کنا چاہا، مگر وہ رکابی نہیں۔ اپنی کہہ کر یہ جاوہ جا۔

”لیجے لیجے سانس لے کر غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر سے یاد کرنے لگی۔“

”حسینہ بی بی، بچہ چلبیسے، جنت بی بی پسند کی شادی۔“

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

”آپ کون آیا ہے۔“

جاگر دروازہ کھولا، سامنے جوادی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ پکڑ رکھا تھا۔ باجی کی نظر جوادی سے پہلے اس پیکٹ پر پڑی تھی۔

”کیوں آئے ہو؟“

”ظاہر ہے، آپ کے عشق میں بے قرار ہو کر تو آنے سے رہا۔“

”کیا مطلب ہے، کیا بکواس کر رہے ہو۔“

”باجی! کم از کم آئی بروز ہی بخوالیں۔ قسم سے یہ اتنی مہینہ کی ایسی بھائی کل آئی بروز دیکھ کر مجھے چڑبیلیں یاد آنے لگی ہیں۔“

”کیوں آئے ہو؟“ برامان کر پوچھا۔

”یہ خواتین نے آپ کے لیے کچھ خوب صورت پکڑے بھجوائے ہیں۔“

”میں ایسی چیزوں کی حاجت تو نہیں مگر۔“

”مگر مگر کوچھوڑیں میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا! یوس خوا خواہ اتنے مہنگے کپڑے نہ خریدو۔ باجی کو بھلا ان کی کہاں ضرورت ہے۔ آخر وہ آئینہ دیکھتی ہیں۔ انہیں پتا ہے ایسی غصہ ماری صورت کے ساتھ سادہ سادہ اڑے اڑے رنگوں والے کپڑے ہی مناسب لگا کرتے ہیں۔ یہ میں لے جاتا ہوں۔ آپ کی طرف سے اپنی گزل فریڈ کو دے دوں گا۔“

”پو بات تو سنو! باجی چلائی مگر بات سننے کی فرصت کے تھی۔“

☆ ☆ ☆

آخر خدا خدا کر کے وہ مبارک گھڑی آگئی تھی جس کے انتظار میں خواتین نے صحن میں رونق لگا رکھی تھی۔ صحن میں کچھی دریاں خواتین سے کھچا کھچ بھری تھیں اور آوازوں سے صرف گھڑی نہیں گلی بھی کونج رہی تھی۔

جوادی، شبلی، تانا، ماموں کو کمرے کی تنہا اس فضا سے نکال کر کھڑکی میں لے آئے تھے۔

”دیکھو تو کیسے کیسے خوف ناک چہرے بنائے ہیں اللہ نے دیکھتے رہے اور شکر ادا کرتے رہے۔ وہ دیکھی ہے جو پورا منہ کھول کر ہنسی ہے استغفار! لگتا ہے دانتوں پر ہلدی کی مالش کرتی ہے، کس قدر پہلے ہو رہے ہیں۔“ جوادی نے توجہ دلائی۔

شبلی کیوں پیچھے رہتا۔ ایک لمبے ناخنوں والی دکھا دی، جس کے ناخن طوطے اور کوئے کے ناخنوں کی طرح خم کھائے ہوئے تھے۔

”کالے کالے ہاتھ، آتش نیل پالش، یا اللہ! ایسا ذوق تے ایسے شوق۔ انہیں اندھے شوہر عطا فرما نا کہ یہ بھی خوش اور وہ بھی خوش رہیں۔“

”یہ ساری پھینکار ماریاں ہی آئی ہوئی ہیں۔“ تانا ماموں شہید مایوسی کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

”نہیں! وہ دیکھیں وہ کونے میں ایک گوری لڑکی بھی بیٹھی ہے۔“

”کون سی کہاں؟“ اشتیاق سے گردن لمبی کر کے

پوچھا گیا۔
 ”وہ جو سر سے سنجی ہے یقیناً یہ باجی اللہ والی سے
 سب پاؤں کے لیے دعا کرانے آئی ہوگی۔“
 ”تم دونوں انتہائی نامعقول لڑکے ہو۔“ اپنی رائے
 سے نوازنا پھر جا کر بیڑ پر رونق افروز ہو گئے۔
 ”کمال ہے تمہارا اس سارے معاملے میں کیا تصور
 ہے؟“

ابھی تانا ناموں تصور پر روشنی ڈالنے والے تھے کہ
 زینہ بیگم باجی کی کاپٹی تشریف لے آئیں۔
 ”تم دونوں یہاں ہو باہر آؤ۔ باجی کے لیے تخت
 بچھاؤ۔ وہ تشریف لانے ہی والی ہیں اور تم نے وہ
 کبوتروں والا لکڑی کا ڈیا کدھر رکھا ہے؟“
 ”وہ اسٹور میں ہے۔ آپ چلیے ہم لارے ہیں۔“
 ”چلو پھر جلدی آجاؤ۔“
 صحن میں تخت بچھایا گیا۔ باجی کالی چادر میں کھڑا
 چھپائے تشریف لائیں۔

”باجی ساڑی!“ جوادی نے لہک کر کہا۔
 ”اوسے ہی آوے۔“
 شبلی کے ساتھ تمام خواتین اک جذب سے
 چلائیں۔
 ”باجی ساڑی شیراے۔“ جوادی نے نعروں بلند کیا۔
 ”دم لگن دیویراے۔“ شبلی کی آواز فوراً عقیدت
 سے بھر رہی تھی۔

”خاموش! چپ چپ!“ زینہ نے گھبراہٹ میں
 اپنے گالوں کو پیٹتے ہوئے انہیں ڈانٹا۔
 ”دعا کر لیں۔“ باجی نے ہاتھ اٹھائے سب نے
 تقلید کی۔ دعا کے بعد باجی نے زینہ سے کچھ کہا۔
 زینہ نے کبوتروں والا باکس ان کے قریب لا کر رکھا۔
 ”اب باجی کچھ پرندوں کو آزاد کریں گی۔“
 باجی نے باکس میں ہاتھ ڈالا پھر نکالا، پھر ڈالا۔ اس
 کے بعد سر بھی ڈال دیا مگر وہ بد نصیب پرندے نہ ملنے
 تھے نہ ملے۔
 گھبرا کر زینہ کو دیکھا۔

”چلو جی سب لائن بناؤ۔ باجی کی کرامت دیکھو! یہ

کس طرح تمہارے کئے بغیر ہی تمہاری حجت
 جائیں گی۔“
 ”نہیں! پہلے پرندوں والا کرب دکھائیں
 جوادی ٹھنک۔

شہناز نے رانت پیش کر گستاخ فرزند کو دیکھا
 اوھر متوجہ نہیں تھا۔
 ”اماں جی! سمجھاؤ ان بے بدلتوں کو کہ
 ادبیاں کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے یہ پیر فقیر
 دماغ کے ہوتے ہیں۔ بے ناراض ہو جائیں تو
 اڑیل کھواتے من سکدا اے اے لوک تیں
 دے۔“

شہناز بیگم کی پریشانی عروج پر تھیں اور واوی
 بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں پوتوں کے منہ پر شہ
 دیں۔
 باجی نے زینہ کے کان میں پھر کچھ کہا۔ زینہ
 اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی۔

”یہ پردہ دار بیویوں کی محفل ہے مردوں کا
 کوئی کام نہیں۔ تم دونوں فوراً نکل جاؤ۔“
 ”چھابجی تخت بچھایا ہم نے۔ کبوتروں کا باکس
 کر لائے ہم اور اب ہماری حاجتیں سے بغیر نہیں
 بے نکال رہی ہیں۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے
 نعرے لگا کے ویسے بھی ہم بہت تھک گئے ہیں۔“
 ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

”اماں جی! سمجھاؤ اپنے پوتوں کو۔ کیوں باجی کے
 عتاب کو دعوت دے رہے ہیں۔“
 ”باجی کی شکل دیکھ کے تو لگتا ہے یہ آپ کسی
 عتاب کا شکار ہیں۔“
 ”باجی افدح کریں بچے ہیں۔ آپ اپنا کرب
 کر دیں۔“ شہناز نے بڑی عقیدت سے کہا تھا مگر

کرتب باجی کو تیرن کر لگا۔
 زینہ نے بتایا۔ ”باجی کہتی ہے۔ میں کوئی دعا
 نہیں ہوں۔ باجی اللہ والی ہوں۔ اب سب خاموش
 ہو جائیں اور باجی کی کرامت دیکھیں۔ ہاں جی یہ
 بی بی کدھر ہے۔ ہمیں مبارک ہو۔ سب سے

باجی تمہاری حاجت تم سے سے بغیر اپنے منہ سے بیان
 کریں گی، پھر تمہارے حق میں دعا کریں گی۔“
 باجی گھونٹ گرائے بیٹھی تھیں۔ حسینہ بی بی
 مارے عقیدت کے آنسوؤں کے ساتھ رونے کا شغل
 فراری تھی۔ گھونٹ سے باجی کی آواز بلند ہوئی۔
 ”حسینہ بی بی! بچہ چاہیے؟“ حسینہ بی بی کو تو کرنت لگا
 ہی کا وہاں تھی باجی خواتین بھی دو وقت اچھل کر
 جب دوبارہ زمین پر گرئیں تو بے اختیار منہ سے ہائے
 بھی نکل گئی۔

زینہ نے کچھ کنا چلایا، مگر باجی اب موڑ میں آچکی
 تھیں۔ گھونٹ کی اوٹ سے دوسرا نام پکارا۔
 ”جنت بی بی!“ زور سے گرنے کی وجہ سے کولے پر
 چوٹ آئی تھی مگر اپنا نام سن کر کلن خرگوش کے کانوں
 کی طرح کھڑے کر کے آگے آئی۔
 ”پسند کی شادی کرنا چاہتی ہو۔“ مجبضہ ٹھٹھ اور
 بڑھی۔

”شہناز! زبانی سلمیٰ اکون ہے یہ فراڈن، بے
 غیرت!“ واوی کا جلال عروج پر تھا۔ اوھر زبیا اور سویرا
 بس بس کدھری ہو رہی تھیں۔
 ”مکراسی سے زبیا کا نام پکارا گیا۔ چھلانگ لگا کر وہ باجی
 کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”شوہر جواری اور شرابی ہے۔ چھٹکارا چاہتی ہو۔“
 زبیا نے زور کا ہاتھ باجی کے پارہ سر مارا۔
 ”تیرا شوہر ہو گا جواری، شرابی فراڈن، دس نمبری!“
 زبیا کے ابتدا کرنے کی دیر تھی۔ کنواری حسینہ نے باجی
 پچہ دینے پر بعد تھی اور ستر سالہ جنت بی بی جسے باجی
 نے پسند کی شادی کی نوید سنائی تھی۔ میدان میں اتر
 آئیں۔

”فراڈی ہے یہ عورت فراڈ ہے۔“ سب بل بڑیں۔
 زینہ نے موقع کی نزاکت دیکھ کر فرار ہونا چاہ رہی تھی
 مگر ان دونوں نے راستہ روک لیا۔
 ”اپنی سبلی کو بھی لے کے جائیں۔ ورنہ یہیں
 قید ہو جائے گا اس کا۔“
 ”اچھا“ پھر تم ہی نکالو اس کو اس بے قابو ہجوم

سے۔“
 ”اس کے پیسے لگتے ہیں۔“
 ”پیسے!“ زینہ ہچکچائی۔
 ”پناہصرہ رکھ کر باجی کا حصہ ہمیں دے دو۔ آخر
 ہم جان بچا رہے ہیں اس کی۔“
 زینہ کے پاس سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ ڈر رہی
 تھی باجی کے کانٹے تو وہی بیان کیا کرتی تھی، کہیں
 اس ہجوم کو یاد ہی نہ آجائے۔ بھٹ باجی کا حصہ برس
 سے نکال کر انہیں دے دیا اور انہوں نے سانپ
 سانپ کا شور ڈال کر ساری عورتوں کو گھر سے بھاگنے پر
 مجبور کر دیا۔

آخر میں بھاگنے والی زینہ اور باجی تھیں۔
 ”بچہ گئی ہے فراڈن!“ شہناز دانت پیش رہی تھی۔
 واوی کو دنیا کی ڈراے بازیوں نے بڑھال کر دیا تھا۔ اس
 لیے زبیا ان کی ٹانگیں اور سویرا سر دی رہی تھی۔
 ”وے تم دونوں کدھر چلے ہو ماں صدے، دونوں
 نے پہلے ہی باجی کے کالے گرتوتوں کو پہچان لیا تھا۔“
 شبلی کی والدہ صاحبہ سخت متاثر تھیں دونوں سے۔
 ”ایک کا ہمارا اگیا ہے ابھی آتے ہیں۔“

دونوں گلی میں آگئے۔ جوادی نے سرت سے اپنی
 دوپٹا جیبیں تھپتھپائیں۔ ایک میں زینہ سے لی گئی
 رقم تھی۔ دوسری جیب میں زینہ کی بتائی وہ لسٹ تھی
 جس پر خواتین کے نام اور ان کی حاجت بڑے بڑے
 حروف میں بڑی محنت سے لکھی گئی تھی۔

اوھر کرنی پڑتی رکشے تک پہنچنے والی زینہ اور باجی
 خالوں کی پیچ سے باہر ہوتے ہی آپس میں لڑنے لگی
 تھیں۔ زینہ کو گالیاں غلط غلط لٹ بٹنے پر بڑ رہی
 تھیں۔ جبکہ برابر میں پوتی زینہ سارا الزام باجی کی
 یادداشت کو دے رہی تھی۔

”اچھا میرے حصے کی رقم تو دے نا!“ باجی نے
 سارے قصے بر مٹی ڈالنے ہوئے نئی فرمائش کی تھی اور
 زینہ بیگم کے پیروں تلے سے زمین میں رکشہ نکال
 دیا تھا۔



تیرے میرے دھیرے



انابہ احسان اپنے کالج کے اسٹاف اور اسٹوڈنٹس کے ہمراہ ودوں کے لیے پائے روڈ اسلام آباد کے ٹرپ پر جاتی ہے۔ اپنی اسٹوڈنٹس کی طرف سے مشکوک ہو جاتی ہے۔ نانمہ اور بشری سب سے آنکھ پچا کر دوسری جانب نکل جاتی ہیں۔ انابہ اپنی پرنسپل کے ہمراہ ان کا پیچھا کرتی ہے۔ وہ دونوں عمارت نامی لڑکے کے پاس پہنچتی ہیں تو عمارت انابہ پر بھی نیت خراب جاتی ہے اور وہ اسے بھی اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور فیروزہ بانی کے حوالے کر دیتا ہے۔ فیروزہ بانی 'انابہ کو مرضی کے حوالے کرنے کے لیے خصوصی محفل کا اہتمام کرتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک جاتے ہیں۔ حسنی مرتضیٰ دراصل پولیس آفیسر ہے۔ وہ بہروپ بدل کر لڑکیوں کو اغوا کرنے والے گروہ کے بارے میں شواہد اکٹھے کرتا ہے۔ اس کا اصل نام بیور منہاج ہے۔ تیور 'انابہ کو وہاں سے نکال کر فیروزہ بانی کے گھر پر چھاپ پڑا دیتا ہے۔ وہ انابہ کی نیازی صاحب کے گھر بھیج دیتا ہے۔ نیازی صاحب کی بیگم انابہ کے منگیتر عمر کی خالہ ہوتی ہیں۔ وہ انابہ کو ایک مغربی حیثیت میں دیکھ کر عمر کے گھر والوں کو اطلاع کر دیتی ہیں۔

تیور کی والدہ شیریں بیگم اپنی بھتیجی ماہین سے تیور کی شادی کرنا چاہتی ہیں مگر تیور راضی نہیں ہے۔ احسان فاروق 'انابہ کو اپنے اجمل نیازی کے گھر آتے ہیں۔ وہ بھی تیور کو دیکھ کر چونک جاتے ہیں۔ جبکہ تیور عمر کے بارے میں جان کر غصہ میں آ جاتا ہے۔ تیور اپنے گھر آکر الماری سے گلابی رنگ کا لفافہ کھول کر پڑھنے لگتا ہے اور اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

منہاج مرتضیٰ اسلام آباد کی ایک جانی بانی کاروباری شخصیت تھے۔ ان کے دو بچے تیور اور نمو تھے۔ جبکہ سن کی بیگم شیریں شہر کے ایک مشہور این صرف اس حد تک تھی کہ وہ کبھی کبھار منہاج صاحب کی غیر موجودگی میں آفس سنہال لیا کرتا تھا۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے منہاج صاحب نے



مکمل ناول

جی او کی صوفی روایات تھیں۔ منہاج صاحب کی خواہش تھی کہ تیور باہر سے ایم بی اے کر کے ان کے ساتھ برنس سنہالے۔ لیکن تیور نے ایم اے، آئی آر کر کے سی ایس ایس کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اسے ہمیشہ سے سول آفیسر کی آن بیان اور شہان نے متاثر کیا تھا۔ برنس سے اس کی دلچسپی بھی اسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ لیکن شیریں بیگم کو بیٹے کا یہ فیصلہ کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔ کروڑوں کا برنس کل کو پونہ خاک میں مل جاتا، یہ انہیں منظور نہ تھا۔ تیور کو سمجھاتے ہوئے انہوں نے اسے اس فیصلے سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن اس کی ضد کے آگے انہیں بھی خاموشی اختیار کرنی پڑی تھی۔ ماسٹرز سے فراغت کے

دیکھا تھا جس سے وہ فکر لگتی تھی اور اپنے بائیں جانب ایک بے حد جیسہ اور دراز قامت اجنبی کو دیکھ کے بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

عین اسی لمحے تیمور کی سنہری آنکھیں بھی اس کی طرف اٹھی تھیں اور لحظے بھر کو سامنے موجود صبح چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں سین محض لمحے بھر کو اگلے ہی پل وہ اس بلا کے جاذب چہرے کو دیکھتے ہوئے بارل لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری! یقیناً آپ کو چوٹ نہیں آئی ہوگی۔“ معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے نیچے دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ کوئی چیز نیچے بھی گری تھی۔ اپنے پیروں کے قریب پڑے ہوئے جھمکے کو دیکھ کے وہ بے اختیار جھک گیا تھا۔

”امید ہے آپ کا ایرنگ بھی ٹوٹا نہیں ہوگا۔“ جھمکا انابیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ اب کے دھیرے سے مسکرایا تو انابیہ کو لگا جیسے اس کی آنکھوں کا سنہرا پن ایک پل کو بڑھ گیا ہو۔ کتنی شفاف آنکھیں تھیں اس کی۔ دل ہی دل میں مقابل کی آنکھوں کو

دھیرے سے سوال کیا۔
”حسن کی فونکلی کی وجہ سے۔“ وہ مختصراً بولیں تو احسان صاحب ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

”میں مومنہ سے بات کروں گا۔ تم لوگ اٹھ کر تیار ہو کر ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔“ بیٹی کی تشفی کا سوچے ہوئے وہ انابیہ کی جانب پلٹے۔ ”اور بیٹا! تم تیار ہونے سے پہلے شکور سے کہو کہ چائے کے ساتھ ایک دو لوازمات بھی تیار کر لے۔ کچھ دیر میں میرا ایک اسٹوڈنٹ آنے والا ہے۔“ ان کی ہدایت پہ انابیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے مک کے ساتھ ساتھ عصمت بیگم کا کپ بھی اٹھا کر رُتے میں رکھ دیا۔

”میں آپ کے لیے بھی گرم چائے لاتا ہوں۔“
”رُتے دو! دل نہیں کر رہا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں تو انابیہ ایک نظر انہیں دیکھنے کے بعد خاموشی سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔

”بیٹا! جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے بیٹا۔“
”ترہی ہوں امی!“ عصمت بیگم کی بیکار پہ انابیہ نے ذرا رنگ نبیل پہ رکھے جھمکے اٹھاتے ہوئے دوڑ کر کھسے پنے تھے۔ بیڑے پر اوڑھنا اٹھا کر کندھے پہ ڈالتے ہوئے وہ سرعت سے کمرے سے نکل کر باہر کی جانب بڑھی تھی۔

ایک ہاتھ سے لاؤنج کا داخلی دروازہ کھولتی وہ دوسرے ہاتھ سے کان میں جھمکا اڑنے کی کوشش کرتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھی تھی جب ”معا“ بائیں جانب موجود اسٹڈی کا دروازہ کھول کے کوئی عجالت میں باہر نکلا تھا اور سیدھا اس سے آکر لیا تھا۔
”آف!“ انابیہ کو لگا تھا جیسے اس کا یا باں کندھا کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ ہاتھ میں پکڑا جھمکا بھی پھوٹ کر بچنے جا کر۔

”آئی ایم سوری۔ سنبلی ویری سوری!“ اپنے ارد گرد کو بٹھوڑا لے کر کھلائے ہوئے بھاری لیکن انجان لب و لہجے پر انابیہ نے بھی جوتکتے ہوئے اس دیوار کی جانب

زائدہ آئی کو گھر میں ہونے والی فونکلی یاد نہیں تھی؟“ وہ عادل کی چھوٹی بہن کا حوالہ دیتے ہوئے جو انابیہ کی کلاس فیلو بھی تھی۔ اس کی بات پہ عصر محض اک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ زائدہ بیگم یہ سب صرف مومنہ کو تنگ کر کے لیے کر رہی تھیں۔ وہ مومنہ جسے چند سال پہلے خود بڑے چاؤ سے بیاہ کر لے گئی تھیں لیکن اب اب انہیں کوئی اچھائی دور دور تک نہیں نظر آتی تھی۔

”کیا کہہ سکتی ہوں بیٹا! سوائے اس کے کہ وہ انہیں نیکی کی ہدایت دے۔ میری مومی نے تو ان خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ وہ دھیانی کے عالم میں سامنے بڑی ٹھنڈی ہوئی چائے پیتے ہوئے بولیں تو ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انابیہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس موضوع پہ بات کرنے سے سوائے ٹینشن کے اور کیا ملنے والا تھا اور اپنی ماں کو مزید افسردہ اور پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

تب ہی احسان صاحب کمرے میں چلے آئے تھے۔ ”تم لوگوں نے ابھی تک تیاری نہیں شروع کی؟“ انہیں یوں ڈھلے ڈھالے انداز میں بیٹھا دیکھ کے پوچھے بنانا نہ سکے تھے۔ آج چونکہ ان لوگوں کو ان کی منہدی لے کے جانی تھی۔ اس لیے احسان صاحب نے اس خاص لیڈیز فنکشن میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

”بس کرنے ہی لگے تھے۔“ عصمت بیگم سے گویا ہوئیں تو احسان فاروق چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”خیر تو ہے، اتنی بھی سمجھی ہی کیوں ہو؟“
”وہ مومنہ کا فون آیا تھا۔ رو رہی تھی کہ اس ساس نے مصطفیٰ کی شادی میں جانے سے منع کر دیا ہے۔“ وہ شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں تو ایک کے لیے احسان صاحب خاموش ہو گئے۔
”کیوں؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے

بعد وہی ایس ایس کی تیاری کے لیے لاہور چلا آیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر متاج سر رضی کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے توسط سے تیمور کی ملاقات شہر کے بہترین اساتذہ سے ہوئی تھی۔ جن میں ایک پروفیسر احسان فاروق بھی تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج میں آکٹائمس کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھے۔

کالج میں ان سے ملنے کے بعد تیمور نے ان سے کچھ عرصے کے لیے گائیڈ لائن دینے کی درخواست کی تھی۔ جسے قبول کرتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے گھر آنے کا وقت دیا تھا اور پل وہ مقررہ دن عشاء کے بعد پروفیسر احسان سے ملنے کے لیے ان کے گھر چلا آیا تھا۔

”امی! پھر آپ کا کیا ہوا؟ وہ جا رہی ہیں یا نہیں؟“
چائے کا کپ عصمت بیگم کے سامنے رکھتے ہوئے انابیہ اپنا مک لیے ان کے مقابل آ بیٹھی تو عصمت جہاں نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کارڈیس ایک طرف رکھ دیا۔

”نہیں! اس کی ساس نے عادل کو سختی سے منع کر دیا ہے اور عادل کو تو تم جانتی ہو۔ اپنی ماں کی بات ٹال دے! ایسا تو بھی ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ آرزو کی سے بولیں تو انابیہ کی پیشانی پہ پل نمودار ہو گئے۔

”لیکن امی! یہ بہت زیادتی ہے۔ مصطفیٰ بھائی ہمارے ماموں کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ان کی شادی میں اگر آئی نہ گئیں تو کتنی غلط بات ہوگی۔“

”گھبرا کیا جا سکتا ہے بیٹا! اس کے سسرال والوں کو تو بات کا ٹیکڑ بنانے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے جبکہ اب تو معاملہ بھی ان کی بیٹی کا ہے۔“ وہ بو جھل لہجے میں بولیں تو انابیہ جھلا اٹھی۔

”فار گاڈ سیک ای! شاہجادی کی عدت ختم ہونے ڈیڑھ دو ہفتے ہو چکے ہیں اور آپ کو بتا ہے وہ سارہ تو پچھلے مہینے ہماری کلاس فیلو زینہ کی شادی میں پہنچی ہوئی تھی۔ تب

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

حنا



نادرہ خاتون

قیمت - - - 550/- روپے

مکناؤں کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

سراہتے ہوئے اس نے جھکا اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

”تھینک یو۔“ وہ چونکہ غیر مردوں سے غیر ضروری اخلاق نبھانے کے قابل نہیں تھی۔ اس لیے سپاٹ لہجے میں کہتی آگے بڑھ گئی تھی۔

لیکن اس کے انداز پر تیوری مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ اس کے نزدیک انابیہ نے خاصا بدتمیز کی کا مظاہرہ کیا تھا اور چونکہ اسے بلاوجہ کے خرے سخت ناپسند تھے اسی لیے اس کا موڈ بڑی طرح سے خراب ہو گیا تھا۔ سنجیدہ نظروں سے دور جاتی انابیہ کو دیکھتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہ انابیہ سے پہلے گیسٹ پار کر گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں جہاں تیور کو پتا چلا تھا کہ وہ احسان صاحب کی دو بیٹیوں میں سے چھوٹی بیٹی ہے وہیں انابیہ کے بھی علم میں آیا تھا کہ وہ بیباک لائیا اسٹوڈنٹ ہے جو سی۔ ایس۔ ایس کی تیاری کی غرض سے اسلام آباد سے لاہور آیا ہوا تھا۔

اپنی ذہانت اور اچھے اخلاق کی وجہ سے وہ محض چند دنوں میں ہی احسان صاحب کے پسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر اب اثران کے گھر میں ہونے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے ہی انابیہ یہ جان پائی تھی کہ اس کا تعلق اسلام آباد کی خاصی جانی مانی گاؤ باری فیملی سے تھا لیکن بقول احسان صاحب کے اس درجہ امارت کے باوجود اس میں غرور اور تکبر نام کو نہیں تھا۔ بلکہ وہ خاصا باادب اور منکسر المزاج واقع ہوا تھا۔

لیکن انابیہ کو ان کی اس بات سے اتفاق نہیں تھا، کیونکہ احسان صاحب کے باقاعدہ تعارف کروانے کے باوجود کئی بار اتنا سامنا ہونے پر وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے آگے بڑھ گیا تھا۔ جو انابیہ کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ خاصا گراں بھی گزرا تھا۔ مگر اب تو عصمت بیگم بھی اس کی تعریف کرنے لگی

تھیں جسے سن کر وہ اس کے دوغلے پن سے دلبر ہو گئی تھی۔ جو بہت سے لڑکوں کی طرح بزرگوں کے سامنے نیکی اور شرافت کا ڈھونگ تو بہت خوبی سے رچاتے تھے مگر درحقیقت ان کا ان دونوں چیزوں پر دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔

عادل آج کافی دنوں بعد آفس جاتے ہوئے بچوں سمیت احسان صاحب کی طرف چھوڑ گیا تھا۔ چونکہ انابیہ کی بھی کلنگ سے چٹھی تھی اس لیے اس میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔

”آئی! اب آپ دو چار دن رہ کے جائیے گا۔“ چھوٹے طبیب کو گود میں بٹھا کر جوس پلاتے ہوئے بولیں مومنہ کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔ ”ہو نہ۔“ اُم دو چار دن کی بات کر رہی ہو۔ کل جس میں نے اپنی ساس سے آج صبح کے لیے اجازت چاہی تو انہوں نے مجھے ہر شے مال کے گھر جانے پر وہ سنا کر کہ الامان۔“

”لیکن آپ تو ایک مہینے بعد آئی ہیں۔“ وہ چہرے سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو مومنہ کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔

”من کے نزدیک یہ بھی روز کا آنا جانا ہے۔ بقول اس کے مہینے ڈیڑھ میں ایک آدھ چکر کائی ہو نا ہے۔“ اس کی بات پر جہاں عصمت جہاں نے تفسیر سے ایک گہری سانس لی تھی وہیں انابیہ کی پیشانی پر بل نمودار ہو گئے تھے۔

”تو انہیں کہنا تھا کہ اپنا یہ فرمان اپنی بیٹیوں کو سنائیں جو صحیح معنوں میں ہر دوسرے دن آتی ہیں۔“

”یہ کہہ کے میں نے سب کے ساتھ ساتھ عادل سے بھی اپنی شامت بلوائی تھی کیا۔“ وہ مغموم مسکرائی تو انابیہ کا دل جل کر رہ گیا۔

”یہ عادل بھائی تان صرف نام کے عادل ہیں۔“ کم از کم اتنا مضبوط ضرور ہونا چاہیے کہ وہ صحیح کو

اور غلط کو غلط کہہ سکے ہر شے تو اس کے صحیح مقام پر رکھنا مردکانی فرض بنتا ہے۔“

لیکن صحیح مقام ہی تو ملے نہیں ہو پاتا۔ جب وہ مال کی سائیز لیتا ہے تو بیوی کو لگتا کہ اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور جب وہ بیوی کو جائزہ قرار دیتا ہے تو مال کو لگتا ہے کہ بیٹا غلط کر رہا ہے۔ ساری ذمہ داری مرد کی ہی نہیں کچھ کر دار عورتوں کا بھی ہوتا ہے بیٹا اور مجھے فخر ہے کہ اگر زاہدہ بہن اپنا کردار صحیح طریقے سے نہیں نبھارہیں تو میری موی اپنی ہمت سے بڑھ کے احسن طریقے سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔“ احسان صاحب لاؤنج میں داخل ہوئے تو مومنہ بے تابی سے اٹھ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

”السلام علیکم یاہاب۔“

”وعلیکم السلام! ایسی ہو جان بابا؟“ انہوں نے اس کا سر جوہاں ان کی محبت پر مومنہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔ بمشکل تمام اپنے حلق میں اتارتے ہوئے وہ ان سے الگ ہو گئی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنا میں؟“

”اللہ کا شکر ہے بیٹا! وہ اپنے اذلی پر عزم لہجے میں کہتے ہوئے انابیہ کی گود میں موجود طبیب کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اے میرا پیارا بیٹا۔“ جھک کر اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے انہوں نے اس کے گالوں پر پیار کیا۔ ”میرا بیٹا میں کہاں ہے بھی؟“ انہوں نے مومنہ کی طرف دیکھتے ہوئے تین سالہ عون کے متعلق پوچھا۔

”آپ کا بیٹا میں منگھور کے ساتھ باہر آؤں کریم لینے گیا ہے۔“ مومنہ مسکراتے ہوئے بولی تو احسان فاروق بھی مسکراتے ہوئے کاؤچ پر بیٹھ گئے۔

”بیبا جاؤ کھانا لگاؤ بیبا! عصمت بیگم نے انابیہ سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلائی کچن کی جانب چل دی۔ جبکہ عصمت بیگم احسان صاحب کے لیے گلاس میں جوس ڈالتے ہوئے بولیں۔

”میں اور موی شام میں غنی بھائی جان کی طرف جانے کا سوچ رہے ہیں ماکہ یہ مبارک بھی دے آئیں

اور مصطفیٰ کی بیوی سے بھی مل لیں۔ آپ چلیں گے ہمارے ساتھ؟“ انہوں نے گلاس شوہر کی جانب برہمایا۔

”چلا تو جاؤں، لیکن تیور کو آنا ہے۔“ وہ گلاس تھامتے ہوئے متعذب سے بولے۔

”تو آپ منع کروں کہ آج نہ آئے۔“ وہ رساں سے بولیں تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا گئے۔

”ٹھیک ہے! میں کھانے کے بعد اسے فون کر دوں گا۔“ گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے وہ مومنہ سے عادل کا حال چال دریافت کرنے لگے۔

شام میں عصر کی نماز کے بعد وہ سب جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس دوران احسان صاحب نے دو تین بار تیور کا نمبر ٹرائی کیا تھا لیکن اس کا نمبر بند پاکہ وہ بالآخر اس سے بات کیے بنا نکل گئے تھے۔ انابیہ کو چونکہ اپنا اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا۔ اس لیے وہ گھر پر رک گئی تھی۔ عون بھی ساری دوپہر شرارتیں کرتے کے بعد ٹھوڑی دیر پہلے سویا تھا اس لیے وہ بھی انابیہ کے پاس ہی تھا۔

عون کے اٹھنے سے اس نے اسے چپس بنا کے ٹی وی کے آگے کارٹون لگا کے بٹھایا تھا اور خود اسٹڈی میں آکے ایک ضروری کتاب ڈھونڈنے لگی تھی۔

اسے یہاں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب دھڑام سے لاؤنج میں کوئی چڑگری اور عون کے زور زور سے رونے کی آواز آئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی کتابیں نیپیل پہ پھینکتے ہوئے وہ بھاتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی جہاں اندر کے منظر نے اسے ہولا کر رکھ دیا تھا۔ زمین پر گرے ہوئے عون کے اوپر کارنر میں رکھا بھاری سیٹے کا اسٹینڈر گرا ہوا تھا۔ اور اس کے سر سے خون کی دھار اس کے چہرے کو بھگوری تھی۔

چیخ ماری وہ حواس باختہ سی اس کی طرف دوڑی تھی۔ لپک کر اسٹینڈر ہٹاتے ہوئے اس نے عون کو گود

میں اٹھا کر وحشت کے عالم میں اس کا زخم ٹٹولا تھا۔ اور جو کسی اس کی نظر پریشانی سے ذرا اوپر بالوں کے درمیان موجود گرے کٹ پہ پڑی، اس کی اپنی جان ہوا ہو گئی تھی۔

ایسے میں گیٹ پر ہونے والی بیل پہ وہ عون کو خود سے لگائے دو لہانے دار باہر کی جانب بھاگی تھی اور بنا کچھ پوچھے ایک جھپٹے سے دروازہ کھول دیا تھا۔

دوسری جانب تیمور جو اپنے دھیان میں کھڑا تھا، روتی بھتی انابیہ کو چھوٹا بچہ گود میں اٹھائے دیکھ کے حیران پریشان رہ گیا تھا۔

”بی۔ بی۔ اے ہسپتال لے چلیں۔ یہ گر گیا ہے۔“ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی تو تیمور نے تیزی سے روتے ہوئے عون کو گود میں لے لیا۔ اس کے سر سے خون بہتا دیکھ کے وہ خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔

”باقی سب کہاں ہیں؟“ اس نے پریشانی سے ایک نظر پیچھے گھم رہا تھا۔

”وہ گئے ہوئے ہیں۔ میں اک۔۔۔“ اس کی آنسوؤں کی شدت سے اس کے لیے بات مکمل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ تیمور نے ایک نظر اس کے متوحش چہرے، ننگے پیروں اور خون لگے کپڑوں کو دیکھا۔ اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔

وہ گاڑی میں تیمور کے برابر آ بیٹھی تھی۔ جس نے عون کو اسے تھامنے کے بعد تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ اس کے بیٹھنے ہی وہ تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

عون کے سر میں پانچ ٹانگے آئے تھے۔ اس دوران انابیہ تو اس کے قریب بھی نہ پہنچی تھی۔ تیمور نے ہی ٹانگے لگوانے تک اسے گود میں اٹھائے رکھا تھا۔

ٹرمینٹ مکمل ہو جانے کے بعد وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ عون کو لیے روتی ہوئی انابیہ کے پاس چلا آیا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

”حوصلے سے کام لیں مسز تیمور! آپ کا بیٹا اب بالکل ٹھیک ہے۔“ اور انابیہ جو عون کو گود میں لے آنسو بہا رہی تھی، ایک پل کو روکنا بھول کر ڈاکٹر کی شکل دیکھنے لگی تھی۔

اس کے تاثرات پہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیمور کے لبوں پہ مسکراہٹ آن گھری تھی جسے چھپانے کو چہرہ کا گیا تھا۔

”آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں جب تک دو ایک لمبے کے آتا ہوں۔“ وہ گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تو وہ جزبہ جزی ہوئی چابی اس کے ہاتھ سے لے کے باہر کی جانب بڑھ گئی۔

گاڑی کا دروازہ یوں اتھلا کہ سہولت سے کھولتے ہوئے شرمندگی کی ایک نئی لہر انابیہ کو اپنے اندر اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس وقت تو پریشانی کے عالم میں اسے کچھ بھائی نہیں دیا تھا، لیکن اب اسے وہ رہ کر ہر بات کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے تو اپنا پرس تک اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی انابیہ نے مارے شرمندگی کے اپنا نچلا بلاں انتوں تلے دبا دیا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ دو اداؤں کا شاہر ویش بورڈ پہ رکھتے ہوئے بولا تو انابیہ نے نگاہیں چراتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔ اپنے برابر بیٹھے تیمور منہاج کی موجودگی کا احساس اسے اب غولی ہو رہا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنی نظریں عون کے

چہرے پہ جمادیں جو اس کی گود میں سو گیا تھا۔ ”چابی لے کے؟“ مزاج دار محترمہ کو یوں جھجکی ملی بنے دیکھ کے نجانے کیوں تیمور کو خاصا مڑا آیا تھا۔ جب ہی اسے غم کرنے کو اس نے اس کی جھکی نظروں کے سامنے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلائی ہوئے شرارت سے کہا تو انابیہ کا چہرہ مارے نفرت کے گلابی رنگ پر سیاہ اور تیمور کے لیے زندگی میں پہلی بار کسی چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔

”آئی ایم سوری!“ اپنی بے دھیانی پہ خود کو کوستے ہوئے اس نے چابی اس کے ہاتھ پہ رکھ دی تو تیمور ایک گہری نظر اس کے چہرے پہ ڈال کر مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ“ آج اگر آپ وقت پہ نہ آتے تو نجانے میں کیا کرتی۔“ انابیہ کی احساس ممنونیت میں ڈوبی آواز تیمور کی سماعتوں سے لگرائی تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”مائی پیکرز لیکن یہ چھوٹا ہے کون؟“ اس نے ایک نظر سونے ہوئے عون پہ ڈالی۔

”یہ میرا بھانجا ہے عون۔“ اپنی امی اور بابا کے ساتھ ماموں کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ پیچھے کالج کا کچھ کام تھا اس لیے میں گھر پہ ہی رک گئی تھی۔ یہ بھی اس وقت سو رہا تھا اس لیے امی اسے میرے پاس چھوڑ گئیں اور پیچھے سے یہ حادثہ ہو گیا۔ اب جب وہ آئیں گی تو میں انہیں کیا کہوں گی؟ بات کرتے کرتے اسے نئی پریشانی نے آن گھیرا تو تیمور اس کے فکر مند چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔ بچوں کو چوٹیں لگ ہی جاتی ہیں۔ آپ نے کوئی جان بوجھ کر تو اسے نہیں گرایا نا۔“ مگر انابیہ کے اعصاب پہ مومنہ سے زیادہ عادل کی فکر سوار ہو چکی تھی۔

وہ ایک گہری سانس لیتی کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے منظر پہ نگاہیں جمائیں۔

تیمور نے ٹھیک کہا تھا۔ مومنہ نے تو اسے حقیقتاً ایک لفظ تک نہیں کہا تھا لیکن رات میں جب عادل امیں لینے کے لیے آیا تو گھر میں اچھا خاصا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مومنہ کو بے نقط سناتے ہوئے اس نے درپردہ سب ہی اپنی بھڑاس نکالی تھی۔

”مئی ٹھیک کرتی ہیں۔ یہاں آکر تو تمہارے رنگ دھنک ہی بدل جاتے ہیں۔ اپنے گھٹیا رشتے داروں سے ملنے کا اتنا ہی شوق چرایا تھا تو اولاد کو بھی ساتھ لے

کے جاتیں۔ اسے یہاں کس کے سر پہ پھینک گئی تھیں؟“ وہ تو بیاں چڑھائے مومنہ کو غصے سے گھورتا ہوا بولا تو اپنے ماں باپ کے سامنے اس درجہ بد لحاظی پہ روتی ہوئی مومنہ کی تسکین نکل گئی۔ اور انابیہ جسے پہلی بار ہسپتال کے اصل رنگ دھنک دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، دکھ کا اتھاہ لگرائی میں ڈوب گئی تھی۔

کیا یہ وہی بڑھا لکھا اور ڈسٹنٹ شخص تھا جسے ان لوگوں نے اس کی آپنی کے لیے پسند کیا تھا؟ وہ تو آج تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ آپنی کے سرال والے درحقیقت ان دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا باعث تھے۔ لیکن آج اسے پتا چلا تھا کہ عادل بذات عزت کی دجیاں اڑاتے ہوئے وہ کہیں سے بھی ایک ویل آف فیل کی کابندہ نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ وہ کسی جلال سے گھرانے کا ایک سطحی سا انسان لگ رہا تھا، جسے اپنی بیوی اور اپنے سرالیوں کی بے عزتی کر کے ان پہ رعب ڈال کے بوئے پن کا احساس ہو رہا تھا۔

”آپ اگر سیر پناؤں سے طبیعت سیر ہو گئی ہو تو گھر چلیں؟“ مومنہ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو خاموش تماشائی کی صورت کھڑی عصمت بیگم آگے بڑھ آئیں۔

”عادل بیٹا! میں تم سے معذرت کرتی ہوں۔ تم لوں ناراض ہو کے مت جاؤ۔ دیکھو میں نے تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا ہے۔“

”بہت شکریہ۔ پیٹ بھر گیا ہے میرا۔“ ان کی محبت کے جواب میں وہ انتہائی بد تیزی سے کتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اور تم کان کھول کر میری بات سن لو۔“ تنبیہی انداز میں انگلی اٹھا تو وہ ایک بار پھر مومنہ کی طرف پٹا تو عصمت بیگم کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ یہ انہوں نے اپنی بیٹی کو کس جنم میں دھکیل دیا تھا۔

”آئندہ اگر تم میرے بچوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اب اپنا سلمان سمیٹو اور دس منٹ کے اندر اندر باہر آ جاؤ۔“ وہ

ان تینوں پہ ایک تلخ نگاہ ڈالتا تیز قدموں سے لاؤنج عبور کر گیا تو سکتی ہوئی مومنہ آنسو بہاتی ماں کے سینے سے لگتے ہوئے بلک بلک کے رو پڑی۔
اسے یوں زار و قطار رو ما دیکھ کے انابہ بھی تڑپ کے بہن سے آگئی۔

”مجھے معاف کر دیں آئی! پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ شرمندگی اور دکھ کا احساس اسے اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا جبکہ لب بھیجے متاسف سے احسان فاروق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آج کن الفاظ میں اپنی پیاری بیٹی کی تشفی کروائیں۔



وہ لان میں کتابیں لے کے پڑھنے کے ارادے سے بیٹھی تھی مگر ذہن کل سے اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھک کر اس نے بالآخر کتابیں بند کر دی تھیں اور کرسی کی پشت سے سر نکائے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

گیٹ سے اندر آتے تیمور کی نظر اپنے بائیں جانب موجود لان میں بیٹھی انابہ پہ پڑی تو وہ عین کاحال احوال پوچھنے کی نیت سے اس کی طرف چلا آیا لیکن اسے آنکھیں موندے دیکھ کے وہ بے اختیار کچھ فاصلے پہ رک گیا تھا۔

گہری سوچ کی پرچھائیاں اس کے شفاف چہرے پہ صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔ بے اختیار تیمور کو پچھلے ایسے بہت سے موقعے یاد آئے تھے جب اس کی اجنبیت اس کی خفگی اس کی پریشانی اور اس کی خفت کے بے شمار رنگ تیمور نے اس کے چہرے پہ بھرتے دیکھے تھے۔ اس کا چہرہ تیمور کو ایک آئینہ لگا تھا جس کے ذریعے دیکھنے والا اس کے اندر کاحال با آسانی پڑھ سکتا تھا اور ایسے بولتے چروں کے بارے میں عموماً ہی کہا جاتا ہے کہ ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد نہیں پایا جاتا، کیونکہ وہ اپنے خیالات کو منافقت کی چادر نہیں پہنا سکتے۔

اس کے چہرے پہ پھیلے سوچوں کے جال سے نگاہیں

پڑاتے ہوئے وہ خاموشی سے واپس بلٹنے کو تھا جسے ایک گہری سانس لیتے ہوئے انابہ نے آنکھیں کھل دی تھیں اور تیمور کو دیکھ کے سرعت سے سیدھا ہو بیٹھی تھی۔

”تیمور صاحب! اس کے پکارنے پہ تیمور نے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

”اسلام علیکم۔“ انابہ نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سلام کیا تو تیمور کامل نجانے کیوں کھل سا گیا۔

”و علیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟“
”میں ٹھیک ہوں۔“

”عون؟ میں اسی کا پوچھنے کے لیے آپ کی طرف آیا تھا، لیکن پھر آپ کو ڈسٹرپ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ لان میں اپنی موجودگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے بولا، ”مبادا وہ غلط سمجھتے ہوئے برا نہ مان جائے۔“
”اللہ کا شکر ہے، رات تک اس کی طبیعت بہت بہتر ہو گئی تھی۔“ عون کے ذکر پہ نہ چاہتے ہوئے بھی انابہ کے لہجے اور چہرے پہ افسردگی در آئی جسے وہ دلدہا نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ پوچھتے ہی نہ رہ سکا۔

”خیر تو ہے؟ آپ مجھے کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔“ اس کے سوال پہ انابہ نے قدرے چوتھے ہوئے اپنے مقابل کھڑے تیمور منہاج کی طرف دیکھا اور بے اختیار اسے لڑتا جھگڑتا، طنزیہ باتیں کرنا عاقل نہ آیا تھا۔

”نہیں! بس یوں ہی ذرا سر میں درد ہو رہا تھا۔“ ان کا پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو تیمور اس کے ٹالنے پہ خاموش ہو گیا۔

”میں نے دراصل آپ کو اس لیے روکا تھا کہ آپ کو آپ کے پیسے لوٹا سکوں۔“ وہ جیسے لہجے میں بولی تیمور اچھ سا گیا۔

”کون سے پیسے؟“

”وہ جو کل آپ نے عون کے۔“

”مس انابہ! مانتا ہوں کہ آپ خاصی خود دار و ناش ہوئی ہیں لیکن کل میں نے جو بھی کیا احسان صاحب

کی فیملی کے لیے کیا۔ کیونکہ میں آپ لوگوں کو کسی طور غیر نہیں سمجھتا۔ ہاں اگر آپ مجھے ہوں تو اور بات ہے۔ اس کی بات کانٹے ہوئے وہ سنجیدہ لہجے میں بولا تو انابہہ سٹپائی گئی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ کہنا۔“
”آپ کا جو بھی مطلب تھا، لیکن میں آپ کو بتا دوں مجھے آپ کی بات سے دکھ پہنچا ہے۔“ اس کی بات کاٹ کر ایک بار پھر سختی سے بولا۔

”آئی ایم سوری۔“

”اس آل رائٹ۔“ نرم لہجے میں کہتا وہ پلٹ کر آگے بڑھ گیا تو انابہہ کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چوڑی پشت پر جم گئیں۔ اچانک تیور نے پلٹ کر انابہہ کی جانب دیکھا۔

”اس اپنایت کے لیے شکریہ!“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گیا انابہہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

اس واقعے کے بعد انابہہ اور تیور کے درمیان حائل تکلف کی دیوار گر گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کے لیے دونوں کی رائے میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔

انابہہ پہ جان گئی تھی کہ تیور صرف دکھاوے کی حد تک اچھا نہیں بلکہ حقیقتاً ”ایک سکھا ہوا انسان ہے جبکہ تیور بھی یہ سمجھ گیا تھا کہ جسے وہ انابہہ کی بدتمیزی سمجھ رہا تھا وہ دراصل اس کا گریہ تھا، کیونکہ ان کے درمیان استوار ہونے والی بے تکلفی کے باوجود وہ تاحال تیور سے ایک فاصلہ رکھ کے بات کرتی تھی۔

اس کا یوں خود کو سنبھال کر مہلتے اور اگتھا سے بات کرنا تیور کو بے حد اچھا لگتا تھا۔ وہ خود بھی بے حد پر اعتماد اور نفیس شخصیت کا مالک تھا اتنی امارت اور وجاہت کے باوجود اس میں غور و یاد بخاطر نام کو نہیں تھی، لیکن وہ ہر کام میں رہ کر کرنا پسند کرتا تھا اور دوسروں کو بھی اپنی حد میں دیکھنا چاہتا تھا، مگر اس کا تعلق جس کلاس

سے تھا وہاں صنف نازک ہر حد پار کرنے پر تلی رہتی تھی، جو اسے ایک آنکھ نہیں بھانپتا تھا۔ ایسے میں انابہہ کی ذات اپنے انفرادی انداز کے ساتھ اسے سب سے الگ لگی تھی۔ اس کے گرد موجود بھیڑ چال سے نیکر مختلف۔

ایک عجیب سی کشش تھی جو تیور کو انابہہ کے لیے محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے دیکھنا اس سے بات کرنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ کیوں؟ ابھی یہ سوال اس نے خود سے نہیں کیا تھا۔

لیکن جب ویک اینڈ پر وہ اسلام آباد گیا اور شیریں بیگم نے اپنی بیٹی ماہین کے حوالے سے اس سے سوال کیا تو وہ ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا۔

”ماہین؟“ اس نے اچھٹے سے ماں کی طرف دیکھا۔
”یک تخت اسے ماہین کے بدلے ہوئے انداز زیاد آنے لگے جو وہ پچھلے کئی ماہ سے نوٹ کر رہا تھا۔

مکمل خاموشی نے ان کے لبوں پہ موجود مسکراہٹ خائب کر دی۔

”میں نے اسے اب کہا؟“ اس نے بے بسی سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ ”لیکن میرے ذہن میں جو تصور لائف پارٹر کا ہے، ماہین اس سے دور دور تک پہنچ نہیں کرتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولا تو شیریں بیگم کی ہنسیوں تن گئیں۔

”اور تمہارے ذہن میں لائف پارٹر کا کیا تصور ہے؟“ انہوں نے استہزائے انداز میں سوال کیا تو جھم سے انابہہ احسان کا سر اٹا کر اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔
”میں نے کچھ پوچھا ہے تیور؟“ اس کی خاموشی نے انہوں نے ناگواری سے کہا تو وہ اس انکشاف سے ملنے والے جھٹکے سے۔ مشکل تمام خود کو سنبھالتے ہوئے جھلا اٹھا۔

”پلیز می! کیا آپ کے لیے یہ کافی نہیں کہ مجھے ماہین اس لحاظ سے پسند نہیں؟“

”نہیں! اور تمہارے لیے بھی یہی ہوتے ہوگا کہ تم اپنی اس تصوراتی دنیا سے باہر نکل کے پریکٹیکل انداز میں سوچنے لگو۔“ وہ سخت لہجے میں اپنی بات کہہ کر

کمرے سے باہر نکل گئیں تو تیور مارے غصے کے لب بھیج کر گر گیا۔

”انابہہ بیٹا! میں نے تیور کو رات کے کھانے پہ روک لیا ہے اس لیے تھوڑا بہت اہتمام کر لیتا۔“ وہ کپیر کے آگے بیٹھی کچھ کام کر رہی تھی۔ جب احسان صاحب نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

عون والے واقعے کے بعد احسان فاروق اور عصمت جہاں دل سے تیور کی اچھائی کے معترف ہو گئے تھے اور اچھی بات یہ تھی کہ اب انابہہ کو بھی اپنے والدین کی اس پسندیدگی سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب ہی احسان صاحب کی اس اچانک فرمائش پہ وہ بنا کچھ کے اثبات میں سر ملاتی پگن میں چلی آئی تھی۔ جہاں عصمت بیگم پہلے سے موجود تھیں۔

ان سے پوچھنے کے بعد کہ اتنی جلدی کرن ڈشز کا اضافہ کیا جائے وہ فوراً ”کام میں لگ گئی تھی۔

”تقریباً“ ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے کھانا ڈانٹنگ نیبل پہ لگا دیا تھا۔

”آئی! اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ جو بھی بنا ہوا تھا کھا لیتا۔“ تیور نے کرسی پھینتے ہوئے نیبل پہ نگاہ دوڑائی۔ جہاں تین چار ڈشز کے ساتھ رائیہ اور سلاد بھی سجا ہوا تھا۔

”ماں! اہتمام کیا ہے بیٹا! بلکہ بیٹا تو کہہ رہی تھی کہ ہمیں تیور کی صحیح طرح سے دعوت کرنی چاہیے۔“ عصمت جہاں نے اپنی دھن میں پگن میں ہونے والی گفتگو کا ولیہ دیا تو انابہہ نے کڑوا لائی۔

بے اختیار اس کی نظریں تیور کی جانب اٹھی تھیں جو مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”کیوں نہیں، لیکن پھر ساری کو کنگ انابہہ کریں گی۔“ اس کے ہاتھ سے ڈش پڑے ہوئے تیور نے خوش دلی سے کہا تو عصمت بیگم مسکرا دیں۔

”بیٹا! آج بھی کو کنگ انابہہ نے ہی کی ہے۔“
”جھا!“ اس نے خوشگوار حیرت کے ساتھ انابہہ کی جانب دیکھا۔ بے اختیار اس کا دھیان ماہین کی جانب گیا تھا، جو کم و بیش انابہہ کی ہی ہم عمر تھی، لیکن اسے ڈشنگ کا ایک کپ چائے کا بھی پانا نہیں آتا تھا۔

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ تیور نے خوب سیر ہو کے کھایا تھا۔ اوپر سے گھر جیسا اپنا بیت بھرنا خول۔ تیور نے بہت دنوں بعد اتنا جھواقت گزارا تھا۔

کھانے کے بعد احسان صاحب کے کوئی ملنے والے آگئے تو وہ انہیں اور تیور کو لیے ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے جبکہ عصمت جہاں عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

انابہہ نے نیبل سمیٹنے کے بعد فائف کلائی بنا کر ڈرائنگ روم میں بھجوا دی اور اپنا کپ اٹھا کر لان میں آگئی۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اپنا کپ تھامے تیور پیچھے کھڑا تھا۔

”ضرور۔“ تیور زیر لب مسکراتا ہوا مقابل رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

”بہت اچھی کو کنگ کر لیتی ہیں آپ لیکن میں کافی بغیر شکر اور دودھ کے پسند کرتا ہوں۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرایا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا یوں کھلی فضا میں چاندنی کے سائے تلے انابہہ کے مقابل بیٹھنا۔ اسے دیکھنا۔ اس سے باتیں کرنا۔

”تھنک یو۔“ آئندہ خیال رکھوں گی۔“ وہ مدھم سی مسکراہٹ لیے نری سے بولی تو تیور کو لگا جیسے ارد گرد بکھری چاندنی مزید چمک اٹھی ہو۔

”کیا مجھے آج اس بل انابہہ کے سامنے اپنے دل کی سچائی بیان کر دینی چاہیے؟“ اس کے روشنی بکھیرتے چہرے سے نظریں جھٹاتے ہوئے تیور نے ہاتھ میں پکڑا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے سوچا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ اسے اچانک خاموش ہوتا دیکھ کے انابہہ نے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ جہاں پھیلا تذبذب صاف نظر آ رہا تھا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کبھی کبھی انسان کا پہلا اندازہ کتنا غلط ثابت ہوتا ہے۔“ دل ہی دل میں جیسے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہوئے اس نے انابیہ کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ انابیہ نے نا سمجھی کے عالم میں اس کی جانب دیکھا تو تیمور دھیرے سے مسکرایا۔
”مطلب یہ کہ پہلی ملاقات میں آپ کی شخصیت کا جو تاثر مجھ پہ پڑا تھا وہ بعد میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ آپ اس انابیہ سے بالکل مختلف ہیں جیسا میں نے آپ کو سمجھا تھا۔“

”اور آپ نے مجھے کیا سمجھا تھا؟“ اس کی بات سن کے انابیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
”مجھ سمجھا تھا کہ آپ جھوٹ؟“ تیمور نے مسکراہٹ دیتے ہوئے کال کا آخری ٹھونٹ لے کے کپ میز پر رکھ دیا۔

”ظاہری بات ہے سچ۔“ انابیہ نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر سچ یہ ہے کہ مجھے آپ کا پہلا امپریشن خاصی روڈ اور خود پسند قسم کی لڑکی کا پڑا تھا اور چونکہ مجھے بلاوجہ کے خرم بالکل پسند نہیں اس لیے میں نے بھی آپ کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“ وہ مزے سے اپنے اولین احساسات سے لے کر اپنی حکمت عملی تک بتاتے ہوئے بولا تو انابیہ کی ہنسی چھوٹ گئی اور تیمور جس نے پہلی بار اسے یوں کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا ایک بل کو مبہوت سا ہو گیا۔

”اچھا! تو آپ اس لیے اتنے اکڑے ہوئے رہتے تھے اور میں سمجھی تھی کہ آپ ہیں ہی ایسے۔“ وہ اپنی ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے شرارت سے بولی تو تیمور نے ملاحظہ ہونے ہوئے پوچھا۔

”کیا؟“

”امرو گینٹ مشرور اور بد تمیز۔“ وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولی تو تیمور کا بھاری ہنسنے لگا اور دو گونچ اٹھا۔
”تو یہ طے ہوا کہ فرنسٹ امپریشن از ”نناٹ“ دا لاسٹ امپریشن۔“ وہ اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھتے

ہوئے بولا تو انابیہ بھی مسکرا دی۔

”ہمارے کیس میں تو یہی ہوا ہے۔“ وہ کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولی تو تیمور ایک پل کو اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن میرے کیس میں صرف یہی نہیں ہوا۔“
”اچھا!“ انابیہ نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔
”آپ کے کیس میں بھلا اور کیا کیا ہوا ہے؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”دیکھیں انابیہ! میں بہت پریکٹیکل اور صاف گو قسم کا بندہ ہوں۔ لفظوں سے کھینا پاتوں میں الجھنا مجھے نہیں آتا۔ شروع سے ہی میری زندگی کے کچھ اصول رہے ہیں۔ جن پہ دولت کی فراوانی اور ہر طرح کی آزادی بھی اثر انداز نہیں ہو سکی۔ صرف اسی لیے کہ مجھے ہر چیز اپنی حد میں پسند ہے۔ میں نہ صرف خود اپنی حد میں رہنا پسند کرتا ہوں بلکہ مجھے وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو پر اعتماد اور باوقار ہوں۔ جن میں اتنا مینس ہو کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر کے اپنے لیے حدود مقرر کر سکیں۔ اور آپ میں ماشاء اللہ یہ خوبی موجود ہے۔“

بے حد کھرمے ہوئے لمحے میں بولا وہ ایک لمحے کے لیے رکا تو انابیہ کی پلکیں بے اختیار جھک گئیں۔
”میں نہیں جانتا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں اور نہ ہی میری طرف سے آپ یہ کسی قسم کا کوئی دباؤ ہے۔ آپ اپنی رائے میں مکمل طور پر آزاد ہیں لیکن میں اپنے دل کی بات آپ تک پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ اگر آپ کو میری ذات قابل اعتبار لگے تو میں خوشی آپ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اور اگر نہیں تو یقین جانیں مجھے آپ سے کوئی لگہ نہیں ہوگا۔ میں محبت سے پہلے آپ کی عزت کرتا ہوں انابیہ۔ اور جن لوگوں کی عزت کی جاتی ہے ان کے لیے کبھی برا نہیں سوچا جاتا۔ اس لیے پلیز! آپ بے فکر ہو کر اس بارے میں سوچیں۔ آئی ہو! آپ نے میری بات کا برا نہیں مانا ہوگا۔“ اس کی لرزئی پلکوں پہ نگاہیں جمائے وہ دھیرے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انابیہ کی حیران آنکھیں بے اختیار دوڑ جاتے تیمور پہنچ کی چوڑی پشت پہ جا ٹھہری۔
چاندنی کے عکس میں اس کا خطبہ آگے بڑھتا وجود بے حد روشن اور منفرد لگ رہا تھا۔ بالکل ویسے جیسے اس کی سوچ تھی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جتنا خوب صورت اس کا ظاہر تھا اتنی ہی خوب صورت اس کی سوچ تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اس سے اپنے دل کا رشتہ ”عزت“ کی بنیاد پر استوار کرنے کا خواہش مند تھا۔

انابیہ ساری رات سوچنے کے بعد بالآخر اس فیصلے پہ پہنچی تھی کہ اسے عزت کی رو میں اپنی اس محبت کو ٹھکرانے کفرانِ نعمت نہیں کرنا چاہیے۔

تیمور کی ساری رات آنکھوں میں کئی تھی وہ انابیہ احسان کے سامنے اپنا دل تو کھول کے رکھ آیا تھا مگر اب وقت تھا کہ کالے نہیں کٹ رہا تھا۔ لیکن انتظار کے یہ لمحے جہاں بڑے جاں کسل تھے وہیں پر کرف بھی تھے۔ اسی امید اور ناامیدی کا دامن تھا وہ اگلی شام وہاں پہنچا۔

تو انابیہ کو کو گھر میں نہ پا کے اس کا مضطرب دل ایک لحظہ ساکت ہو گیا تھا۔

”تو یہ ہے تمہارا فیصلہ انابیہ احسان! لیکن اگر تم اپنا یہ فیصلہ میرے رویہ مجھے سامنے تو شاید مجھے اتنا برا نہ لگتا جتنا کہ تمہارے اس پہلوئی کے بعد محسوس ہوا ہے۔“ لب بچھنے وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

شدید طیش کے عالم میں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرا گئی پار کرنے ہی والا تھا جب شکور کے پکارنے پہ اس نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا تھا۔

”صاحب! یہ انابیہ بی بی نے آپ کے لیے دیا تھا۔“ بھگ کر اس کے پیچھے آتے شکور نے ہاتھ میں پکڑا ایک گلابی لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو

تیمور نے چوٹے ہوئے اس لفافے کی جانب دیکھا اور پھر تیزی سے اسے تمام کیا۔
شکور کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے وہیں کھڑے کھڑے بے تابی سے لفافہ کھول کر اندر موجود پر جانکال کیا۔

”سونج پر دستک دینا۔ آسان نہیں انہا تھ جلائیے۔ آسان نہیں چل کر اپنے پاؤں سے کھینا گرم شعا عورت سے۔ آسان نہیں جیون کے اک ایسے دور ہے پر کم صم سی کھڑی ہوں میں

اوسر مڑوں یا اوسر کو جاؤں اس الجھن میں پڑی ہوں میں

نئی ڈگر کو مڑ جانا۔ آسان نہیں ٹوٹ کے پھر سے جڑ جانا۔ آسان نہیں!

میرے لیے یہ فیصلہ حقیقتاً ”عزت“ ہے اس لیے بچانے کیوں دل آپ پہ اعتبار کرنے کو کہتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ آپ کبھی میرے اعتبار کو بے ایمان نہیں ہونے دیں گے۔“

الفاظ تھے یا کوئی خزانہ۔ تیمور کو لگا تھا کہ جیسے سارے جہاں کی خوشیاں کسی نے ایک بل میں اس کے دامن میں ڈال دی ہوں۔ چند لمحے پہنچ کر اذیت اور جہنم آن واحد میں دھواں بن کے ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

تیمور کے ہاتھ میں پکڑی تحریر پہ چند آنسو بے اختیاری کے عالم میں آگے تو وہ جیسے ماضی سے ہاتھ چھڑا حال میں لوٹ آیا۔

”وہ رو رہا تھا؟“ کانفیزہ گرنے والے قطروں کو چونک کر دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی آنکھوں کو چھوا تو پلکوں کی نمی اس کی انگلیوں پہ آن ٹھہری۔ جنہیں دیکھتے ہوئے اس کے لب بے اختیار بچھنے لگے۔

خالی نظروں سے اپنی انگلیوں کو تکتے ہوئے اس کی نگاہیں دوسرے ہاتھ میں بھی خربڑ پڑیں تو دل میں جیسے اک ہوک سی اٹھنے لگی۔

بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے دلی سے سانس پھیل پھیل دیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کھڑکی میں آکھڑا ہوا جہاں دور تک سوائے تاریکی اور سائے کے اور کچھ نہ تھا۔

یہ جو تیرے میرے درمیان ہے عجیب سا اک رابطہ

اسے توڑوں

اسے چھوڑوں

اسے کون سا میں موڑوں؟

یہ سلسلہ عجیب ہے

رگ و جال کے یہ فریب ہے

لفظوں میں یہ نہ ڈھل سکے

رشتے میں یہ نہ بدل سکے

اسے کون سا میں نام دوں

اسے کون سا انجام دوں؟؟

اس نے تھک کر اپنا سر کھڑکی سے ٹکاتے ہوئے جلتی ہوئی آنکھیں موند لی تھیں۔

تجھ سے بچھڑ کے بس اتنا ہوا وصی
تیرا کچھ گیا نہیں، میرا کچھ بچا نہیں
”مئی! آپ ماموں سے بات کر لیں۔ میں ماہین سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے تیور نے بنا کسی کی طرف دیکھے انتہائی نارمل لہجے میں کہا تو ایک بل کو ڈانٹنگ ٹیبل کے گرد بیٹھے بیٹوں افراد کو سانس سونگھ گیا۔

”کیا؟“ اپنی تمام تر خفگی بھلائے شیریں بیگم نے بے یقین نظروں سے بیٹے کو تکتے ہوئے بے اختیار سامنے بیٹھے شوہر کی جانب دیکھا جو خود بھی حیران سے تیور کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کل صبح جو کچھ ہوا تھا وہ ان کے سامنے ہی تھا۔

”مگر ایک بات! مجھے شادی میں کسی قسم کا ہنگامہ نہیں چاہیے۔“ ان کی حیرت اور سوال دونوں نظر انداز کیے وہ یک لخت ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کھینک سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ مکمل طور پر بے تاثر تھا۔ یوں جیسے وہ اپنی نہیں بلکہ کسی اور کی شادی کی بات کر رہا ہو۔

کچھ غلط ہونے کا احساس ٹمکو کے اندر بڑی شدت سے جاگا تھا جسے محسوس کرتے ہوئے وہ ابھنے کے ساتھ ساتھ خاصی پریشان بھی ہو گئی تھی۔ جبکہ شیریں بیگم کی بے یقینی تیور کا لگا جملہ سن کے خوشگوار حیرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”آپ ایک دو دن میں ماموں سے مل کے ساری بات طے کر لیں۔ میں اب اس معاملے میں مزید تاخیر نہیں چاہتا۔“ اپنی بات مکمل کرنا وہ بنا کچھ سنے اٹھ کر ڈانٹنگ روم سے باہر نکل گیا تو پیچھے چھایا طلسم جیسے ٹوٹ گیا۔

”مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ تیور ماہین سے شادی کے لیے تیار ہو گیا ہے۔“ پرجوش سی شیریں بیگم ”ماہین“ پہ زور دیتے ہوئے بولیں تو مہرمل کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ اس لیے پہلے آپ ابھی ماموں سے بات کرنے کی غلطی مت پیچھے گا۔“ ”کیا مطلب؟“ شیریں بیگم نے الجھ کر بیٹی کی جانب دیکھا۔ سناج صاحب کی نظریں بھی ٹمکو کی طرف اٹھ گئیں۔

”مطلب یہ مئی کہ کل تک وہ جس لڑکی کا نام نہیں سنا چاہتے تھے آج وہ اچانک کیسے اس سے شادی کے لیے تیار ہو گئے ہیں؟ کچھ تو ہوا ہے ورنہ۔“ ”ہو سکتا ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔“ شیریں بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے بولیں تو مہرمل کرفنی سے بولی۔

”فار گاڈ سب مئی! لون سی غلطی؟ انابیہ کو پسند کرنا یا ماہین کو ناپسند کرنا؟ آپ انچھی طرح جانتی ہیں کہ ان دونوں میں سے کچھ بھی غلط نہیں۔ اپنا لالہ نف پارنر

چننے کا انہیں پورا پورا حق ہے۔“

”ہاں! تو اب جب اس نے خود ہی ماہین کو چن لیا تو تم کیوں مجھے منع کر رہی ہو؟“ ٹمکو کے لبوں سے بے اختیار اک گہری سانس برآمد ہوئی۔

اس کی نظریں بے اختیار سناج صاحب کی طرف اٹھی تھیں جو اسے سر کی خفیف جنبش سے تسلی دیتے ہوئے شیریں بیگم سے مخاطب ہوئے۔

”ٹمکو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تیور کے دماغ میں کیا چل رہا ہے اسے جانے بغیر ہمیں کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ چند دن رک کر تیور سے اس بارے میں دوبارہ بات کرو اور اگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے تو بے شک اس دن جا کے بات کی گرتا۔“ وہ سنجیدہ کجے میں گویا ہوئے تو شیریں بیگم دل مسوس کر رہ گئیں لیکن چونکہ بات ان کی بھی غلط نہیں تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اثبات میں سر ہلانا پڑ گیا۔

ان کے خاموشی اختیار کرنے سے ٹمکو کا بے چین دل جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ انابیہ احسان کی اس کے بھائی کی زندگی میں کیا اہمیت تھی یہ اس نے ان گزرے چار سالوں میں بخوبی جان لیا تھا۔ تیور کی بے رنگ زندگی نے اسے پہروں بہت کچھ سونچنے پر مجبور کیا تھا۔ اور اب اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ اس کا بیاہ بھائی زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن پوری آمادگی اور دل کی خوشی کے ساتھ۔

انابیہ کی بے ہوشی پہ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹرز نے ٹروس بریک ڈاؤن کی اطلاع دیتے ہوئے اسے داخل کر لیا تھا۔ اس کی حالت خاصی نازک تھی۔

ابھی بھی مومنہ عشاء کی نماز کے بعد حاجت کے نوافل ادا کر کے اس کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ مختلف آیات اس پہ پڑھ کر پھونکتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کے اپنی چھوٹی بہن کی پیشانی چومی تھی جس کا پھول سا نازک چہرہ بالکل کھلا کر رہ گیا تھا۔ اس کی بند آنکھوں

کے گرد بڑے ہوئے حلقے دیکھ کے مومنہ کا دل بے اختیار کٹنے لگا تھا اور آنکھیں نے سرے سے جلنے لگی تھیں۔

لگتی مشکل سے انابیہ کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک ہونے چلا تھا کہ تقدیر نے ایک بار پھر سب کچھ ٹھس ٹھس کر ڈالا تھا۔ ان کے بابا محض چند ہی دنوں میں برسوں کے مریض لگنے لگے تھے۔ ان کے جھکے شانے، تھکا ہوا چہرہ مومنہ کو اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا لیکن وہ ان کے سامنے ہمت سے کام لینے پر مجبور تھی، مگر تنہائی میں اس کا صبر یونہی جواب دے جایا کرتا تھا۔ جیسے اس وقت وہ بے حوصلہ ہو کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ اپنی بیاری مال کو یاد کرتے ہوئے اس کے دل پہ لگا ہوا زخم نے سرے سے رتنے لگا تھا اور ذہن میں اس صبح وقت کی جیسے ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

عون کو لگنے والی چوٹ کو مینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ اس دوران احسان صاحب اور عصمت بیگم انابیہ کو لیے فقط ایک ہی بار نواسے کا حال احوال پوچھنے مومنہ کی طرف گئے تھے اور وہاں جس سرد مہمی سے سب ان کے ساتھ پیش آئے تھے اسے دیکھتے ہوئے مومنہ نے خود ہی انہیں دوبارہ وہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ گو کہ ان کے دوبارہ نہ آنے پہ بھی مومنہ کو ڈھیروں ڈھیر باتیں سنائی گئی تھیں مگر اس نے بھی جیسے اپنے لب سی لیے تھے۔ اس دوران گھر والوں سے اس کا رابطہ صرف فون تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ عصمت بیگم نے اسے عادل کی ناراضی دور ہونے تک میکے نہ آنے کی ہدایت کی تھی۔ مومنہ بچوں کے بنا شوہر کی خفگی مول لے کر ان کی طرف آئی یہ انہیں منظور نہ تھا۔

بیٹی کی پریشانی اور اس کے سسرال والوں کے رویے دیکھتے ہوئے احسان صاحب نے عصمت جہاں کے مشورے سے ان سب کے لیے نواسے کی صحت

یابی کا ہمانہ کرتے ہوئے دعوت کا اہتمام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

انابیہ کو بھی بتاؤ دور کرنے کا یہ خاصا مناسب طریقہ لگا تھا۔ مومنہ کے علم میں یہ سب آیا تو اس نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی۔

اس کے منع کرنے کے باوجود احسان صاحب خود دعوت کا پیغام لے کر اس کے سرال آئے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ان لوگوں کی یہ پیش رفت ایک مثبت قدم ثابت ہوگی مگر۔



”عون کی صحت یابی کی خوشی میں کھانا؟“ زلدہ بیگم نے طنزیہ نظروں سے مقابل بیٹھے احسان صاحب کی طرف دیکھا تو مومنہ کا خون کھول اٹھا۔

”ویسے آپ لوگ بھی کمال ہیں۔ نواسے کو دوبارہ دیکھنے کی زحمت تو کی نہیں گئی اور اب اس کی صحت یابی کی خوشی میں کھانا کرنے چلے ہیں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بھنویں سیکھرتے ہوئے بولیں تو ایک لمحے کے لیے احسان فاروق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی سمدھن کو کیا جواب دیں۔

”خیر! وہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ اپنے نواسے کو پوچھیں یا نہ پوچھیں۔ لیکن ہماری طرف سے تو آپ معذرت قبول کریں۔ ہم لوگ آپ کی طرف نہیں آسکیں گے۔“

”کیوں بس! خیر تو ہے؟ ایسی کیا بات ہوگئی جو آپ لوگ ہماری طرف نہیں آسکتے؟“ احسان صاحب نے پریشانی سے کہا۔

”دیکھیں بھائی صاحب! میں صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ آپ کی بیٹی نے ہمیں ایسا کوئی سکھ نہیں دیا جو ہم دوڑو دوڑ کر آپ کی طرف آئیں۔ رہا عادل تو اب تو اسے بھی بہت کچھ سمجھ میں آگیا ہے۔“ وہ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پہ سجائے گویا ہو میں تو احسان صاحب کی پیشانی پہ بہت کوشش کے باوجود بل آن ٹھہرے۔ جبکہ مومنہ مارے ضبط کے اپنا بخلا بل کاٹ

کر رہ گئی۔

”مثلاً“ کیا سمجھ میں آگیا ہے؟“ انہوں نے بے حد تحمل سے استفسار کیا۔ حالانکہ ان کی بات انہیں بے حد بری لگی تھی۔

”یہ تو اب آپ اپنے داملو سے پوچھیے گا۔ میں کچھ کہہ دوں گی تو خواہ خواہ باتیں بنیں گی پہلے ہی خاصی بری مشہور ہوں میں۔“ انہوں نے دروازے سے اندر داخل ہوتے عادل کو دیکھا۔

عادل کے لٹھ مار انداز میں کیے گئے سلام کے باوجود وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو ناچار عادل کو بھی آگے بڑھنا پڑا۔

”کیسے ہو بیٹا؟“ انہوں نے دھیرے سے اس کا شانہ پتھرتایا۔

”تھک گیا۔“ وہ ایک لفظ میں جواب دیتا ان کے مقابل رکتے صوفے پہ ماں کے برابر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش دیکھ کر ہی مومنہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ”اندر“ سے ہی خاصی فارم میں بھیجا گیا تھا۔

”بیٹا! تمہارے سر ہم سب کو کھانے پہ انوائٹ کرنے کے لیے آئے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ احسان فاروق کچھ کہتے، زلدہ بیگم اسی بیٹھے تجھے میں بول اٹھیں۔

”کیوں؟“ وہ سچائے احسان صاحب کی طرف دیکھنے کے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو مومنہ کی درو میں ڈوبی نظریں بے اختیار باپ کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے وہ بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تھکنے لگے۔ لیکن آنسو اس تیزی سے اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے کہ سارا منظر دھندلا گیا۔

”مومنہ ماشاء اللہ سے صحت یاب ہو گیا ہے نا اس لیے۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”عون کی صحت یابی سے ان لوگوں کا کیا تعلق؟“ وہ اب بھی انہیں نظر انداز کیے ماں سے بولا تو فوراً ہی زلدہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

”یہ تو تم اب ان ہی سے پوچھو۔“ اور ان کے جواب پر مومنہ کا ضبط جواب دے گیا۔

”عون اولاد ہے میری اور یہ میرے ماں باپ ہیں۔ میں چونکہ غلطی سے آپ کی بیوی ہوں، اس لیے ان لوگوں کا مجھ سے اور میرے بچوں سے وہی تعلق ہے جو آپ کے گھر والوں کا ہے۔“ وہ ان لوگوں پر دوز دیتی غصے سے بولی تو عادل کی ہنوس تن گئیں۔

”دیکھی آپ نے اپنی بیٹی کی زبان؟ اسے اتنی تمیز تو ہے نہیں کہ شوہر سے کیسے بات کی جاتی ہے۔“ وہ انتہائی تیز لہجے میں بولا۔

”ممنی! تم خاموش ہو جاؤ بیٹا۔“ احسان صاحب اتنا ہی کہہ سکے۔

”کیسے خاموش ہو جاؤں بابا! میں اپنی بے عزتی تو برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر کوئی۔ کوئی آپ کو۔“ آنسوؤں کی شدت نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تو احسان صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے شانے سے لگایا۔

”ارے! تو ہم نے کیا کہہ دیا تمہارے باپ کو جو تم یوں چکوں پہکوں رونے بیٹھ گئی ہو؟“ زائدہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

”ہونہ! باب کے لیے تو ایک لفظ سنتا گوارا نہیں اور شوہر کو جو پہلے دن سے کبھی کسی نے ڈھنک سے پوچھا نہیں، اس پر تو آج تک سوال نہیں کیا۔“ اس کی اتنی بڑی بات پر مقابل بیٹھے احسان فاروق کے لیے مزید خاموش رہنا ناممکن ہو گیا۔

”عادل بیٹا! یہ ڈھنک سے پوچھنا کیا ہوتا ہے؟ ہم نے تو تمہاری عزت میں کبھی کسی نہیں کی بلکہ تمہیں تو ہمیشہ واما کے بجائے اپنا بیٹا مانتا ہے۔“ وہ دکھ سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے بولے۔ تو وہ گردن کو خفیف سا جھکا دیتے ہوئے بولا۔

”ہونہ! صرف منہ زبانی۔ ورنہ آپ میری بات یوں روتے کرتے۔“

”کون سی بات؟“ انہوں نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تو ان کے شانے سے لگی مومنہ خود کو سنبھالتی

تیزی سے سیدھی ہوئی۔

”بابا! یہ آپ کی جائیداد میں سے میرا حصہ اپنے نام کروانا چاہتے ہیں۔ جو میں مر کے بھی نہیں ہونے دوں گی۔“ اس کی بات پر جمال احسان فاروق ہکا بکا رہ گئے، وہیں عادل کی آنکھوں سے جھگاریاں نکلنے لگیں۔

”کھمینی، کھنی عورت! تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تمہارا باپ نہیں ماں رہا؟“

”ہاں! میں نے جھوٹ بولا۔ میرے باپ کی محنت کی کمائی آپ جیسے لالچی اور کم ظرف لوگوں کے لیے نہیں۔“ مومنہ کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ عادل چیل کی طرح اڑ کر اس کی جانب لپکا تھا مگر اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ مومنہ کو چھو پاتے، احسان صاحب سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”بہت ہو گیا تمہارا عادل! میں ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ تم میری بیٹی پر میرے سامنے ہاتھ اٹھاؤ اور میں جب چاہ کر برداشت کر جاؤں۔“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اپنی طبیعت کے برخلاف انتہائی غضب ناک لہجے میں بولے۔

”تو اٹھائیں اپنی اس بیٹی کو اور نکل جائیں میرے گھر سے۔ میں اب اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا۔“ وہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے بد تمیزی کی سب حدیں پار کر گیا تھا۔ اس کی بات پر احسان صاحب کا چہرہ مارے طیش کے سرخ پڑ گیا تھا۔ شور شراب کی وجہ سے گھر کے سب ہی افراد ڈراؤنگ روم کے دروازے میں اکھڑے ہوئے تھے۔

”میں اگر جاؤں گی تو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔“ روتی ہوئی مومنہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو عادل نے تیزی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے پیچھے کودھکیا۔

”وہ میرے بچے ہیں۔ تم اس گھر سے اکیلی ہی دفع ہو گی۔“

”عادل! اس کی اس حرکت پر احسان فاروق کا ضبط جواب دے گیا تو وہ بے اختیار بیڑی انداز میں

اسے پکار اٹھے۔ ”تنتے چھوٹے بچوں کو تم تو کیا دنیا کا کوئی قانون ماں سے دور نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم بچوں کو مومنہ کے ساتھ جانے دو۔“

”جائے دو بیٹا! ہمیں کیا پڑی اس ناگن کی اولاد کو اپنے پاس رکھنے کی۔“ زائدہ نے لپک کر بیٹے کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ان جیسی چالاک عورت یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اتنے چھوٹے بچوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا۔ ان میں تارے نظر آجائے تھے۔

”مکرائی۔“ وہ جھنجھایا سالماں کی طرف پلٹا تو انہوں نے اس کے شانے کو تسلی آمیز لہجے میں دہرایا۔

”جائے دو ڈرا اسے اور اس کے گھر والوں کو بھی تو آئے دال کا بھڑا پتا چلے۔“ وہ ایک طنزیہ نظر احسان صاحب اور مومنہ پر ڈالتے ہوئے ہوشیاری سے بولیں۔

اسے جھگ کی طرح بیٹھتا دیکھ کے سکتی ہوئی مومنہ دیوانہ وار اندر کی جانب بھاگی اور اپنے دونوں بچوں کو متاع جاں کی طرح خود میں سموئے عادل حسن کی خواہش پوری کر گئی۔

بلکتی ہوئی مومنہ نے باپ کے ساتھ ہی گھر کے اندر قدم رکھا تو گویا کرامت چمک گیا۔ عصمت بیگم تو کتنی ہی دور اسے خود سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں لیکن جب تھوڑا سنبھلنے پر احسان صاحب نے انہیں پوری بات بتائی تو وہ بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔ جو لوگ اس کے باپ کے سامنے اس کا یہ حال کر رہے تھے وہ تنہائی میں اس کا کیا حال کرتے ہوں گے؟ یہ سوچ کر ہی ان کا کیجھ مرنے کو آنے لگا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالا خرہ وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دو مین دن بعد عصمت بیگم اور احسان صاحب خود عادل سے کہیں باہر جا کے ملیں گے اور عیدہ گھر کی تجویز رکھنے کے ساتھ ساتھ جائیداد میں سے مومنہ کا حصہ بھی ان دونوں کے نام کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان کی بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں خوش اور آباد رہے انہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

مومنہ کو اپنے میکے آئے آج جھٹاؤں تھا۔ اس دوران احسان صاحب نے تین چار بار عادل کو فون کیا تھا۔ مگر وہ سری جانب سے ان کی کال ہر بار کٹ دی گئی تھی۔

اس کی اس بد تمیزی پر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ مگر چونکہ بیٹی کا معاملہ تھا اس لیے حوصلے اور صبر سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ایک دو روز مزید انتظار کرنے کے بعد اس کے آفس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسی سوچ میں مستغرق وہ ناشتے میں مصروف تھے جب کال ٹیلی کی آواز پر مشکور باہر کی جانب گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو ہاتھ میں مومنہ کے لیے ایک مہربانہ لفافہ تھا جسے دستخط کرنے کے بعد مومنہ نے وصول کر لیا تھا۔

مومنہ نے لفافہ کھول کر اندر موجود کانڈ نکالا۔ جیسے جیسے مومنہ کی نگاہیں سطروں پر سے پھسلتی گئیں ویسے ویسے اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں بے یقینی سے پھٹتی چلی گئیں۔

”ای۔ بابا۔۔۔ عادل نے مجھے طلاق۔۔۔“ وحشت زدہ سی مومنہ نے محفل ہوتے حواس کے ساتھ ماں باپ کی جانب دیکھا۔ بے جان ہوتے ہاتھوں سے کانڈ نکل کر نیل پر گر گیا تھا۔

”ہائے! ہائے! میرے اللہ! عصمت جہاں نے بے اختیار اپنا دل تھما تھا۔ جبکہ احسان فاروق دیوانہ وار اٹھ کر اس کانڈ کی جانب لپکے تھے جو ان سب کے لیے برپادی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اتنا یہ منہ پہ ہاتھ رکھے ہکا بکا بیٹھی تھی۔

”بابا! بابا! یہ سچ نہیں ہے نا بابا! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں کہا۔“ پانگوں کی طرح

ان کا بازو ہلاتے ہوئے مومنہ بے قراری سے بولی تو ساکت کھڑے احسان فاروق جیسے ہوش میں آگئے۔ کھینچ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے وہ تڑپ کر رو دیے تھے۔

باپ کے آنسوؤں نے مومنہ کی ہر خوش فہمی بکھیر دی تھی۔ اس کی بے یقینی نے یقین کی سرحد کو چھوا تو گھر کے دروازے پر اس کی چیخوں سے لرز اٹھے تھے اور وہ وہیں باپ کے بازوؤں میں کسی مانی بے آپ کی طرح تڑپتے ہوئے ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

کسی نے صحیح کہا ہے انسان جب کسی دکھ میں مبتلا ہوتا ہے تو صرف اسی دکھ کا احساس اسے نہیں ملتا بلکہ خود پہ بیتی ہر تکلیف ہر روتنے سے سرے سے یاد آکر آنسوؤں میں اضافہ کر جاتا ہے مومنہ بھی یمن کی تکلیف پہ روتے روتے اپنے غموں کو یاد کرنے بیٹھ گئی تھی۔

کوئی شخص اتنا بھی کم عقل اور بے حس کیسے ہو سکتا ہے کہ محض دو سروں کے کہنے پہ ایک انتہائی معمولی بات نہ صرف اپنا گھر تباہ کر لے بلکہ اپنے بچوں کو بھی دنیا کے سرود گرم چھیلنے کے لیے تباہ چھوڑ دے۔

آنے والی صبح احسان صاحب اور مومنہ کے لیے خوشیوں کی نوید لے کر آئی تھی۔ انابیہ کو ہوش آ گیا تھا بے اختیار سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے وہ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔

ڈاکٹر چند ضروری ٹیسٹ لینے کے بعد ہی انابیہ کو روم میں شفٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

شادی کے پانچ سال بعد شمو کی منداہم کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش پر شمو اس سے ملنے اسپتال پہنچی۔ اہم اور اس کے بچوں سے ملنے کے بعد شمو بیانی سب کے ساتھ باہر نکلی تو دھیان بے اختیار محب کی

کھانسی کی طرف چلا گیا۔ وہ احمر کے ساتھ محب کو لے کر چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس جانے کے لیے مڑی تو بائیں طرف کے بجائے دائیں طرف مڑ گئی وہاں آئی سی یو سے کسی مریض کو اسٹریچر لایا جا رہا تھا۔

ایک طرف بٹے ہوئے اس کی نظر چھپے آتے ڈاکٹر کے ساتھ چلتے افراد کی جانب اٹھی اور وہ ایک پل کے لیے بری طرح الجھ گئی تھی۔ سامنے موجود تین چار چروں کے درمیان دو چہرے اسے نہ جانے کیوں جانے پہچانے سے لگے تھے۔

بخور ان کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی پرسوج نگاہیں یوں ہی وارڈ بوائے کے درمیان موجود اسٹریچر پر درازہ خود سے ٹکرائیں تو وہ پوری جان سے کانپ گئی تھی۔

”ہے۔ یہ تو انابیہ ہے!“ اسٹریچر پر دراز کزور اور زور چہرے کو پہچانتا تھا، وہ بھی چار سال بعد کو کہ اتنا آسان نہ تھا۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے یہ مرحلہ محض ایک لمحے میں طے کر لیا تھا۔ اسے وہیں بت بنا دیکھ کے قدرے آگے کو کھڑا احمر واپس پلٹا تھا۔

”احمر! یہ۔ یہ وہی لڑکی ہے جسے تیمور بھائی پسند کرتے تھے۔“ وہ آگے جاتے اسٹریچر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے بولی تو احمر بھی چونک گیا۔

”آپ پلیز پتہ کروائیں اسے کیا ہوا ہے؟“ وہ احمر کا بازو تھامتے ہوئے مضطرب سی بولی تو وہ حیران سا اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پھر کمری سانس لے کر بولا۔

”چچا! تو معلوم کرتے ہیں۔“ وہ شمو کا ہاتھ تھام کر آن ڈیوٹی اسٹاف کی طرف بڑھا۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ انابیہ کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور اب وہ روم نمبر 105 میں شفٹ کر دی گئی ہیں۔ شمرہ کا بوجھل دل بے اختیار چھلک اٹھا۔

”میں نہیں جانتی کہ انابیہ کو کیا پریشانی ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دونوں خوش نہیں احمر! خوش نہیں۔“ اس کے بازو سے پیشانی ٹکائے وہ بے اختیاری کے عالم میں رو پڑی۔

روم نمبر 105 کے باہر کھڑے اسے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی مگر اندر جانے کی ہمت مجتمع نہیں ہو پاری تھی۔ انابیہ اور اس کے گھر والوں کے روعمل کا سوچ کر اسے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ لب چباتے وہ شدید ذہنی دباؤ کے عالم میں دروازے کو کھڑکی دیکھ رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا اور اپنے دھیان میں باہر نکلتی مومنہ ٹھٹک کر اس کے مقابل رک گئی تھی۔

مقابل نے اسے پہچان لیا تھا اور پہچان کا احساس ہوتے ہی اس کی ہتھیلیاں چٹ گئی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ شموک نکتے ہوئے اس نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

”وعلیکم السلام۔“ مومنہ نے جواب دیا اور ایک طرف ہو کر شمو کو اندر جانے کا رستہ دیا۔ وہ بھجکتی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔ جہاں سامنے بیڈ پہ آنکھیں بند کیے انابیہ کو دیکھ کے اس کے بوجھل قدم بے اختیار رک گئے تھے اور نظریں اس کے کمزور چہرے پہ جیسے جم گئی تھیں۔

”انابیہ! کو کچھ دیر پہلے وہاں تھی، اس لیے وہ سو رہی ہے۔“ چند لمحے یوں ہی گزر گئے تو مومنہ نے دھیمے لہجے میں اسے مطلع کیا۔

اس کی بات پہ جہاں شمو کی محویت ٹوٹی تھی وہیں اس کے منتشر اعصاب اور گھبرائے ہوئے دل کو تھوڑی سی تسلی ہوئی تھی۔ وہ اب قدرے حوصلے سے مومنہ سے بات کرنے کی ہمت کر سکتی تھی ورنہ انابیہ کا سامنا کرنے کی سوچ نے تو اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔

”میں۔۔۔ انہیں ہوا کیا ہے؟“ وہ بھجکتے ہوئے مومنہ سے مخاطب ہوئی تو وہ اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”نیا کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔“ اس کے جواب پہ شمو نے ایک نگاہ انابیہ کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بے چینی سے اپنی انگلیاں پچھائی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس نروس بریک ڈاؤن کی وجہ کیسے پوچھتے۔

”ایسا کیا ہوا تھا جو وہ۔۔۔“ وہ ایک لحظے کو مناسب الفاظ کی تلاش کے لیے رکی تھی کہ مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تمہارے بھائی نے تمہیں نہیں بتایا؟“

”بھائی؟“ اس نے الجھ کر مومنہ کی جانب دیکھا۔

”تیمور بھائی کا اس سب سے کیا تعلق ہے؟“ اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی الجھن اور حیرت نے مومنہ کو ایک لمحے کے لیے خاموش کر دیا۔

”تم یہاں اسپتال کس سلسلے میں آئی ہو؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

”میں۔۔۔ میں تو یہاں اپنے فریڈ اور سرال والوں کے ساتھ آئی ہوں۔ میری منڈائیڈ مٹ ہے یہاں۔“ وہ الجھ کر گویا ہوئی تو مومنہ بے اختیار خاموش ہو گئی۔ وہ تو سمجھی تھی کہ تیمور نے انابیہ کا پتا لگا کر شمو کو یہاں بھیجا تھا۔ جب ہی تو اس نے بنا کوئی سوال کیے اسے کمرے میں آنے دیا تھا کہ ہر کف وہ ان کا حسن تھا لیکن اب بھلا وہ اپنی کئی بات کو کیسے سنبھالے گی؟

”لیکن آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ میں یہاں تیمور بھائی کے کچھ بتانے پہ آئی ہوں؟ کیا وہ انابیہ کی حالت کے بارے میں جانتے ہیں؟ کیا وہ آپ کو لوگوں سے رابطے میں ہیں؟“ مضطرب سی وہ مومنہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مومنہ کے منہ سے تیمور کا ذکر سن کے اس کی تو حیرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

”نہیں! اس کا ہم سے کوئی رابطہ نہیں۔“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

”پھر آپ نے تیمور بھائی کا نام کیوں لیا؟“

”میرے پاس تمہاری اس کیوں کا کوئی جواب نہیں اور پلیز! مجھے ڈاکٹر سے ملنے جانا ہے۔ اس لیے مزید تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکتی۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے تیز قدموں سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

مومنہ کا یوں کئی کترا کے نکل جانا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ تیمور کی ذات کہیں نہ کہیں اس سارے معاملے میں شامل ضرور تھی۔

اس نے اچانک ماہین کے لیے ہال کر کے ان سب

کو حیران کر دیا تھا۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا اور یہ کیسے سلجھنے والا تھا، وہ جھپٹتا "بری طرح الجھ گئی تھی۔"

اسپتال سے ٹمرو کی واپسی انتہائی اضطراب کے عالم میں ہوئی تھی۔ جس کو دور کرنے کا واحد حل اس کے پاس صرف یہی تھا کہ وہ فوراً "تیور سے اس بارے میں بات کرے۔" گوکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ بھی مومنہ کی طرح اسے کچھ بھی بتانے سے انکاری ہو جاتا۔ مگر پھر بھی وہ ہر حال میں سچ جانا چاہتی تھی اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب کی بار اس موضوع کو کس رخ اور کس انداز سے زیر بحث لائے گی۔

"اسلام علیکم بھائی! کیسے ہیں آپ؟" مناسب موقع ملتے ہی ٹمرو نے تیور کا بڑا مل کیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق تیور کو بھی اس وقت فارغ ہونا چاہیے تھا اور وہی ہوا تھا، وہ نہ صرف فارغ تھا بلکہ خاصی سگلی سے اس نے ٹمرو کا بھی حال احوال دریافت کیا تھا۔

"بھائی! مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔" ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ٹمرو نے اپنے سوچے گئے طریقے کے مطابق موضوع کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

"ہاں! پوچھو۔" دوسری طرف سے تیور کی ٹھہری ہوئی آواز آئی تھی۔

"آپ حال ہی میں انابیسہ سے کیوں لے تھے؟ اور پلیز! بھائی! مجھے بتائیے گا۔"

اس کی توقع کے عین مطابق دوسری طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں انابیسہ سے ملا ہوں؟"

چند لمحوں کے توقف کے بعد دوسری جانب سے پوچھا گیا تو وہ تیور کے فرار کی ساری راہیں مسدود کرنے کو مضبوط لہجے میں بولی۔

"انابیسہ کی بہن نے۔" اس کے جواب پہ تیور سوچ

میں پڑ گیا۔ یہ مومنہ، ٹمرو کو کمال مل گئی اور مومنہ اتنے سنگین حادثے کے بارے میں اور وہ بھی ٹمرو کے سامنے، اتنی عیوضہ داری کا ثبوت کیسے دے سکتی تھی؟

"تو پھر تم نے اسی سے کیوں نہ یہ سوال کر لیا؟" وہ بغیر کسی گھبراہٹ کے نارمل لہجے میں بولا تو ٹمرو جو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ شاید وہ مومنہ کا نام سن کے پریشان ہو جائے گا۔ نے اختیاراً گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"پوچھا تھا لیکن۔۔۔" وہ بے بسی سے ابھی انتہائی بولی تھی کہ تیور کو اپنا جواب مل گیا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے پرسکون انداز میں اس کی بات کا ردی تھی۔

"لیکن اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ ویسے وہ تمہیں ملی کہاں تھی؟"

"میں آپ کے سوال کا جواب تب ہی دوں گی جب آپ میری بات کا جواب دیں گے۔" وہ قطعی لہجے میں بولی تو تیور اک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

"انابیسہ! اپنی کو لیکز اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ ٹرپ پہ اسلام آباد آئی تھی۔ یہاں ان کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس کی خفیہ انکوائری مجھے سونپی گئی تھی۔ اسی سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

وہ چونکہ یہ بھی جان چکا تھا کہ مومنہ نے اسے کچھ بھی بتانے سے اجازت نہ کی تھی۔ اس لیے اس نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس بات کی حفاظت ویسے بھی وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔

لیکن اس کے جواب پہ ٹمرو کی الجھن کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ بھلا ایسا کون سا حادثہ پیش آ گیا تھا جو انابیسہ کے اعصاب ہی جواب دے گئے تھے؟ یا پھر اس نروس بریک ڈاؤن کی وجہ کچھ اور تھی اور اس کا اس حادثے سے کوئی تعلق نہیں تھا؟ لیکن پھر انابیسہ کی بہن نے تیور کا حوالہ کیوں دیا تھا؟ جبکہ اس کے علم میں تو انابیسہ کا باپ شلا نرڈ ہوتا تھا ہی نہیں؟ معاملہ سرکف اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھے ہوئے تھی۔

"انابیسہ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ اسی لیے سب اسپتال میں تھے۔" اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شلا

معالے کی تہ تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں! اسی لیے اس نے تیور کو ساری بات بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"کیا؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس کی تڑپ پہ ٹمرو کا دل دھکے سے بھر گیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس کی منتظر آواز ٹمرو کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"آپ خود کیوں نہیں آکر دیکھ لیتے۔"

"میرا وہاں کیا کام۔۔۔" عمر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گیا تو ایک پھلکی سی سکراہٹ اس کے لبوں پہ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

"پلیز بھائی! کیوں اپنے دل کا امتحان لے کر خود کو اذیت دے رہے ہیں۔ کیا پتا یہ حادثہ آپ دونوں کو ملانے کا کوئی بہانہ ہو۔"

"کوئی بہانہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو ٹمرو کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا یہ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ٹمرو کی آواز میں در آئی تھی۔ جبکہ ٹمرو کے سارے الفاظ اس کے اندر ہی کہیں کھو کر اسے سنائے کی سی کیفیت میں دھکیل گئے تھے۔

"آئی ایم سوری بھائی! بنا سوچے سمجھے وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تو تیور کا دل بہن کی اس درجہ محبت پہ کٹ کر رہ گیا۔

"تم کیوں افسردہ ہوتی ہو۔ جدائی کا یہ فیصلہ کل بھی اس کا تھا اور آج بھی اس نے ہی اس فیصلے پہ آخری مر لگائی ہے۔ وہ شاید میری اس درجہ پر غلوص اور شدید محبت کے قابل ہی نہیں تھی۔" اس کے زمنوں سے چور شکایتی لہجے پہ روتی ہوئی ٹمرو بے اختیار تڑپ اٹھی۔ اس کے لیے مزید چپ رہنا نامکن ہو گیا تھا۔

"نہیں بھائی! وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی اور مجھے یقین ہے وہ آج بھی آپ کو اتنا ہی چاہتی ہوگی۔"

سچی محبت کو بھلا نالتا آسمان نہیں ہوتا بھائی! "جو انابیسہ احسان کو کسی جگہ سے بھی ہی نہیں لیکن میں پھر بھی پچھلے چار سالوں سے اس پہ یہ انمول خزانہ لٹاتا رہا۔ بنا کسی غرض، کسی صلے کے اسے چاہتا رہا مگر اب اور نہیں۔ میں اب اس کی یاد میں مزید ایک لمحہ ضائع نہیں کروں گا! اسی لیے میں نے ماہین سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" تنفر سے بولتے ہوئے اس کا لہجہ آخر میں حتیٰ رنگ اختیار کر گیا۔

"تو آپ۔۔۔ آپ اس لیے ماہین سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئے ہیں کہ انابیسہ۔"

"ہاں! جب وہ مجھے فراموش کر کے آگے بڑھ گئی ہے تو میں کیوں اپنا وقت ضائع کروں اس کے پیچھے؟ میرے لیے میرا پندار، میری عزت، میری محبت سے بھی بڑھ کرے ٹمرو۔ مجھے جب تک اس کے راہیں جدا کرنے کا علم نہیں ہوا تھا میں اپنے صبر کی محبت نبھاتا رہا مگر اس کے فیصلے کے بعد اب سب ختم۔ اس کی بات کانٹے ہوئے وہ تبدلے میں بولا تو ٹمرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ کے اپنے بھائی کو اس انتہائی قدم سے روکے۔

"پلیز بھائی! یہ نہ کریں۔ ابھی اس کی صرف منگنی ہی تو ہوئی ہے۔ آپ اس سے ایک بار ملیں تو سہی۔ اس سے بات تو کریں۔ بلکہ میں۔۔۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔ اسے سمجھاؤں۔"

"خبردار! جو تم نے اس سے کچھ کہا یا سمجھایا۔ اس کی بات کانٹے ہوئے تیور غضب ناک لہجے میں غرایا۔

"میں اب اس موضوع پہ مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔ نہ آج اور نہ آئندہ کبھی اور مجھے امید ہے کہ تم میری اس خواہش کا احترام کرو گی۔ حتیٰ لہجے میں کہتے ہوئے تیور نے رابطہ منقطع کر ڈالا۔

کاش کہ اس کا بھائی جو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے اور یہ سب اس کی محبت میں کر رہی ہے، سچ ہوتا اور وہ اتنی ہی غلوص اور اچھی بہن ثابت ہوئی ہوتی۔ جتنی کہ وہ سمجھ رہا تھا، اے

کاش!

☆ ☆ ☆

فون بند کر کے وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ ڈوبتے سورج کی کمزور کرنیں بے بسی سی بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ بالکل اس کے دل کی طرح۔ جس میں موجود امید کی آخری کرن بجھنے کے بعد اب سوائے اندھیرے اور گھٹن کے اور کچھ نہ بچا تھا۔

اس نے ٹمکو کو دو ٹوک الفاظ میں منع کر دیا تھا لیکن اب اس سے اپنے دل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ جو اس کے اس کھوے فیصلے کے خلاف سرپا احتجاج بن گیا تھا۔ وہ انابہ کو دیکھنے اس سے ملنے کے لیے بری طرح بے چین ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میں موجود نئے خیال رکھنے والوں کا احساس اسے اندر تک جلا گیا تھا اور یہ جلن اتنی شدید تھی کہ وہ آنکھوں میں پھیلتی نمی کو نہ روک سکا۔ اس کے سامنے پھیلا تاریک منظر آنسوؤں میں ڈولنے لگا تھا اور اس ڈولتے ہوئے منظر میں یکایک پرانے چہرے اور پرانی یادیں ابھرنے لگی تھیں۔ جو بڑی دلفریب بڑی مسکون تھیں۔

☆ ☆ ☆

”انابہ! تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔ میرے جذباتوں پہ اعتبار کر کے تم نے مجھے میری ہی نظروں میں معتبر کر دیا ہے۔ میں کتنا خوش ہوں میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“

انابہ، احسان کے رویہ کو کھڑا اپنی پرشکوہ نگاہیں اس کے گلابی شرمیلے چہرے پہ جمائے ہوئے تھا جبکہ انابہ کے لیے اس کی وارفتگی اور اپنے اقرار کے بعد اس کا سامنا کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی جانب دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ جو بڑے آرام سے آپ سے تم تک کا سفر طے کرتا، اس کے پاس کھڑا تھا۔

”میں نے تم سے اپنی فیملی کو شیر کی ہیں۔ تم کچھ نہیں کہو گی؟“ اس کی جھکی پلوں کو شرارت سے لگتے

ہوئے شوخ لہجے میں بولا۔

”کیا۔ کیا ہوں؟“ وہ اٹکتے ہوئے بولی تو تیمور اپنی مسکراہٹ دیا گیا۔

”بڑھتی ہوئی ہنگامی کے بارے میں ہی اظہار خیال کرو۔“ اپنی شرارت چھپائے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اس درجہ بے تکے اور اچانک مشورے نے انابہ نے ہونٹوں کی طرح منہ اٹھا کر تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ شرارت سے ہنسا تو انابہ کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہو گیا۔ بے اختیار ہی اس کے ہونٹ بھی کھل اٹھے۔

”یہ ہوئی نابالت۔ ورنہ اس سے پہلے تو یوں لگ رہا تھا جیسے تم سے اظہار محبت نہیں بلکہ اقرار جرم کر دیا جا رہا ہے۔“ تیمور محبت پاش نظروں سے اسے نکلتے ہوئے بولا تو وہ دھیرے سے ہنس دی۔

میری نیت اور میرے جذباتوں میں تمہارے لیے سوائے پاکیزگی کے دوسرا کوئی اثر نہیں اور اگر اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد اپنی محبت کی اس پاکیزگی کو نہ صرف تم پہ بلکہ سب پہ واضح کر دوں گا۔“ مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس نے وہیں کیاری سے ایک سفید گلاب توڑ کر انابہ کی جانب بڑھادیا۔ اس کا دل یقین کی اس درجہ خوب صورت نشانی پہ کھل اٹھا۔

اپنی لرزتی پلکیں اٹھاتے ہوئے اس نے ایک نظر تیمور کے دیشہ چہرے پہ ڈالی جہاں اس کے کمرے پر لفظ کی سچائی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھی۔ اگلے ہی لمحوں نے نگاہیں جھکاتے ہوئے پھول تھام لیا تو تیمور کا ہاتھ نرمی سے اس کے ہاتھ پہ آن پھرا۔

”تھینک یو انابہ! تھینک یو فار ایوری تھینگ۔“ اس کے چمکتے چہرے پہ نگاہیں جمائے تیمور نے ایک جذب سے کہا تو انابہ دھیرے سے مسکرائی اس کی سنہری آنکھوں سے چمکتی روشنی دیکھ کر وہ غبی گئی۔

☆ ☆ ☆

انابہ نے تیمور پر یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ وہ

اس احساس نے دل سے جڑے اس رشتے کی ایک ڈور روح سے بھی باندھ دی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ رات کا کھانا کھا کے تقریباً ساڑھے دس بجے کے قریب گھر لوٹا تو پورچ میں تیسری بیگم کی گاڑی دیکھ کے خوش گوار حیرت کے زیر اثر تیز قدموں سے چلتا ہوا اندر چلا آیا۔ جہاں لاؤنج میں ماں کے ساتھ بہن کو بھی دیکھ کے اس کی خوشی دوچند ہو گئی۔

وہ ان کی طرف بڑھا تو تیسریں نے بھی اٹھ کر بیٹے کو سینے سے لگایا، مگر خاصی سرد مہر سی۔ جسے تیمور اپنے دھیان میں محسوس کیے بنا ٹمکو کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تم اتنی دیر تک کہاں تھے؟“ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے انہوں نے جاچتی نظروں سے بیٹے کی جانب دیکھا۔

”میں۔۔۔ میں ایک دوست کی طرف تھا۔“ وہ خطے بھر کر کہتے ہوئے بولا تو تیسریں بیگم کی آنکھیں بے اختیار ٹمکو کی آنکھوں سے جا لگائیں۔ انہیں بیٹے کے منہ سے جھوٹ سن کے دکھ کے ساتھ ساتھ غصے نے بھی آن گھیرا تھا۔ جسے انہوں نے بمشکل تمام قابو کیا تھا۔ جبکہ تیمور اپنی دھن میں مسکراتا ہوا بولا تھا۔

”چھا ہوا آپ لوگ آگئے۔ میں آپ لوگوں کے بغیر بہت اداں ہو گیا تھا۔“

”چھا! لگ تو نہیں رہا۔“ تیسریں بیگم استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں، ”آب کے ان کے انداز نے اسے چونکا دیا۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے ماند پڑتی مسکراہٹ کے ساتھ ماں کی جانب دیکھا۔

”آئی مین اگر ایسی بات تھی تو تم دو ہفتوں سے آئے کیوں نہیں؟“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں تو تیمور کی مسکراہٹ بھی بحال ہو گئی۔

”میں بہت مصروف تھا می۔“ اس نے سادگی سے

اس سے شادی صرف اسی صورت میں کرے گی جب اس کی فیملی بھی اسے پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرے گی کیونکہ وہ اپنی بہن جیسی ڈری سہمی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ نہ ہی وہ خود پہ ان چاہی کا ٹیک لگا کر لافزوں کے سائے تلے زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

اس کی بات پہ تیمور کو ایک بار پھر اپنے انتخاب کی درستگی کا بہت شدت سے احساس ہوا تھا اس نے دل ہی دل میں بہت جلد تیسریں بیگم سے اپنی پسند کا ذکر کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر دوسری جانب حالات نے بہت تیزی سے پلٹا کھایا تھا۔

مومنہ کے سرال میں ہونے والی تلخ کلامی کے نتیجے میں احسان صاحب اسے اپنے ساتھ کھلے آئے تھے۔

مگر جب چھ روز مومنہ کو طلاق ہونے جیسی بری خبر اسے ملی تھی تب وہ بھی شاکہ کھڑا کر گیا تھا۔ کوئی شخص اتنا بے حس اور گھٹیا بھی ہو سکتا ہے، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

سارے خاندان میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس کے بعد ہر ایک کا رد عمل اس کے اپنے ظرف اور سوچ کے مطابق تھا۔ ان طرح طرح کے رد و بدل نے احسان صاحب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاصے کم صم سے ہو گئے۔ مگر پھر بھی کالج سے واپسی کے بعد ان کا زیادہ وقت مومنہ اور بچوں کے ساتھ یا پھر عصمت جہاں کی دل جوئی میں گزرتا تھا، جنہیں اس ناگہانی کے بعد دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔

تیمور چونکہ ان کی ذہنی کیفیت سے باخبر تھا۔ اس لیے اس نے ان سے بڑھنے کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے موقوف کر دیا تھا مگر روزانہ کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتا تھا۔ ان کی بہت اور ان کا حوصلہ بے مثل تھا۔ اتنی سخت آزمائش جھیلنے کے بعد بھی تیمور نے ان کے لبوں سے شکوے کا ایک لفظ تک نہ سنا تھا۔ ان کی یہ بردباری تیمور کو ان کا قائل کر گئی تھی۔ وہ اس کڑے وقت میں اس کی فیملی کے ساتھ کھڑا تھا۔

جواب دیا۔

”کیسی بھی کیا مصروفیت کہ انسان ماں باپ بہن بھائی کو ہی بھول جائے۔ آج بھی اگر میں نہ آتی تو نہ جانے تم کتنے دن تک شکل نہ دکھاتے۔“ وہ حنفی سے گویا ہوئیں تو تیمور نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں ہانسیں ڈال دیں۔

”اوکے مدد آئی ایم سوری۔“ اس نے چہرہ آگے کر کے ان کا رخسار چوا تو شیریں بھی مسکرا دیں۔ ”چلو! معاف کیا۔ لیکن اب کل تم ہمارے ساتھ اسلام آباد چلو گے۔“ وہ اپنے سوچے گئے لائحہ عمل کے مطابق بولیں۔

”تو کسے میں نے ابھی خود اسلام آباد جاؤں گا اور نہ آپ دونوں کو جانے دوں گا۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تو شیریں بیگم کی ہنسیوں تن کھیں۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ میں نے آپ دونوں کو کسی سے ملوانا ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تو اس غیر متوقع بات پر شیریں بیگم کے گرد خطرے کی گھنٹی زور شور سے بجنے لگی۔ تو بات یہاں تک آ پہنچی تھی۔ بے اختیار ان کی پریشان نظریں سمو کی جانب اٹھی تھیں جو انہیں آنکھوں سے لٹی دیتی بھائی کی جانب پلٹی۔

”لیکن کس سے بھائی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ اپنی پسند سے۔“ اس نے ایک لمحے کو رک کر ماں کا چہرہ دیکھتے ہوئے بات مکمل کی تو شیریں بیگم کے لب بھیج گئے جبکہ سمو بے اختیار خاموش ہو گئی۔

”جب میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو۔ تب تو تم نے انکار کر دیا تھا۔“ اس کی دہات دیکھتے ہوئے حنفی سے بولیں۔

”تب ایسا کچھ بھی نہیں تھا اور پھر میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ کسی کو پسند کرنا کوئی معیوب بات تو نہیں۔“

”غلط نہ سہی، لیکن اچھی بات بھی نہیں کی۔ تم

جانتے ہو کہ میں باپن۔“

”لیکن میں باپن سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ می کیا آپ میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔“ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اچھائے نظروں سے اٹھ کر دیکھتے ہوئے بولا تو شیریں بیگم کی نگاہیں بیٹے کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔

وہ آج کل جس جذباتی دور سے گزر رہا تھا وہاں سے سمجھانا یا نصیحت کرنا بالکل بے معنی تھا۔ اس سے بھی قسم کی بحث یا زور زبردستی اسے ہاتھ سے گولانے والی بات تھی اور وہ اتنی بے وقوف نہ تھیں کہ اسے اکلوتے بیٹے کو خود سے بدظن کر کے اسے ہمیشہ کے لیے ایک اجنبی لڑکی کے حوالے کر دیتیں۔ انہیں جو بھی کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کے کرنا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ ان کے سوال پر تیمور دھیرے دھیرے انہیں احسان صاحب اور انابیہ کے بارے میں بتانے لگا تھا۔

ساری تفصیل سن کے ان کا فشار خون مزید بلند ہو گیا تھا۔ ایک معمولی پروفیسر کی بیٹی اور ان کے اکلوتے نور نظری کی بیوی؟ منہاج مرتضیٰ اور شیریں منہاج کی ہوس۔ ہرگز نہیں۔ اندر ہی اندر ان کا دل جل اٹھا تھا۔ مگر چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”ٹھیک ہے! تم اپنے باپ سے بات کر لو۔ اگر وہ ان گئے تو میں تمہارا رشتہ لے جاؤں گی۔“ اس کی بات کے اختتام پر وہ بے تاثر لہجے میں بولیں تو جہاں سمو کا بکا رہ گئی وہیں تیمور بے خوش گوار سی بے یقینی چھانچا۔

”یعنی آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟“ اس نے پوچھی پھٹی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“

”یو آر گرٹ ما! آئی لو۔“ ہاتھ بلند کر کے لگا تا وہ ماں کے گلے سے جا لگا تو شیریں نے بھی اسے غلو سے لگا لیا۔

”آئی لو یو ٹو۔“ ان کی آواز ان کے چہرے کی لہر جاذبات سے عاری تھی۔

تیمور جس وقت ڈانگنگ ٹیبل پر آیا، سمو اور شیریں بیگم ناشتا شروع کر چکی تھیں۔

”کہاں رہ گئے تھے؟“ انہوں نے مقابل رکھی کرسی پر بیٹھے ہوئے بیٹی کی جانب دیکھا۔

”میں پیلا سے بات کر رہا تھا۔“ وہ الجھا الجھا سا بولا تو شیریں ہاتھ میں پکڑا کپچے رکھتے ہوئے بولیں۔

”کیا امانہاں نے؟“

”نہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو شیریں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے! پھر آج شام کو ان کے گھر چلے ہیں۔“ وہ اک گہری سانس لینے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں تو تیمور ایک نظر ماں کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کے رہ گیا۔ جو اس کی محبت میں کتنی خاموشی سے اپنی پسند سے دستبردار ہو چکی تھیں۔ بے اختیار اسے ان پر ڈھیروں بار آیا تھا۔ وہ واقعی ایک بے مثال ماں تھیں۔

”لیکن ایک پر اہم ہوئی ہے۔“ وہ بے دلی سے بولا۔

”کیا؟“ شیریں نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ماں کو آج ایک ڈیل کے لیے ایمر جنسی میں دونوں کے لیے کوٹہ جانا پڑ رہا ہے۔ زائد صاحب بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اپنی غیر موجودگی میں اس نے سنبھالنے کے لیے وہ مجھے فوراً اسلام آباد بلا رہے ہیں۔“ اس نے منہاج صاحب کے میسر کا حوالہ دیا تو شیریں بیگم کے دل میں سکون ہی سکون اتر آیا۔

”پھر اب؟“ انہوں نے مصنوعی نفرت سے پوچھا۔

”اب یہ کہ اسلام آباد تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔“ تیمور نے اک بو جھل سانس فضا کے سردی۔

”تو پھر ہم بھی تمہارے چھپے ہی نکلتے ہیں۔ یہ کام تو تمہارے بغیر نہیں ہو سکتا۔“ اگر اسلام آباد جا کے اس کی می کے سر پر ان کی چھٹی کا بھوت نئے سرے سے سوار ہو جاتا تو؟۔ وہ کسی طور اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی رشتہ لے جانے کے لیے اس کی

موجودگی لازمی نہیں تھی۔

احسان صاحب اور عصمت بیگم بھی شاید اس بات کو زیادہ پسند کرتے۔

”میرے خیال میں می آپ چلی جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد وہ پر سوچ انداز میں بولا تو شیریں بیگم کی رکی ہوئی سانس بحال ہو گئی۔

سمواس دوران خاموش تماشائی بنی کبھی ماں اور کبھی بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے فی الحال شیریں بیگم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

”لیکن تم نے ان لوگوں کو تو اطلاع کر دی ہے نا؟“ وہ چہرے پر مصنوعی فکرمندی کرتے ہوئے بولیں۔ یوں جیسے انہیں یہ سب گھبراہٹ میں جتلا کر گیا ہو۔

”نہیں! میں صرف انابیہ کو بتاؤں گا اور آپ بھی وہاں یہ بات مت سمجھیے گا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ صرف یہی کیسے گا کہ میرے منہ سے آپ نے ان لوگوں کی اتنی تعریفیں سنیں کہ ملنے چلی آئیں۔“ اس نے ماں کو صورت حال سمجھائی۔

”تو کیا تم دونوں کی پسندیدگی کے بارے میں وہ لوگ نہیں جانتے؟“ شیریں بیگم کے ہاتھ تڑپ کاڑ لگ گیا۔

”نہیں اور آپ بھی اس بارے میں خیال رکھیے گا۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا سامنے رکھے جو اس کی جانب متوجہ ہوا تو شیریں منہاج اثبات میں سر ہلاتی، ایک نئی سوچ میں ڈوب گئیں۔

تیمور کی سیٹ کفرم ہوئی تو شیریں بیگم نے نوکر کے سر پر کھڑے ہو کے اس کی ہلکی پھلکی پکینگ مکمل کروائی۔ وہ انابیہ کو فون پر شام میں اپنی می اور بہن کی آمد کے متعلق بتا چکا تھا۔ اس کی اچانک اسلام آباد روانگی کا سن کے وہ ٹھوڑا پریشان ہوئی تھی مگر تیمور کے تسلی دینے پر اس کا بے چین دل قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔

نکلنے سے پہلے اس نے شیریں بیگم کے ڈرائیور کو

اچھے طریقے سے پتا سمجھانے کے ساتھ ساتھ مکمل ایڈریس بھی لکھ کر مال کو دے دیا تھا۔ ان کے کہنے پہ اس نے انابیہ کا موبائل نمبر بھی انہیں دے دیا تھا، تاکہ گھر نہ ملنے کی صورت میں وہ اس سے رابطہ کر سکیں۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپریورٹ کے لیے نکلا تھا۔ اسے اتنا تو یقین تھا کہ احسان صاحب اس کا پو پوئل کبھی بھی رو نہیں کریں گے لیکن پھر بھی اس کے اعصاب بے ہلکی ہلکی سی گھبراہٹ سوار تھے۔ دل میں ہوتی خوش گواری پچھل اور آنکھوں میں خوش رنگ خواب لیے وہ لاہور کی فضاؤں کو خیر باد کہہ گیا تھا۔

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ مطلوبہ کالونی تک پہنچنے میں ڈرائیور کو کوئی وقت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ ان کی گاڑی کالونی کا بڑا سا گیٹ عبور کرتی تھیں بیگم نے ڈرائیور کو روک دیا۔ ”ایک منٹ! میں ذرا کفرم کر لوں۔“

انہوں نے موبائل میں فیڈ انابیہ کا نمبر لپٹے ہوئے فون کان سے لگایا۔ نمبر کی آواز سنیں۔ جی نہیں۔ جن کے چہرے پہ پھیلا تفراس کی نظروں سے چھپا نہیں تھا۔

”ہیلو! تین بیلوں کے بعد دوسری طرف سے ایک شائستہ سی آواز سنائی دی تو شیریں بیگم کے چہرے کے تاثرات سرعت سے تبدیل ہو گئے۔

”ہیلو! انابیہ بول رہی ہو؟“ انہوں نے نرم لہجہ میں استفسار کیا۔

”جی۔“ انابیہ نے انجان آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میں تیرور کی می بات کر رہی ہوں۔“ وہ حلاوت سے بولیں تو انابیہ کا دل دھڑک اٹھا۔

”السلام علیکم آئی!“

”وعلیکم السلام بیٹا! ہمیں تمہارا گھر نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے پلیز ذرا راستہ سمجھاؤ۔“

”ضرور۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟“ اس نے رمان سے پوچھا تو شیریں بیگم نے پانچ چھ منٹ پہلے گزرنے والے چوک کا نام بتایا۔ ان کے جواب پہ انابیہ تو انہیں آگے کا راستہ سمجھانے لگی تھی لیکن گاڑی میں موجود نمونے چونک کر مال کو دیکھا تھا۔ ”آگے بیٹھے ڈرائیور نے بیک دیو ممر سے انہیں دیکھا جو نہ جانے کیوں غلط بیانی کر رہی تھیں۔

چند منٹ اس سے بات کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ ”پانچ، دس منٹ یہیں روکو، پھر اندر چلاؤ۔“ انہوں نے موبائل پرس میں رکھتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایت جاری کی تو وہ اپنی حیرت کو دبائے اثبات میں سر ہلایا۔

تقریباً ”سات“ آٹھ منٹ گزرنے کے بعد ان کی ہدایت پہ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی اور اگلے چند ہی لمحوں میں وہ پروفیسر احسان فاروق کے بیلوں سے ڈھکے چھوٹے سے جنگل کے باہر کھڑے تھے۔

”مجھے تو آپ کا گھر کبھی نہ ملتا۔ اگر تیرور نے مجھے انابیہ کا نمبر نہ دیا ہوتا۔“ ڈرائنگ روم میں سب کے درمیان بیٹھی شیریں بیگم نے مسکراتے ہوئے سلا سے لہجہ میں کہا تو جہاں ایک لحظے کو سب خاموش ہو گئے۔ وہیں انابیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے تیرور پہ جی بھر کے غصہ آیا تھا۔

”تیرور نے؟“ احسان صاحب نے الجھی الجھی مسکراہٹ لیے ایک نظر انابیہ کو دیکھتے ہوئے بیگم منہاج کی جانب دیکھا۔

”جی تیرور نے جب انابیہ کو میری آمد کے متعلق بتایا تھا، میں نے تب ہی اس سے کہا تھا کہ مجھے انابیہ کا نمبر دے دو تاکہ اگر مجھے ایڈریس کے معاملے میں کوئی مسئلہ ہو تو میں پوچھ سکوں۔ اور دیکھیں وہی ہوا۔“ اپنے سابقہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولیں تو احسان صاحب کے ساتھ ساتھ مومنہ اور عصمت جہاں کو بھی سانپ سو گھ گیا۔ جبکہ انابیہ کی اوپر کی سانس

اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

بے اختیار ان سب کی نگاہیں ایک جانب بیٹھی انابیہ کی طرف اٹھی تھیں جو متوحش سی انگلیاں پٹختی نظروں جھکا رہی تھی۔

”اور بیٹا آپ کے ہینڈ کیا کرتے ہیں؟“ شیریں بیگم نے ہوشیاری سے اگلا پتا پھینکا حالانکہ تیرور انہیں مومنہ کی طلاق کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس کے سوال پہ احسان صاحب اور عصمت بیگم سمیت انابیہ نے بھی چونک کر مومنہ کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا چہرہ ایک لحظے پھیکا رہ گیا تھا۔

”آئی! امیری حال ہی میں اپنے ہینڈ سے علیحدگی ہو گئی ہے۔“ وہ بو جھل لہجے میں گویا ہوئی تو شیریں بیگم نے جھٹ چہرے پہ اسفر کی طاری کر لی۔

”لوہ! آئی! ایم سوری۔ ویسے بیٹا! آپ کی شادی اپنوں میں ہوئی تھی یا غیروں میں؟“ انہوں نے بات کو اپنے مقصد کی طرف موڑا ”غیروں میں آئی! کوہ! گوگیر لہجے میں دیر سے بولی تو شیریں بیگم تاسف سے سر ہلاتے ہوئے عصمت جہاں سے مخاطب ہوئیں۔

”کئی تو فرق ہوتا ہے اپنوں میں اور غیروں میں۔ میری تو خود بڑی خواہش تھی کہ میں اپنے بچوں کی شادی اپنوں میں کرتی مگر۔“ انہوں نے قصداً بات کو اور اور اچھوڑا تو عصمت بیگم کا سمجھی سے بولیں۔

”مگر کیا؟ آپ اب بھی تو اپنی خواہش پوری کر سکتی ہیں۔“

”کمال! کب جب اپنے اپنی من مانوں پہ اتر آئیں تو مال بپ کو مجبوراً ان کی خواہشات کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔“ وہ ایک نظر انابیہ پہ ڈالتے ہوئے بولیں تو سب مکمل خاموش بیٹھے احسان فاروق سے ان کی یہ بات کو نظر چھپی نہ رہ سکی۔ جس نے نہ صرف ان پہ بیگم منہاج کے جملے کا مفہوم بلکہ وہ سب بھی واضح کر دیا جو بجائے کب سے ان کی ناک کے نیچے چل رہا تھا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔ اور جس کی اطلاع انہیں ایک میسرے بندے کے ذریعے مل رہی تھی۔

کی کو پسند کرنا ان کے نزدیک معیوب نہ تھا لیکن

اس طرح کہ مال بپ کو لاعلم رکھ کر بات اتنی بڑھائی جائے کہ اگلے رشتہ لینے چلے آئیں اور مال بپ ہونقوں کی طرح ان کے منہ سے اپنے بچوں کے کارنامے سنیں۔ یہ ان کے نزدیک ناقابل برداشت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دکھ اور شرمندگی کا باعث بھی تھا۔ ان کی تلخ نگاہیں عصمت جہاں کی حیران پریشان آنکھوں سے ٹکرائیں تو وہ بے اختیار اب کاٹ کر رہ گئیں۔ دوسری طرف انابیہ شرمندگی کے بارے میں سر نہیں اٹھا رہی تھی۔

تیرور نے تو کہا تھا کہ اس کی فیملی کو اس کی پسند پہ کوئی اعتراض نہیں، پھر اس کی می یہ کیا کہہ رہی تھیں؟ کیا وہ محض بیٹے کی خواہش میں مجبور ہو کے یہاں تک آئی تھیں؟ کیا اس پہ بھی مومنہ کی طرح ناپسندیدہ ہو کا ٹیبل لگنے والا تھا اور وہ بھی شادی سے پہلے ہی ہو گیا تیرور نے اس جھوٹ بولا تھا؟

”خیر! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔“ شیریں بیگم نے ایک بو جھل سانس لی۔ ”اب تو ویسے بھی صرف ایک فارم ملے گی جو ہمیں بھائی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے احسان صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔ جو ان کی بات پہ سختی سے لب بھیج گئے۔

ان کے تیرور اور آنکھوں سے جھلکتی خفگی انابیہ کا حلق خشک کر گئی تھی تھے بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے مومنہ کی جانب دیکھا تھا۔ مگر اسے انتہائی خشکی نظروں سے اپنی جانب تکیا کہ وہ غلط نہ ہوتے ہوئے بھی آنکھیں چرا نہ پہے مجبور ہو گئی تھی۔

”آپ کس فارم ملے گی کی بات کر رہی ہیں؟“ احسان صاحب کی سپاٹ آواز انابیہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس کے ہاتھ ٹھنڈے رہ گئے۔

”میں تیرور اور انابیہ کی بات کر رہی ہوں۔ میں آپ سے انابیہ کا رشتہ مانگنے آئی ہوں اپنے بیٹے تیرور کے لیے۔“ انہوں نے اچھی خاصی بنیاد بنانے کے بعد اب کے واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تو کمرے میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ جسے محسوس کرتے ہوئے

ان کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔ جبکہ تماشائی بنی بیٹھی تھو ماں کی چچائی گئی سباط کو دیکھتے ہوئے عیش عیش کر اٹھی۔

”مگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں تو؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد احسان فاروق کا حسب توقع جواب موصول ہوا تو شیریں بیگم کے لبوں پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تو میں یہ کہوں گی کہ آپ اپنی بیٹی اور بیوی سے پوچھ لیں جو تمام معاملات طے کیے بھی ہیں۔“ ان کی بات یہ جہاں احسان فاروق نے بے یقینی سے عصمت بیگم کی جانب دیکھا تھا وہیں انابہ اور عصمت جہاں نے اس الزام پہ زپ کر شیریں بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ عصمت جہاں کا تو چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”پلیز بہن! شیریں بیگم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ ”تیمور نے مجھے خود بتایا ہے کہ آپ کو نہ صرف اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ آپ تو ان دونوں کی ملاقاتیں بھی کروائی رہی ہیں۔ سیرپائے کراتی رہی ہیں ان دونوں کے“

”کیا؟“ عصمت جہاں کا تومہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ جبکہ انابہ کی تو کاٹو بدن میں لبو نہیں والی کیفیت ہو چلی تھی۔ اس نے بھلا کب تیمور کے ساتھ باہر ملاقاتیں کی تھیں؟

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ جھوٹ ہے۔ تہمت ہے۔ تیمور میرے بارے میں انہوں نے ایک روز قبل اتفاقی طور پر عصمت بیگم، انابہ اور تیمور کو ڈاکٹر کے پاس سے آتے ہوئے دیکھ لینے پر صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کیا مگر انابہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی غلط بیانی نہیں کر سکتا۔“ اس کی آنکھیں لبالب بھر آئی تھیں۔

”تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ سب میں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں؟“ انہوں نے یک نخت تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”چلو اچھا! تو پھر مجھے

ایک بات بتاؤ۔ مجھے یہ کہیے پتا چلا کہ کل شام تم اس کے ساتھ آؤ گے؟“ اس کے ساتھ اس کی کریم کھانے گئی تھیں؟“ انداز میں بولیں۔

”یہ بات انہیں کیسے پتا چلی؟“ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس نے خود سے سوال کیا اور جو جواب آیا تھا اس نے اس کے مان اور دل کے درمیان کھینچ ڈالی تھیں۔ جبکہ عصمت جہاں کے بے اختیار ان کے سینے پہ اٹھ رہا تھا۔

”مگر اتنی اکل شام تو وہ مجبوراً ہی اور انابہ کے پاس لے کر گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تھا۔“ پھر نے نہیں گئی تھیں۔ ”ان دونوں کو بتا دیا کہ مومنہ تیزی سے بولی تو شیریں بیگم بھی مسکرا دیں۔

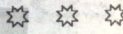
”اب یہ تو آپ لوگ جانیں یا آپ لوگوں کا جانے اس نے تو مجھے صرف آؤ گے کریم پارر جانے

بارے میں بتایا تھا۔ اور معذرت کے ساتھ سب آپ کے نزدیک اتنا ہی معیوب ہے جتنا کہ اس وقت ظاہر کر رہی ہیں تو آپ اس کے ساتھ کیوں نہیں؟“ بلکہ آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ رشتے سے آپ لوگوں نے اسے اپنا ٹور بھرا ہے؟ کیا آپ ماں بیٹیاں اپنے گھر میں آئے تو اسے کوئی نمئی اپنی انگلیوں پہ نکالی ہیں؟ کیا شریفوں کے طور طریقے ہوتے ہیں؟“ عصمت بیگم کی تھریں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ خوش اخلاقی کا پھینکے اپنے اصل پہ اتر آئیں تو ساکت بیٹھی رہ سکتے جیسے ٹوٹ گیا۔

”مسز منہاج بہت ہو گیا۔ آپ کو کسی نے نہیں دیا کہ آپ میرے ماں باپ کی اس درجہ کر رہیں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کی اور اپنی فرق کو بھول جاؤں۔ آپ ابھی اسی وقت ہمارے سے تشریف لے جائیں۔“ غصے سے کانپتی ہوئی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو شیریں بیگم کا چہرہ غضب کے سرخ ہو گیا۔ وہ ایک جھپٹے ہوئیں تو وہاں موجود سب ہی نفوس بھی

ہوئے۔ ”تم دیکھو! آوارہ لڑکی! تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ اتنا بڑا رسائی کا دروازہ تو اپنی جوانی اور اپنی نیت کو سنبھال کر چھوڑ رہی ہو۔“ یہ تو میری اپنے سینے سے محبت تھی جو میں ہر بات نظر انداز کر کے تم جیسے گھٹیا لوگوں سے رشتہ جوڑنے چلی آئی تھی۔ مگر نہ تم جیسی راہ چلتی تو اس قابل بھی نہیں کہ ہم میں سے کوئی تم پہ اک نگاہ غلط بھی ڈالے۔“ جھپٹے۔ وہ اپنا پرس اٹھائے تھو کے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں اور پیچھے کھڑے نفوس پہ موت کا سناٹا چاہ گیا۔

”مومنہ! مومنہ! ایک نخت عصمت جہاں کی کمرانے کمرے کی ساکت فضا میں ارتعاش ساہرا کیا تو تیزوں نے یک وقت گہرا کے ان کی جانب دیکھا جو سینہ لٹے ہوئے صوفے پر گر لی چلی گئی تھیں۔



”کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ فون کان سے لگائے تیمور کے لیے اپنی سماعت پہ یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ”بھائی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ انابہ نے ممی کی ہت انسلٹ کی اور ہمیں صاف لفظوں میں اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا۔“ تھو نے لمبے میں رقت لگائی کرتے ہوئے ماں کے بتائے ہوئے ڈانٹلا گزرا۔ ”میرے تیمور کے لیے اس بات کو ماننا ناممکن ہو گیا تھا۔“ ”مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ مضطرب سا بولا تو بھائی سابقہ لمحہ قائم رکھتے ہوئے بولی۔

”بھائی! جب ممی نے احسان انکل سے آپ دونوں کے رشتے کی بات کی تو انہوں نے فوراً معذرت کر لی کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد انابہ کا رشتہ غیروں میں نہیں کرنا چاہتے۔ اس پہ ممی نے انہیں سمجھانے کے لیے کہا کہ آپ یوں فوری سے تشریف لے جائیں اور ایک بار اپنی بیٹی سے بھی پوچھ لیں۔“ انکل نے گھٹے کہ آپ کا کیا مطلب ہے، میری بیٹی اب کے بیٹے کے ساتھ تو والو ہے؟ ممی نے کہا کہ

خدا تجھ سے کہتا ہے کہ ایک کما۔ مگر یہ بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔ آپ اگر فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے بھی پوچھ لیں گے تو کوئی بری بات نہیں ہوگی۔ اس پہ انکل نے گھٹے کہ میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی کا فیصلہ بھی مجھ سے الگ نہیں ہو گا اور جب انابہ کو بلا کر انکل نے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ جیسی آپ کی مرضی۔ ”تھو سانس لینے کو رکی تو تیمور جو انابہ کی تابعداری سے بخوبی واقف تھا، بے اختیار لب بھینچ گیا۔

”پھر ممی کو بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے کہا کہ تم سوچ سمجھ کر تو کہہ رہی ہو نا؟ تو انابہ بولی کہ میری زندگی کا فیصلہ میرے ماں باپ کریں گے۔ پھر ممی نے بھی کہہ دیا کہ میرے بیٹے کو بھونٹی آس کیوں دلائی تھی؟ یہ بات سن کے تو انابہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، کہنے لگی کہ آپ اپنی بڑی تہمت مجھ پہ کیوں لگا رہی ہیں۔ آپ کو کسی نے یہ حق نہیں دیا۔ اب اگر آپ نے میرے کمرانے کے متعلق ایک لفظ بھی کہا تو میں آپ کی اور اپنی عمر کے فرق کو بھول جاؤں گی۔ اس لیے پلیز آپ ابھی اسی وقت ہمارے گھر سے تشریف لے جائیں۔ تھو نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بات ختم کی تو دوسری طرف موجود تیمور پہ سناٹا چھا گیا۔

”اپنے ماں باپ کا اتنا خیال کہ ان کی عزت پہ ایک حرف نہیں آنے دیا اور اس کی محبت؟ اس کی ماں کی عزت؟“ وہ درو کے طوفان میں گھرا ناچوچوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

”ہیلو بھائی!“ تھو کے پکارنے پہ وہ اک بو جھل سانس لیتا جیسے خود میں لوٹ آیا تھا۔

”ممی کہاں ہیں؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ”ممی میں نے سیلینگ پلو دے کر سلا دیا ہے۔“ وہ بو جھل لہجے میں بولی تو شیریں بیگم کی مسکراہٹ گری ہو گئی۔

”ٹھیک ہے میں تم لوگوں کی کل کی فکٹس کروا رہا ہوں۔“ اصرے سے کہہ کہ وہ تم لوگوں کو ایرپورٹ ڈراپ

کر کے خود بائے روڈ اسلام آباد پہنچ جائے۔“ اس نے
آن واحد میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا تو مرنے والوں کو
دیکھتے ہوئے انگلیوں سے کوکڑی کا نشان بنایا۔
”ٹھیک ہے بھائی! اپنا خیال رکھیے گا“ اللہ حافظ۔“
اس نے دھڑے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تو شیریں
نے قہقہہ لگاتے ہوئے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ انہیں
اب اتنی سی بھی پروا نہ تھی کہ تیمور اناسیہ کو فون کرتا یا
نہیں، کیونکہ انہوں نے بدگمانی کے ایک نہیں بہت
سے شیخ ہوئے تھے۔

پوزیشن ان کے بیٹے کے سامنے اور بھی مضبوط تھی۔
 ”تیسرا! اور دیکھو میری طرف“ اسے اشارہ
 لیے پر تو تیار دیکھ کے وہ بے حد غری سے بولیں تو
 نظریں جھکائے بے اختیار اپنا پتلا لب وانشاء سے
 گیا۔
 ”تمہیں اگر مجھ سے کوئی گلہ ہے تو بیٹا! اگلے سال
 میں تمہارے ہر سوال کا جواب دل کی میری جان
 اس کا ہاتھ تھامے وہ محبت سے گویا ہو میں تو تیسرا
 نظریں اپنے ہاتھ پہ بنے ان کے مشفق ہاتھ پہ
 ٹھہرس۔

نزداری سے کھل گئی تھی اندر چلا آیا تھا۔
پیشانی سے اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے اس نے
احسان صاحب کو تلاش کیا تھا مگر انہیں کہیں نہ پائے
اس نے پس سے گزرتے ایک لڑکے کو آواز دے کر
رک گیا تھا۔

بڑھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نگاہ ان کے مقابل کھڑے
تیور سے ٹکرائی وہ اپنی جگہ پہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔
”آپ تو آپ لوگوں سے بت سے شکوے، شکایات
کرنے کے لیے تھا۔ لیکن یہاں آکر رہنا چلا کسب“ وہ
قصداً بات ادھوری چھوڑ کے نظریں جھکا گیا تو احسان
صاحب تلخ لہجے میں بولے۔

چاہتا ہوں۔“ مگر مجھے یہ غلطی دوبارہ نہیں کرنی۔“ انابیہ کی سرور آواز اسٹڈی کی خاموشی میں گونجی تو تیمور بے یقینی سے اس کی طرف پلٹا۔

”تم اپنے اور میرے رشتے کو غلطی کہہ رہی ہو؟“ اس کی آنکھوں میں دکھ کی کیفیت بڑی واضح تھی۔

”نہیں! میں اپنی پرکھ اپنے فضلے کو غلطی کہہ رہی ہوں۔ رشتہ تو ہمارے درمیان کبھی کوئی تھما ہی نہیں۔“

”اور وہ رشتہ کیا ہوا جس کی بنیاد ہم نے عزت اور اعتبار پر رکھی تھی؟“

”وہ اسی روز اپنی موت آپ مر گیا تھا، جس دن اس عزت اور اعتبار کی دو جھیاں نکھیریں تھیں آپ نے۔“

”اپنی جان سے بھی بڑھ کے حفاظت کی ہے میں نے تمہارے اعتبار کی۔ ہاں لیکن تم نے میرے مان کو میری ماں کے آگے شرمندہ کر دیا۔ تم ایک اچھی بیٹی تو بن گئیں، لیکن تم نے میری محبت کے ساتھ بہت نا انصافی کی ہے انابیہ! وہ اسے انتہائی دکھ سے دیکھتے ہوئے بولتا اور انابیہ کے چہرے پہ پچھتاوے کے رنگ پھیل گئے۔

”کاش! کہ میں ایک اچھی بیٹی ثابت ہوئی ہوتی تو آج میرے دل پہ اتنا بوجھ نہ ہوتا لیکن شاید یہ میرے کیے کی سزا ہے۔ اس کیے کی جو میں نے ایک جھوٹے مرد کی کھلی باتوں پہ یقین کر کے کیا۔ جو اتنا خود غرض ہے کہ اسے آج بھی درد ہے تو صرف اپنی ماں کا اپنی محبت کا۔“ وہ اسے تنفر سے دیکھتے ہوئے بولی۔

تیمور اس کے شفاف چہرے پہ اپنے لیے اس درجہ بے اعتباری دیکھ کے سارکت کھڑا رہ گیا۔ جبکہ اس کے احساسات سے بے خبر انابیہ اسی زہر خند لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”کتنا مختلف سمجھا تھا میں نے عادل حسن سے آپ کو۔ مگر آپ تو اس سے بھی بڑھ کے کمزور نکلے۔ اس نے اور اس کے خاندان نے جو کچھ بھی کیا، سب کے سامنے کیا۔ لیکن آپ نے تو عزت کا دعوے دار بن

کے ہمیں بے عزت کیا۔ جان لے لی میری ماں کی اس سب کے بعد آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں اس میں سے کسی کو معاف کروں گی؟ آپ کی ماں کی بات میرے دل پہ لکھی ہیں۔“

”کون سی باتیں؟ کیا کہہ دیا تھا انہوں نے تمہیں یہی تاکہ میرے بیٹے کو جھوٹی اس کیوں دلائی تھی؟ تم نے تم نے کیا کہا؟“

خشمگین نظروں سے اسے دیکھتا وہ اس کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔ ”تم نے انہیں کہا کہ اگر آپ نے ایک لفظ بھی کہا تو میں آپ کی اور اپنی عمر کے فرق بھول جاؤں گی۔ تم نے میری ماں اور بہن کو اپنے غر سے نکال دیا۔“

”بالکل ٹھیک کہا۔ وہ اسی قابل تھیں۔“ اور تیمور جو اس کے منہ سے کسی بھی قسم کی تردید یا معافی سننے خواہشمند تھا۔ اس درجہ دھناتی پہ شاکتہ کھڑا رہ گیا۔

انابیہ احسان کا کون سا روپ تھا۔

”اپنے ماں باپ کا اتنا خیال کہ ان کے سامنے ہر حوالہ نہیں سننا تنگ منظور نہیں۔ کیونکہ ان کی عزت عزت ہے اور میری ماں میری بہن کی کوئی عزت نہیں؟ تمہیں معلوم بھی ہے میں نے انہیں کتنی مشکل سے اس رشتے کے لیے راضی کیا تھا؟“

تیمور نے اسے دکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہو نہ! جانتی ہوں آپ کی جھوٹی جی داستانیں۔ جو آپ نے اپنا مقصد پانے کے لیے گھڑی تھیں۔“

”اتنی نفرت اتنی بے یقینی۔ حیرت کی زیادتی کے باعث وہ بلی بھر کو خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مزید اس سے کیا کہے۔

”مجھے واقعی تم سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کم از کم میری خوش فہمی تو قائم رہتی۔“ اپنے دل میں اٹھتی نہیں کو دباتے ہوئے تیمور نے اس دشمن جال کی طرف دیکھا تھا۔

”لیکن ایک بات یاد رکھنا انابیہ! جدائی کا یہ فیصلہ تمہارا ہے، میرا نہیں۔ چونکہ میں نے تمہیں زبان دلی

کہی کہ تمہارا ہر فیصلہ میں خوشی قبول کروں گا۔ اس لیے میں تمہاری خواہش یہ اپنی خواہش سے دستبردار ہونا ہوں۔ میں ہمیشہ کے لیے خود کو تمہاری زندگی سے بے دخل کرنا ہوں۔“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا وہ ایک آخری نظر اس کے انجمنی وجود پہ ڈالتا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

شیریں بیگم کا سارا دن شدید اضطراب کے عالم میں گزرا تھا۔ ایک لمحے کو بھی ان کا وہ بیان تیمور کی جانب سے نہیں بٹا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اسے کال کر لیا تھا اور تیمور جو آج سارا دن شدید ڈپریشن کے عالم میں رہا تھا ماں کی آواز سن کے بری طرح بے چین ہو گیا تھا۔

”تیمور! کیا بات ہے بیٹا۔ تم اتنے الجھے ہوئے سے کیوں ہو؟“

”میں۔۔۔ میں آج انابیہ کی طرف گیا تھا۔“ وہ لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد دھیرے سے بولا تو شیریں کا دل دھک سے رہ گیا۔ جبکہ دوسری طرف وہ ان کی کیفیت سے انجان ہو جھل لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”اس کی امی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آج ان کا سوئم تھا۔“ اور شیریں کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کی اتنی محنت پہ پانی بھیرنے کی اطلاع دے دی ہو۔ ”تیمور تو یقیناً“ جذباتی ہو کر حیرت بھلانے کو تیار ہو گیا ہو گا۔

”اور۔۔۔ تمہاری ملاقات ہوئی ان لوگوں سے؟“ انہوں نے ہوشیاری سے مطلب کی بات پوچھی۔ تو تیمور کے لبوں سے اک سرور آ نکلی۔

”جس۔۔۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ نہ ہی ملا ہوتا تو اچھا تھا۔“

”کیوں؟“ اس کی بات پہ شیریں کا سارا جسم کان بن گیا تھا۔ جبکہ تیمور اسیں ہو جھل لہجے میں ساری بات بتاتا چلا گیا تھا۔ جس کے اختتام پہ شیریں بیگم پر شادی کر گئی تھی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

”کیا وہ اپنی ماں کی موت کے لیے ہمیں ذمے دار

تھہرا رہی ہے؟ اسے اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے تشرم نہیں آئی؟“ وہ مکاری سے بولیں تو تیمور اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”اچھا جی! پھر بات کروں گا اللہ حافظ۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”اللہ حافظ میری جان! اپنا خیال رکھنا! انہوں نے دل گرختی سے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کرتے ہوئے فون ایک جانب پٹچا تھا اور لپک جھپک نمو کے کمرے کی جانب بڑھی تھیں۔

”مسکراتے لہجے میں انہوں نے پوری بات اس کے گوش گزار کی تھی۔ لیکن اپنی کامیابی کی دھن میں وہ نمو کی خاموشی اور اس کے چہرے پہ پھیلتا ملال نہیں دیکھ سکی تھیں۔

دن، مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے تھے۔ اس دوران نمو کی شادی ہو گئی تھی۔ مگر شیریں بیگم تیمور کو ماہین کے لیے قائل نہ کر سکی تھیں۔ اس کی ذات ہر گزرتے دن کے ساتھ دیرانی کے ایک ایسے غول میں بند ہوتی چلی گئی تھی۔ جسے تو زمان میں سے کسی کے بھی پس میں نہ تھا۔

اس کی یہ تنہائی یہ ایسا نمو کے احساس جرم میں ہر لمحہ اضافے کا باعث تھی۔ وہ خود کو تیمور اور انابیہ کا مجرم سمجھنے لگی تھی۔

ادھر انابیہ کی زبان پہ دوبارہ کبھی تیمور منہاج کا نام نہیں آیا تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے لاہور کے ایک بہترین کالج میں جاب کر لی تھی۔ مومنہ نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کرنے کے بعد اپنا پوتیک کھول لیا تھا۔ انابیہ کے نزدیک زندگی مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن احسان فاروق کو اس کی جانب سے سخت تشویش تھی۔ مومنہ نے تو اپنی زندگی اپنے بچوں کے نام کر دی تھی۔ اس نے دوبارہ شادی کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا، مگر انابیہ کو وہ ہر حال میں اپنے گھر کا دیکھنے کے خواہش مند

ان کی یہ خواہش جلد ہی ڈاکٹر عمر کی صورت میں پوری ہوئی تھی۔ وہ ایک بڑھی لکھی فیملی کا خوبرو نوجوان تھا۔ انابہ کو اس کی والدہ نے ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔ انابہ نے ان دونوں کی پسند یہ خاموشی سے سرجھکا دیا تھا۔ وہ اپنی تاجدار سے ماضی میں اپنے گھر والوں کو ملنے والی اذیت کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔

اگلی صبح اتوار تھا۔ تیمور ساری رات جاگنے کے بعد اب کیس بارہ بجے کے قریب جا کے اٹھا تھا۔ شاور لینے کے بعد بھی طبیعت یہ بھائی کسل مندی دور نہ ہوئی تو وہ اٹھ کے نیچے لاؤنج میں چلا آیا تھا۔ جمال شیریں بیگم کے ساتھ منہاج صاحب بھی بیٹھنے والی دیکھ رہے تھے اس کے آنے پہ ملازمہ اس کی روئین کا ناشائستگی جوس لے آئی تھی۔

”مئی آپ ماموں کی طرف گئی تھیں؟“ اس نے جوس گلاس میں ڈالتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔

”نہیں وہ میں۔“ انہوں نے کڑبڑا۔ کر شوہر کی جانب دیکھا تو تیمور کی ہنسیوں تن گئیں۔ وہ بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔

”جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ جتنی جلدی ہو سکتے جا کے سارے معاملات طے کر لیں تو آپ گئی کیوں نہیں؟“ ان کی طرف دیکھتا وہ تندہی سے بولا۔ تو شیریں بیگم بھی قدرے ناگواری سے بولیں۔

”میں ثمو کی منتظر ہوں۔ وہ آئے گی تو ہم جائیں گے نا۔“ ثمو کے نام پہ تیمور بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”او فو می! آپ سمجھتی کیوں نہیں، میں کون سا بار ات لے جانے کے لیے کہہ رہا ہوں جو آپ۔“ وہ جھنجھاکر تیز لہجے میں بولا تو منہاج مرتضیٰ نے اسے تنہی لہجے میں ٹوک دیا۔

”تیمور! آئینول یور سیلف۔“ ان کے ٹوکنے پہ وہ

بے اختیار خاموش ہو گیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“ ڈاکٹر رائگ دو دو پو؟ وائے یو آر لی ہوئنگ سو اسٹریجی اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ غصے سے بولے۔

”آپ صحیح کہتے ہیں بلایا؟“ انہیں مجھے کیا ہوتا تھا؟

”ان کی طرف دیکھتا وہ مجھے سے لہجے میں کتنا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر پلٹ کر باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

شیریں فون پہ تمام رواد ثمو کے گوش گزار کر رہی تھیں۔ تیمور کے ناقابل فہم رویے نے انہیں واقعی بہت اب سیٹ کر دیا تھا۔

ان کی بات سن کے ثمو بے اختیار اک بوجھ سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔ تیمور اپنے دل سے لڑ کر خود ایک ان چار شتہ مسلط کر رہا تھا۔ ایسے میں جھنجھاکھ اور غصہ آنا تو فطری سی بات تھی۔

تو کیا تیمور ساری زندگی اسی طرح ناخوش رہے گا؟ اور کیا اس کے لیے اپنے اکلوتے بھائی کو اس طرح گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے دیکھنا آسان ہو گا؟ کیا انہوں نے جو کیا وہ اس کے لیے خود کو معاف کیا ہے گی؟ ان کے جھوٹ اور الزاموں نے ایک نیک عورت کی جان لے لی تھی۔ وہ محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے بدگمان کر دیتا تھا۔ وہ خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”مئی! میں آپ کو بعد میں فون کرتی ہوں۔ ابھی مجھے احمر کے ساتھ ہمیں جانا ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

ساری زندگی کے لیے بچتوں میں گھرنے سے باز تھا کہ وہ ایک آخری کوشش ضرور کرتی۔ پھر چاہے تیمور اسے جتنی بڑی سزا کیوں نہ دے لیکن کم از کم اسے یہ اطمینان تو ہو گا کہ اگر ان کی جدائی میں کچھ ہاتھ اس کا تھا تو انہیں ملانے کے لیے بھی اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

”نکل! میں تیمور منہاج کی بہن ہوں، ثمو۔ اور آپ سے بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔“ احسان فاضل ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے یہاں سے واپس بھیج دے یا اپنے محسن کی بہن سمجھتے ہوئے اس کی التجا قبول کر لیں؟

”تو یمنو! تیمور کیا ہے؟“ انہوں نے اپنے مخصوص شفیق لہجے میں کہا۔

”شوان کی مشکور ہوئی صوبے پر بیٹھ گئی۔“ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔“ ثمو نے دھیرے سے کہا تو کہہ میں موجود تینوں نفوس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ لیکن جس تیزی سے انابہ کے چہرے نے نگ بدلتا تھا وہ ثمو کی گہری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

”کیا ہوا ہے اسے؟ خیر تو ہے؟“ احسان صاحب نے پریشانی سے پوچھا تو ثمو دل میں ان کی اچھائی کی قائل ہو گئی۔

”جس جن کے شاید آپ کو اچھا نہ لگے انکل اور جھوٹ میں کہنا نہیں چاہتی۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”مطلب یہ کہ انہیں جب سے انابہ کی ممکنہ کاپتا چلا ہے وہ بے حد اب سیٹ ہو گئے ہیں۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے انابہ کی جانب دیکھا تو وہ ٹپلا بواؤتوں تلے دبائے بے اختیار نظریں جھکا گئی۔

”آپ بہت مت سمجھے گا کہ مجھے یہاں تیمور بھائی نے بھیجا ہے۔ انہیں تو میرے یہاں آنے کے بارے میں پتا بھی نہیں۔ میں تو خود یہاں آئی ہوں، انابہ سے صرف ایک سوال پوچھنے اور اسے ایک سچائی بتانے۔“ اس نے اپنے سابقہ لہجے میں کہا تو انابہ کی آنکھیں نہاچتے ہوئے بھی ثمو کی جانب اٹھ گئیں۔

”یہی سچائی؟“ مومنہ نے اچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے بھائی کی محبت کی سچائی۔ ان کی بے گناہی کی پکلی اور یہ سچائی کہ چار سال پہلے آپ کے گھر میں جو

کچھ بھی ہوا تھا میری ماں کا رچایا ہوا ایک کھیل تھا جس میں بعد میں میں بھی شامل ہو گئی تھی اور جس کی آج تک تیمور بھائی کو خبر نہیں۔“ بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بے اختیار بھرا گیا تھا۔ جبکہ وہ تینوں مارے حیرت کے گنگ بیٹھے اس کا چہرہ نکلتے رہ گئے تھے۔

”میں نہیں جانتی کہ اس حقیقت کے کھلنے کے بعد میرا بھائی پھر بھی رشتوں پہ اعتبار کیا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر آج میں نے حقیقت نہ بیان کی تو شاید میں اپنے بھائی کی بے رنگ زندگی کے لیے خود کو کبھی نہ معاف کر سکوں۔“ وہ بتے اشکوں کے درمیان بولی۔

انابہ نے مضبوطی سے صوفے کے بازو کو تھام لیا۔ ”میں نے جب مئی کے کہنے پر ان کا ساتھ دیا تھا تب مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ہمارا یہ جھوٹ آپ لوگوں کی زندگیوں میں کتنا بڑا طوفان لے آئے گا لیکن جب مجھے آپ کی والدہ کے انتقال کے بارے میں پتا چلا، اس دن مجھے احساس ہوا کہ ہم کیا کر بیٹھے تھے۔

ہماری غلط بیانی سے ایک شریف النفس ماں کی جان چلی گئی تھی۔ کئی ہشتے بے دل اجڑ گئے تھے۔ میرا اپنا بھائی اپنی بے اعتباری کو دل سے لگائے بالکل گم صم سا ہو گیا تھا۔ میرے لیے اتنے بوجھ کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ان کی اجازت زندگی اور انابہ سے ان کی محبت دیکھ کے میرا ضمیر مجھے ہر لمحہ ملامت کر رہا تھا۔ چار سال گزر گئے تھے مجھے اس خلص کے ساتھ زندہ رہتے ہوئے۔ جب کچھ دن پہلے اچانک ہمارا لاہور آتا ہوا تھا اور یہاں اسپتال میں انابہ کی کورواخل دیکھ کے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔“

انابہ کو اس حال میں دیکھ کے میں خود کو اس کے پاس آنے سے روک نہ سکی تھی۔ وہاں روم میں میری ملاقات انابہ کی بڑی بہن سے ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر مومنہ کی طرف دیکھا۔

”وہ سمجھی تھیں کہ میں وہاں تیمور بھائی کے کہنے پر آئی تھی۔ میرے پوچھنے پر انہیں بھی شاید میری لاعلمی کا اندازہ ہو گیا تھا، اس لیے وہ مزید کچھ کہنے سے بغیر کرے

سے نکل گئی تھیں۔ ان کے اندازہ میری الجھن بڑھ گئی تھی۔ میں نے گھر پہنچ کر تیمور بھائی کو فون کر کے اس بارے میں سوال کیا تھا اور تب انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انابہ اپنی کو لیگز کے ساتھ ٹریپ اسلام آباد آئی تھی۔ یہاں ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔ جس کی خفیہ انکوائری انہیں سونپی گئی تھی۔ وہ لحظے بھر کو خاموش ہوئی تو مومنہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”تیمور نے تمہیں بتایا نہیں کہ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“

”نہیں! انہوں نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“ وہ نشو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی تو انابہ نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

”مہی جان سے مجی بڑھ کے حفاظت کی ہے میں نے تمہارے اعتبار کی۔“

”میں ہر بات بھلا کرنے سرے سے ٹوٹا تعلق جوڑنا چاہتا ہوں۔“

”صاحب نے آپ کو اس وقت دفتر لے جانے سے منع کیا ہے۔“

”اور رشہ کیا ہوا جس کی بنیاد ہم نے عزت اور اعتبار پر رکھی تھی؟“ لکشی آوازیں ماضی اور حال سے نکل کر اس کے ارد گرد بکھر گئیں تو انابہ نے زور زور سے روتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اگر اسے بدگمان کیا گیا تھا تو تیمور کو بھی اس سے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی اسے یوں بے حال ہونا دیکھ کے مومنہ اور احسان صاحب نے سرعت سے اٹھ کر اسے تھام لیا تھا۔

”بابا! مجھے تیمور کے پاس لے چلیں۔ مجھے اس سے معافی مانگنی ہے۔“ احسان فاروق کا ہاتھ تھامے وہ دیوانہ وار روتے ہوئے بولی۔

”لے چلوں گا بیٹا! لے چلوں گا۔ تم حوصلہ تو رکھو۔“ احسان صاحب نے اس کے سر کو جھک کر چومتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ کیا بچہ نہ کہا تھا انہوں نے اس لڑکے کو مگر وہ پھر بھی ان کی عزت کا محافظ بن گیا تھا۔ ہر بات بھلا کر اس نے صرف اور

صرف اپنے فرض پہ توجہ دی تھی۔ وہ تو حقیقتاً اس کا بدلہ نہیں دے سکتے تھے۔

اور یہ لڑکی جس نے اپنے ماں بیٹی اور بھائی بہن کے رشتے کو داؤہ لگا کے انہیں ساری سچائی سے محروم کیا تھا اس کا بھی کوئی کم احسان نہ تھا۔ ان کی غم آنکھیں نمرو کی طرف اٹھیں تو وہ دھیرے دھیرے جلتے اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔

”انکل! مجھے معاف کر دیں۔ میں واقعی اپنی غلطی بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ بھڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔

احسان صاحب کا ہاتھ مشفق انداز میں اس کے سر پر آٹھرا۔

”نہیں بیٹا! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم نا سمجھ تھیں۔ تم نے جو کیا ماں کی محبت میں کیا۔ خدا تمہاری غلطی معاف کرے اور تمہیں تمہاری اس سچائی کا اجر دے۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا تو تمہارے آنسوؤں میں شدت دور آئی۔

”بہت شکریہ انکل! بہت شکریہ! میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔ آپ سے اب بس میری آخری التجا ہے، پلیز اسے رونہ بیچے گا۔“

روتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان بولی۔

”آپ پلیز۔ پلیز انابہ کی موجودہ معافی ختم کر کے اسے میرے بھائی کی زندگی میں شامل کر دیں۔ پلیز انکل! آئی ریکوسٹ یو۔“ مہی لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ احسان فاروق کے آگے جوڑ دیے تو وہ اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

”تمہیں شاید یہ سن کر عجب لگے، لیکن قدرت نے کام پہلے ہی کر چکی ہے۔ انابہ کا رشہ ابھی چند دن پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولے تو روئی ہوئی موجرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا؟ آپ۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں انکل؟“ اس کے لیے تو اپنے کانوں پر یسین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انابہ کو اپنے سینے سے لگایا تھا۔

”نہیں! لیکن تمہاری والدہ مومنہ نے پریشانی سے

کہا؟“ ان کی آپ فکر مت کریں۔ یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“ وہ ایک پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”جھا انکل میں اب چلتی ہوں۔ آپ بس اب میرے بھائی کا انتظار کیجیے گا۔ خدا آپ کو لوں کو، بیشہ خوش رکھے۔ اللہ حافظ!“

وہ جس طرح اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک اٹھ کر واپس چلی گئی تھی۔



وہ سب ڈانگنگ ٹیبل پہ بیٹھے ناشتے میں مصروف تھے جب تیمور کو اندر داخل ہوا تو دیکھ کے وہ سب چونک گئے تھے۔

وہاں سے مل کر باپ کو پیار کرنے کے بعد تیمور کی جانب آئی تو اس نے اٹھ کر اسے خود سے لگایا۔

”آپ کیسے ہیں بھائی؟“ بھانے کیوں اس کے سینے سے لگتے ہی نمرو کی آنکھیں بھٹکنے لگی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم سنناؤ؟“

نمرو نے ایک گہری نظر بھائی کے چہرے پر ڈالتے ہوئے سامنے بیٹھے ماں باپ کی جانب دیکھا اور پھر جیسے کی جیسے پہنچتے ہوئے تیمور کے برابر کرسی سنبھال لی۔

”اگلے رات میں سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آج صبح نکلتیں، شیریں نے خشکی سے کہا تو نمرو سچاٹ نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ اسے ایک ٹک اپنی جانب تکتا پائے شیریں نے اچھے کر پوچھا تو منہاج صاحب کے ساتھ ساتھ تیمور کی نظریں بھی شو کی جانب اٹھ گئیں۔

”آپ اتنی مطمئن کیسے ہو سکتی ہیں؟“ ان کی طرف دیکھتی وہ عجب سے لہجے میں بولی تو ٹیبل پہ بیٹھے بیٹن افراد اس عجیب و غریب بات پہ چونک کر اس کا ہوا دیکھنے لگے۔

”کیا مطلب؟“ شیریں نے حیرت سے بیٹی کی جانب دیکھا۔

”مطلب یہ کہ آپ نے جو کچھ بھی تیمور بھائی، انابہ اور اس کی فیملی کے ساتھ کیا اس کے بعد آپ اتنی مطمئن کیسے ہو سکتی ہیں؟“ وہ بیٹا کی جھجک کے دو ٹوک لہجے میں بولی تو شیریں بیگم کے چہرے پہ ہوا بیاں اڑنے لگیں۔ جبکہ تیمور حیرت زدہ سادوں کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

”کیا کیا کیا کیا رہی ہو؟“ شیریں نے گہرا کر ایک نظریے کو دیکھتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے نمرو کو گھورا تھا۔

”آپ مجرم ہیں تیمور بھائی کی۔ گناہ گار ہیں انابہ اور اس کے گھر والوں کی۔ ٹیبل پہ ہاتھ مارتی نمرو ایک جھٹکے سے کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی بات پہ جہاں تیمور کی پچھی پچھی سی بے یقین آنکھیں ماں کی جانب اٹھی تھیں وہیں منہاج مرتضیٰ بھی گہرا کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

نمرو کے تیمور انہیں سمجھا گئے تھے کہ آج وہ رکنے والی نہ تھی۔ اور شاید یہ اندازہ شیریں بیگم کو بھی ہو گیا۔ تب ہی تو وہ اٹھ کر دندانہائی ہوئی اس کے سر پہ جا پچھی تھیں۔

”کیا بتاؤ گی ماں! کیا بتاؤ گی؟“ انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب کیا تھا۔

”یہ کہ آپ نے نہ صرف تیمور بھائی سے جھوٹ بولا تھا بلکہ ان شریف لوگوں پر بھی۔“ اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کپاتی شیریں بیگم کا ہاتھ پوری طاقت سے نمرو کے گلے پر پڑا تھا۔

”کیا اس کرتی ہو۔ جھوٹ بولتی ہو۔“ وہ دیوانہ وار اس پہ جھپٹی تھیں۔

اس کے ارادوں کو بھانپ کر وہ غصے سے پاگل ہو اٹھی تھیں۔ جب منزل دو گنا گھر پہنچی تھی تو یہ توقف لڑکی انہیں شکست سے دوچار کرنے چلی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا سر توڑ کے رکھ دیں۔

”تمہیں یہ نہیں وہ تھی جو آپ نے انابہ اور اس کی ماں پہ لگائی تھی۔ جب آپ نے ان کی تذلیل کی تھی، انہیں آوارہ اور بد چلن کہا تھا۔“ روئی ہوئی نمرو

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL



- گرے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے

قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ توہی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک

بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے ڈسٹریبیوٹر

کے رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے سنی آڈراس

حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجوانے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آرئل آن جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

انابیہ کے ہاتھ کو آخری سہارے کی مانند دونوں ہاتھوں سے تھامے شیریں منہماچ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی گئیں۔

انابیہ اپنا بال واٹنوں تلے دبا گئی۔ اسے اپنے رب کے انصاف یقین آ گیا تھا۔

”مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تیمور سے منسوب کر کے جو کچھ بھی بولا سب جھوٹ تھا۔ وہ تم سے کل بھی محبت کرتا تھا اور آج بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے۔ تم اس کی اس بے لوث محبت کی خاطر مجھے معاف کر دو اور میرے بیٹے کی زندگی میں واپس آ کر میرے اس ملال کو کم کر دو۔ پلینر بیٹا! میرے تیمور کو سمیٹ لو۔ نہیں تو وہ ہمیشہ کے لیے بھڑ جائے گا۔“

بستے اشکوں کے ساتھ وہ التجائیہ انداز میں بولیں تو انابیہ کی بھیگی آنکھیں احسان فاروق کی جانب اٹھ گئیں۔ جنہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

”میں نے آپ کو معاف کیا آئی۔ اور میری دعا ہے کہ میرا اللہ بھی آپ کی غلطیوں کو معاف فرمائے۔“

شیریں نے چند لمحے اسے بے یقینی سے کٹنے کے بعد خود سے لگا لیا۔

☆☆☆

تیمور کا شکستہ وجود ہولے ہولے رانگ چیرے چھوٹ رہا تھا۔ شکن زدہ ملک الجاس، بڑھی ہوئی شیوا اور سرخ متورم آنکھیں اس کی ذہنی پراگندگی کا ثبوت تھے۔ ان دونوں میں نہ تو اسے بھوک کا احساس تھا اور نہ ہی نیند کا۔ اگر کسی بات کا ہوش تھا تو اپنے بال باپ کے دیے دھوکے کا اپنے رشتوں کے بکھرنے اور اپنے دل کے جہاں بہت درد تھا۔ بہت زیادہ درد۔

گھر والے اس کی منتیں کرتے اور دروازہ پیٹتے پیٹتے تھک چکے تھے۔ لیکن وہ بے حس بنا بیٹھا رہا تھا۔ اور آج چونکہ صبح سے اب تک کسی نے بھی اس کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا تھا اس لیے اس اس دھیمی سی دستک نے بھی سوچوں کے تانے بانے کو بکھیر کے تیمور کو

آپ لوگوں کے درمیان جدائی کی لکیر نہیں کھینچ سکتی تھی۔ نہ ہی وقت اور نہ خود انابیہ۔ میں نہیں جانتی کہ کیسے ہوا۔ لیکن انابیہ کی منگنی ٹوٹ چکی ہے اس رشتہ ختم ہو چکا ہے بھائی! اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے مرنے والی آئینہ کے میں کما تو تیمور سے اپنے انٹک بے یقینی سے تھمے گئے۔

اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے مرنے کی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا تو ساکت بیٹھا تیمور کتنی ہی اور غار میں نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔

اس کی حالت یہ منہماچ صاحب کا دل کٹنے لگا تھا۔ بے اختیار اس کے قریب چلے آئے تھے۔

”ہمیں معاف کر دو بیٹا! ہم نے تمہیں واقعی بہت دکھ بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے وہ دل گرفتگی سے بولے تو تیمور ان کی طرف بچے بنا آہٹکی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تو خود خالی ہاتھ ہوں۔ میں بھلا آپ کو کیا رہے پاؤں گا؟“ غیر مرنے لقطے پر نگاہیں جمائے وہ آہٹکی سے اپنے شانے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس کا گھر اہوا لاجہ ویران آنکھیں اور گھر ہوئے قدم شیریں منہماچ کے دل پر ثبت ہو گئے تھے۔

”یہ کیا کر رہا میں نے کیا کر دیا؟“ اپنے بیٹے کے وجود پر چھائی شکستگی دیکھ کے انہیں چار سالوں میں ہل بار اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

”مجھے معاف کر دو بیٹا! میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی ذات کے زعم میں کیا۔ اپنا مقصد پانے کے لیے میں نے کسی بات کی پروا نہیں کی، حتیٰ کہ اپنے بیٹے کے دل کی بھی۔ اپنی ذات اپنی دولت اور اپنی طاقت کا گھمڑا تھا مجھے کہ اس ایک احساس نے میرے بال تمام احساسات کو ختم کر ڈالا تھا لیکن میرے بیٹے کی دونوں ہاتھوں کی ہسوک پاس اور خاموشی نے مجھے تمہاری ہاتھ کی انت اور اس کی موت کی وجہ سمجھا دی۔ مجھے اس حقیقت کا احساس دلایا کہ میں کتنی بری ہوں۔ کتنی بری۔“

بھائی سے الگ ہو کے چلائی تو تیمور کی دھواں دھواں آنکھیں ہاتھ کے چہرے پر جم گئیں۔

اور پھر مہرہ جھوٹ، ہر وہ دھوکا اسے بتاتی چلی گئی تھی جو ان سب نے اسے دیا تھا۔ اور جسے سن کر تیمور بندھال سا کر سی ہے کر سا گیا تھا۔ اس دوران شیریں کی بھی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

”مجھے معاف کر دیں بھائی! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے نہیں پتا تھا ہمارے یہ جھوٹ، یہ الزام انابیہ کی امی جان لے لیں گے۔ ان کا غصہ بجا تھا۔ انابیہ کی ماں کو ہارٹ انٹیک می کی باتوں سے ہوا تھا۔ اس نے آپ سے راہیں جدا کرنے کا فیصلہ اپنی ماں کی موت کے بعد کیا تھا۔ اور وہ اس فیصلے میں حتیٰ بجانب تھی۔ بلکہ وہ کیا اس کی جگہ اگر کوئی بھی لڑکی ہوئی تو شاید محبت کی خاطر اپنی تذلیل تو بھلا دیتی مگر ایسے کسی بھی شخص کا ہاتھ تھامنے سے یقیناً صاف انکار کر دیتی جس کی ذات اور جس کا خاندان اس کی ماں کی موت کا سبب ہوتا۔ اس کے سامنے دوزخ تو بیٹھو وہ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے زار و قطار روئے ہوئے بولی تو تیمور نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

”کاش! کہ یہ سب جھوٹ ہوتا، غلط ہوتا، فریب ہوتا۔“

دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے۔ ماں باپ بہن وہ بھلا اب کس کو اپنا کہہ سکتا تھا؟ کس پہ دوبارہ اعتبار کر سکتا تھا اس کے حصے میں تو ہر طرف سے خسارہ ہی خسارہ آیا تھا۔

”میں آپ کی گناہ گار ضرور ہوں۔ بھائی! اگر میں آپ کو دکھ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں یہاں آنے سے پہلے انابیہ اور اس کی فیملی کو ساری سچائی بتا کر آئی ہوں۔ آپ کی بے گناہی کی گواہی دے کر آئی ہوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ سب ختم ہو گیا سب۔“ سر اٹھاتے ہوئے اس نے نمونہ کا ہاتھ جھٹکا۔

”کچھ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی

دروازے کی جانب دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی سابقہ بے نیازی سے نگاہیں پھیر لیتا۔ دلیز کے نیچے سے ایک گلابی لفافہ کمرے کے اندر سرک آیا تھا۔

دھیرے سے سیدھے ہوتے ہوئے تیمور نے اب کے گہری نظروں سے آف وائٹ کارپٹ پہ پڑے اس بلکے گلابی لفافے کو دیکھا تھا۔ اور پھر جیسے بے اختیاری کے عالم میں اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے جھک کر اپنے پیروں کے قریب پڑا وہ لفافہ اٹھا لیا تھا۔

بے چینی سے لفافہ کھولتے ہوئے اس نے اندر موجود پرچا نکال کر دھیرے سے کھولا تھا اور اس کی آنکھیں اپنے سامنے بکھری موتیوں کی سی تحریر پہ حیرت سے جم کے رہ گئی تھیں۔

”سوچو بدستگ و نالہ آسان نہیں
اپنا ہاتھ جلا لیتا۔ آسان نہیں
چل کر اپنے پاؤں سے
کھینا گرم شعاعوں سے۔ آسان نہیں

جیون کے ایک ایسے دور ہے پر کم صم سی کھڑی ہوں میں

ادھر مڑوں یا ادھر کوجاؤں اس الجھن میں پڑی ہوں میں

نئی ڈگر کو مڑ جانا۔ آسان نہیں

ٹوٹ کے پھر سے جڑ جانا۔ آسان نہیں۔“
واقعی ٹوٹ کے پھر سے جڑ جانا آسان نہیں، لیکن مجھے یہ ہمت یہ حوصلہ آپ کی بے مثال محبت اور وفائے دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی گزری ہر بات بھلا کے مجھے میری بدگمانی پہ معاف کر دیں گے۔ کر دیں گے نا۔“

تیمور کو لگا جیسے کسی نے اس کے درد سے تڑپتے ہوئے تڑھال دل کی ساری جلن، ساری تکلیف اپنی نرم پوروں پہ سمیٹ لی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور اپنے سامنے انابیہ احسان کو دیکھ کے مبہوت سا رہ گیا۔

”تم؟ یہاں؟ اس کی بے یقینی اسے فقط اتنا ہی کہنے دے پائی تھی۔

”جی، اور پوری عزت اور مان کے ساتھ لائی گئی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولتی ایک قدم بڑھا کے اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ تیمور منہاج کی پیاسی نگاہیں اس کے چہرے پہ جم سی گئیں، جبکہ اسے وارفتگی سے ملتی انابیہ کی اپنی آنکھوں میں یک لخت ڈھیروں آنسو اتر آئے تھے۔

”یہ اگر خواب ہے انابیہ! تو میری دعا ہے کہ میں ساری عمر اسی خواب میں گزار دوں۔“ اس قاتل کے قاتل خود خال کو تلکتے ہوئے وہ نمناک لہجے میں بولا تو انابیہ نے آگے بڑھ کے اس کا مضبوط ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”میں تیمور! اب یہ خواب نہیں ہے۔“ برستی آنکھوں کے ساتھ انابیہ کے لب دھیرے سے مسکرائے تو تیمور نے بھی غم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگا لیے۔

”اب چلیں اینچے سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اپنے ہاتھوں میں دبے اس کے ہاتھ کو انابیہ نے دھیرے سے چھپا تو تیمور کے پورے وجود میں ایک تناؤ سا آگیا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے انابیہ نرمی سے بولی۔

”کس نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں، ہمیں کچھ نہیں سننا۔ ہمیں ہر بات بھلا کر نئے سرے سے بس ٹوٹا تعلق جوڑنا ہے۔“

اور تیمور انابیہ کے منہ سے اپنا جملہ سن کے بے اختیار مسکرا دیا تھا۔ جس نے ”میں“ کی جگہ ”ہم“ کا لفظ استعمال کر کے اس کی چار سالہ ہر اذیت مٹا دی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ انابیہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا، جہاں ان کے سارے اپنے ان کے منتظر تھے۔



آدم کے ہر حکم

اس نے کب گزاری تھی زندگی سیاحت میں گھومنے پھرنے کی عیاشی۔ وہ کب گزری ایسے کسی تجربے سے مگر۔

اپنی اب تک کی زندگی میں اس نے کل تین اسٹیشن دیکھ رکھے تھے۔ لاہور اسٹیشن اسے یاد آیا۔ سب گاڑی سے اتر اپنے اپنے سامان کی فکر میں تھے اور وہ گردن اٹھائے گول گھومتے ہوئے چھت کی اونچائی کھوج رہی تھی۔ اتنے بہت سے لوگ گونجتے آوازیں اور ایک عجیب سی پراسراریت۔ ملگجائیم تاریک ماحول، مدقوق بلوں کی شرمسار روشنی اندھیروں پر حاوی ہونے سے قاصد۔

اور کراچی اسٹیشن، شور، لوگوں کا جھوم وہ پیدائش

ہرج پر کھڑی اپنی نگاہوں کی حد کو جانچ رہی تھی۔ سورج گرمی ہوا، آلودگی بدبو اور سرخ چوٹے میں قلی۔ چہلوں کے تاثرات آنسوؤں کی وجہ بتاتے تھے خوشی کے۔ اونہوں غم کے۔

ایک بار وہ ابو کے ساتھ ان کے کسی عزیز سے ملنے گئی تھی۔ وہ باپ، بیٹی اس ویران غیر آباد اسٹیشن پر اترنے والے واحد تھے۔ تاحد نگاہ کھیت۔ خاموشی ایک قلی، ایک اسٹیشن، ماسٹرور ایک تانگے والا اور اس کے قریب اپنے چھابے سے کھیاں اڑاتا امرد بیچنے والا۔

وہ حیران تھی۔ اس کی حیرت پر ابو مسکرائے تھے۔ اس کاگا، تھیتھیا تھا۔

مکہ بابل



دین

ماہنامہ
جنوری 2013 سال نو نمبر شائع ہو گیا

”بیاد ابن انشاء“

سال نو کے موقع پر معروف شخصیات اور قارئین سے سروے

اداکارہ ”سہوانی علی ابرو“ سے ملاقات

سال نو پر کرن کا نیا سلسلہ ”میری بھی سنی“ اس ماہ

”دست کو زہر“ فوزیہ یاسین کے سلسلے وار ناول

”زہر دل“ نبیلہ عزیز کے سلسلے وار ناول کا آخری حصہ

”ساڈا چڑیا دا چنبا“ فیض سعید کا مکمل ناول

میرا شریف طور کا مکمل ناول ”وہ ایک لمحہ محبت“

ریحانہ امجد بخاری، رفعت سلطانی، حیات بخاری کے ناول

میمونہ صدف، بشری احمد، روبی نور النساء، فرحین اعظمی، فرخ طاہر قریشی

اقراء شفیق، جتنا نذر سعید، مجید بخاری کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان شمارے کے ساتھ کرن کتاب

سال نو کے موقع پر بہنوں کی دلچسپی کے لیے شخصیت کے اسرار بخوشی

کرن کتاب

”خود کو پہچانیں“

کرن کے شمارے کے ساتھ ملت پیش خدمت ہے۔

اس نے یقیناً ”جواب نہیں دیا تھا یہ شاید خود کلامی
تھی۔ مگر مقابل کو یکدم اس میں بے پناہ دلچسپی محسوس
ہوئی۔

بدرواتی۔۔۔ خود سے ہم کلام ارد گرد سے نا آشنا لڑکی
پھر پھر بیٹھ کر بے آواز اور پھر ہچکیوں سے روتی

لڑکی۔۔۔
”خفا، خوف، زہ، ہمار، خود کو کپڑوں کرتی۔۔۔ خوب

صورت لڑکی۔۔۔
اور پھر بچوں کی طرح گول گھومتی۔۔۔ پھر اچانک

فلسفی بن جانے والی لڑکی۔۔۔
انتنا زیادہ چلنے سے جسم میں گرمی بھر گئی۔ ٹپا اتارتے

ہاتھ ایک فوری خیال کے تحت رک گئے۔ ”میں ابھی
نہیں۔۔۔ بلا وجہ ہی۔“

”جب دل جی بھر کے خوش ہو لیں تو سامنے
آجائے گا ویسے اب جب آپ کو یہاں رہنا ہے تو ہر

روز ایک نیا اسرار کھلنا جائے گا۔ میں کسی کو بھیجتا ہوں
سلمان اٹھانے کے لیے۔“

وہ چونک کر اور پھر جھل ہو کر واپس پٹی تھی۔
”ویسے آپ بہت ہی کم سلمان لے کر نہیں آئیں

ڈاکٹر ایتل عفاطہ۔۔۔“
وہ فوری جواب دینا چاہتی تھی کہ وہ ڈاکٹر ایور پر نارنگ

مگر۔۔۔ ہاں میں۔۔۔
”مم۔۔۔ میرا نام۔۔۔ میرا نام۔۔۔ کیسے؟ بیلو آپ

کون؟“ وہ تیزی سے آگے بڑھی تھی۔

”بے وقتنی مت کرو۔۔۔ کراچی جیسے بڑے شہر کو
چھوڑو تم دور پس ماندہ علاقے میں کیا کرنے جا رہی ہو۔

”بب۔۔۔ ب۔۔۔ بندر؟“
”بب۔۔۔ نہیں۔۔۔ صرف بندر۔“ جناب کی
آنکھوں میں ہنسی کا عکس نمایاں تھا۔

”آپ چھوڑیے۔۔۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“
”ہاں تو آپ کو خود ہی چلنا پڑے گا۔۔۔ میں نے کب

کہا کہ بیگ کے بعد میں آپ کو بھی سر پر بیٹھا ہوں گا۔“
آنکھوں کی ہنسی اب لمحے میں بول پڑی۔

وہ بری طرح جھینب گئی۔ مونہ کپڑوں کی تہ اپنی
جگہ مگر سامنے موجود شخصیت کا تاثر بہتر ہو جا رہا تھا۔

درازد چوڑے شانے اور یقیناً ”تعلیم یافتہ“ مہذب عمر
۔۔۔؟ ہاں عمر۔۔۔ بیگ مین ہی ہو گا۔ پہاڑوں پر لا کھی

لے کر نرے سے چلتا۔ سر پر بیگ۔
اب ڈھلوان پر فاصلہ یقیناً ”زیادہ تھا مگر اترتا آسمان

تھا۔ نیلا آسمان سفید و سرخ عمارت اور ارد گرد پھیلی
گھاس روشنی نے منظر واضح کر دیا تھا۔ اسے بہت

دور پہاڑ دکھائی دیے جو آسمان کے سروں سے ہم
آغوش تھے۔ وہ محسوس ہی رہ گئی۔ پہلی بار سفر کی تمام

تکلیفیں سوچوں کی آفتابیں جیسے فراموش کر دی گئیں۔
وہ ڈھیلے ہاتھوں سے بیگ زمین پر چھوڑ چار جانب گھوم

گئی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی کرنیں نمایاں ہو گئی
تھیں۔

”پہلی نظر میں یہ مناظر اسی طرح محسوس کر دیتے ہیں
مگر اللہ نے انتہا حسن نواز نے کے بعد بھی ان کے اندر

”باندھ لینے“ کی صلاحیت نہیں رکھی۔ لوگ آتا
جاتے ہیں بھاگ جاتے ہیں اور خاص طور پر شہروں

کے لوگ فیسٹی نیٹ تو ہوتے ہیں مگر جڑ نہیں
پاتے۔“

”شہر یا گاؤں کی بات کب ہے۔ یہ تو دل کی بات
ہے۔ جسم دل کے تابع ہوتا ہے۔ ورنہ قدموں کی کیا

بساط۔۔۔ دل بھر جائے تو ویرانہ بے آب و گیاہ۔۔۔
دھرتی بھی گلستان بن جاتی ہے۔۔۔ مارے دکھ

سارے دردوں کے ہیں۔ دل سے ہیں۔
بات دل کے خوش ہونے کی ہے۔“

گئی اپنے چہرے کو پونچھ لیا اور اوپر موجود عورتوں کو دیکھ
ہاتھ ہلانے لگی۔ نووارد اسے تھانہ سمجھے۔ وہ سب کو
جاتی ہے یہ اس کی جانب سے پہلی بار سپاس تھا سو

اوپر بچے شور کرتے اچھلتے لگے مگر اسے حیرانی کا جھٹکا
لگا جب موصوف نے بھی ہاتھ ہلایا۔ ”ارے!“

اسے جلد از جلد ہاسپٹل تک جانا ہو گا۔ اس نے
ایک بار پھر فاصلے کو کھوجا۔

”ایسے اڑیاں اٹھا کر ہاسپٹل کبھی نظر نہیں آئے گا
آپ کو ابھی بہت چلنا ہو گا۔“

”آپ کو کیسے۔۔۔ پتا چلا کہ۔۔۔ کہ۔“
”یہ سڑک اسپتال تک ہی جاتی ہے۔“

”کیا پتا مجھے کہیں اور۔۔۔ اور جانا ہو۔“
”لو خواہو۔۔۔ پہاڑ پر چڑھ کر بیکار چرائیں گی تو

بی بی بیکار کہاں ہیں یا اسکا لی ڈرائیونگ کرنی یہاں
سے بھائیں گی اور نیچے کھائیوں میں چپ لگائیں گی

اور یہ نانگا پریت؟ آپ کے ہاتھ میں آپ کا روٹ تو
بالکل غلط ہے۔ ارادہ کیا ہے؟“

مقابل کی آواز بارعب، خوب صورت اور لہجہ
مہذب تھا۔ وہ عمر کا اندازہ نہیں کر سکی۔ اس نے اپنے

بیگ کا منہ پلٹ دیا جس کے ٹرائس پیرنٹ حصے سے
نانگا پریت کا چمک دار سرورق نمایاں ہو رہا تھا۔

وہ چل پڑی تھی اور اس کا ٹائٹل والا بیگ اونچے
نیچے رستے پر ڈھب کھڑب کھڑ وہ آواز سے اچھلتا تھا۔

”یہ بیٹھو ڈرائیور پورٹ نہیں تھا کہ آپ اتنے
اشانفٹس بھیگنے کے ہمراہ آئیں۔ یہاں لوگ گھڑلے

کر آتے ہیں یا تو اسے کمر سے باندھتے ہیں یا پھر۔۔۔ سر
پر رکھتے ہیں ایسے۔“

جملہ مکمل کرتے ہی اس کے ہاتھ سے ہینڈل
جھپٹ بیگ ان کے سر پر تھا۔

”ارے۔“
”چلیے اب مگر یہ لاٹھی پکڑ لیں۔۔۔ راستے میں کبھی

کھار بندر اچھل کر سامنے آتے ہیں تو انہیں بھگایا جا
سکتا ہے۔ بھگادیں گی ناں۔۔۔“

خدمت خلق انسانیت مدد پکارے۔ سارے دعوے اپنی جگہ مگر کیوں ایسا کام کیا جائے یہ تو اپنے ہاتھوں مرنے والی بات ہوتی ناں۔ کیے کرائے پر پائی۔ ہونہ۔

”سب فئز اکٹھا کرنے کے بہانے ہیں۔ ہوں گے چار کرے اور آٹھ بیٹے۔ باہر ڈاکٹر ایکسے آنکھوں ہی سے کرتے ہوں گے اور الزا ساؤنڈ قیافے سے۔۔۔ اول تو مشین ہوتی نہیں اور ہو تو استعمال نہیں کرتے۔“

”پتا نہیں ڈاکٹر اتباع آپ کیا سوچ کر جاری ہیں۔ بجلی کے مسائل کیسے، آمدورفت۔۔۔“

”آپ غلط کر رہی ہیں۔ سراسر بے وقوفی۔“ اور وہ متزلزل ہو گئی تھی۔ مگر اس کے پروفسر ڈاکٹر نعیمی نے ڈھارس دی۔

”میں جانتا ہوں ڈاکٹر عثمان غنی کو ذاتی طور پر وہ صاف گو، با اصول اور محنتی شخص ہیں۔ بہت رانا خواب تھا ان کا اپنے آبائی علاقے میں رہائش رکھنا طبی سہولیات فراہم کرنا۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو غیر نہیں دیکھا مگر مجھے یقین ہے سب کی رائے اپنی جگہ۔۔۔ لیکن میرے اپنے خیال میں اگر تم چند سال بھی ایسے کسی علاقے میں پریکٹس کر لو گی تو ہمارے لیے بہترین رہے گا۔ معاوضہ یقیناً کم ہو گا لیکن تجربہ بہت اعلیٰ اور پھر موسم و ماحول کی تبدیلی اگر تم انٹرنل ہو تو چھوڑ دو کی کا جستج میں ایک کال کر دیتا ہوں۔“

”نہیں سراسر وہ جوان کا حرف حرف دل سے سن اور سمجھ رہی تھی۔ جملے کے اختتام پر پڑھ رہی تھی۔

”معاوضہ۔۔۔ تبدیلی۔۔۔ تجربہ۔۔۔ ہاں تبدیلی سے حاصل تجربہ۔۔۔ یوں ہی سہی۔۔۔ تھوڑا پر چینل ٹھیک رہتا ہے۔“ وہ بولی۔

پروفیسر صاحب خوش ہوئے۔
”دیش ویری گڈ بٹ میں کال ضرور کروں گا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔“

”انہیں اچھی ڈاکٹر چاہیے۔“ اس نے اپنی دلی حالت پر لعلت بیچ مختلف شکل ظاہری۔

”اچھے ڈاکٹر تو بہت ملتے ہیں۔ اچھا انسان ہونا ناہم ہے۔“

اب پتا نہیں اسے یہاں کیا خطاب ملتا۔ اندرونی عمارت اور ماحول بالکل ویسا تھا جیسا کسی بڑے شہر کے اسپتال کا ہو سکتا تھا ہاں باہر جھانکتے تو ہریالی نیلا امبر اور آسمان سے ہر کلام پہاڑ دیکھ کر یاد آتا تھا۔

”کہاں ہیں۔“
”آپ کو موسم چھینا ہو گا۔“
”میں جمیل لوں گی۔“ اس نے پہلی تنبیہ پر خوش دلی سے کہا۔

”شروع شروع میں لینکونج پر ایلم ہو سکتا ہے لیکن دھیرے دھیرے یہاں پشتو ہزارہ ہند کو اور پہاڑی۔۔۔“

”میں ہزارہ اور ہند کو بلکہ کسی حد تک پشتو بھی سمجھ لیتی ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

”ارے۔۔۔ یہ تو بہت اچھا ہے مگر کیسے۔۔۔؟“
”کانج۔۔۔ میں میری کچھ دوست تھیں۔ وہ آپس میں گفتگو کرتی تھیں تو۔۔۔“

”آپ کی ساری ڈگریوں پر حاوی آپ کی یہ لینکونج والی ڈگری رہی۔۔۔ اشتہار دیتے وقت یہ چیز سب کے مد نظر تھی کیونکہ مریض اپنی کیفیت سمجھا نہیں پاتا اور ڈاکٹر الگ مصیبت میں۔ سواکٹر ڈاکٹر اس لیے بھی بھاگ جاتے ہیں۔“

وہ مسکادی۔
”جذبہ سولائٹر پر ایلم تو نہیں ہو گی۔“

”ہو بھی تو کوئی بات نہیں۔ روشنی اور اندھیرا زندگی کا حصہ ہیں۔“ وہ آستلی سے گویا ہوتی تھی۔

”اندھیرا کوئی مسئلہ نہیں۔“
”کھانا آپ خود بھی پکا سکتی ہیں۔ ورنہ پانڈا بی جو پکائیں، کھانا پڑے گا ہم سب تو عادی ہیں۔ اب آپ۔۔۔“

”میں بھی عادی ہو جاؤں گی۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہوتا ہے۔“
وہ تسلیم کی پتلی بنی کھڑی تھی سب کچھ مانتی بلاچوں

جہاں حاضری ہاں مگر نہیں۔ آخری گروہ یقیناً اس کا کمرہ تھا۔ دیوار جتنی بڑی کھڑکی نے اس کی توجہ کھینچ لی وہ بے ساختہ کھڑکی کے پاس جا پہنچی اور پٹ وار کر دیے خوب صورتی نظروں کو

چہرہ کھڑکی وہ اس سحر میں غرق ہی رہتی جو سردی، کچی طاری نہ کر دیتی دانت بجے تو احساس ہوا۔
”یا اللہ! اس نے ہاتھ بخلوں میں دیے ہو ابال اڑائے رہی تھی۔“

ڈاکٹر شاہان نے تیزی سے آگے بڑھ کر پٹ بند کر دیے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

”بند تیشوں کے ساتھ بھی نظارے کیے جاسکتے ہیں کبھی ہوا تو کبھی بارش اور کبھی برف اور دوسری منزل پر تو ہوا کی شدت بھی زیادہ ہوتی ہے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پہلی بار کمرے کا جائزہ لیا۔ پہلے تو دیوانہ وار کھڑکی کی جانب لپکی تھی اب ارد گرد دیکھا تو۔۔۔

یہاں دو بیڈ تھے اور چھت سے لگی دیوار گیر الماریاں۔ کمرہ خاص بڑا تھا ایچ جاتھ۔۔۔ اور بائیں جانب ماربل سلیب پر چائے بنانے کا سامان اور چھ ڈبے اور برتن۔۔۔ الیکٹرک کھنڈ۔

اس کمرے کا دو سرالمین۔۔۔ کون تھا؟
”میں بھی اسی کمرے میں رہوں گی آپ کے ساتھ۔۔۔ ہم روم میٹ ہیں۔ سمجھیں۔“

ڈاکٹر شاہان نے اس کی الجھن سلجھائی تھی مگر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔

”ہپ۔۔۔ ہپ۔۔۔ پلیز۔۔۔ کیا میرے لیے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ مجھے علیحدہ کمرہ نہیں دیا جائے گا؟“

”کیا آپ کو علیحدہ کمرہ چاہیے۔ یہ تو پہلے دن سے طے تھا کہ نئے ڈاکٹر یہاں اس روم میں۔۔۔“
”کس نے کیا تھا۔۔۔؟“ اس کے منہ سے نکلا

ڈاکٹر شاہان گڑبواٹیں ”کسی نے نہیں مگر۔۔۔ اچھا اب آج یہاں سب سے کل صبح بات کریں گے۔ دراصل کنسرکشن تو ہو رہی ہے اسپتال میں توسیع

ہوتی رہتی ہے۔ مگر ابھی۔“
”پلیز مجھے علیحدہ روم ہی چاہیے ہو گا۔ مجھے عادت نہیں رہی۔۔۔ میرا مطلب عادت نہیں ہے۔“ وہ ہتھیلیاں ملتی بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کی الجھن۔۔۔ اضطراب۔

”یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے ڈاکٹر اتباع۔۔۔ کل ہی حل کر دیں گے۔ ویسے میرے ساتھ رہنا اتنا پریشان کس ہرگز نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔ میں خزانے نہیں لیتی ہوں۔“

ڈاکٹر شاہان کا لہجہ شریر ہوا۔
اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر شاہان نے نیا کبل نکال کر اس کے بیڈ پر رکھتے ہوئے کن اکھوں سے اس کے مضطرب چہرے کو دیکھا۔

وہ بہت کم عمر، معصوم چہرے والی راضی برضا معصوم لگی تھی۔ پھر اتنی الجھن اور شدت وہ شانے اچکا کر رہ گئیں۔

تین دن تک شدید بخار میں مبتلا رہنے کے بعد آج طبیعت بہتری کی جانب سائل تھی۔ منہ کا ذائقہ خراب تھا اور پانڈا کے ہاتھ کے کھانے بہت بد ذائقہ۔ وہ چکن میں موجود ہر شے کھانے کے ساتھ گھول کر خوب صورت کراکری میں سجا کر خیرہ پیش کش دیتی تھی۔

”لوگ کیا کہیں گے یہ کہاں کی ڈاکٹر۔ آتے ہی خود بیڈ سنبھال لیا۔“ اس نے بہت شرمندگی سے ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی ڈاکٹر شاہان کو دیکھا جو شانے سے ٹھوکر مار دوڑا نہ پھیرتی مسکرا رہی تھیں۔

”لوگوں نے ڈاکٹر انسانوں ہی میں سے چنا تھا نا کہ جن بھوت یا روٹ ڈاکٹر۔“

”آپ یہ کیا اٹھا لائیں۔ دل نہیں چاہ رہا۔ کچھ بھی کھانے کو۔“

”بالکل دل نہیں چاہتا ہو گا۔ مگر وہ پانڈا بی کی

پکوان تھے اور یہ میں اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی ہوں سوپ اور سینڈویچز۔ ہمراہ سچا آپ۔“

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

”میں تو ڈاکٹر غنی سے مل ہی نہ سکی۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔“

”وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہے بلکہ وہ تو یہاں تھے ہی نہیں۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی لوٹے ہیں۔ ادھر بس لڑھک گئی تھی۔ راستے اتنے مشکل تھے کہ بس۔۔۔ اب دیکھو شام میں بالکل صبح ملاقات ہوگی۔“ ہاں میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم الگ الگ روم چاہتی ہو اب کل۔۔۔“

”میں نے اپنا سامان اس الماری میں سیٹ کر دیا ہے۔ اس نے وہی آواز میں کہا۔

”لیکن! یہ کیوں؟ اگر تمہیں سپیوٹ روم چاہیے تو پروائیڈ کیا جائے گا تو پرائیوٹ؟“

”اس اوکے ڈاکٹر غنی! وہ بدقت مسکرائی۔

”ایک بات کہوں ڈاکٹر اتباع! آپ نہایت غیر مناسب کپڑے لائی ہیں۔ لان اور کائن۔۔۔ نہیں چلے گا۔“ وہ اس کے کپڑے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”میں نے جان لیا ہے۔ میں خرید لوں گی۔“

”تین دن سے تو تم کبل میں ہو۔ باہر موسم رنگ دکھا رہا ہے۔ تم موسم برداشت کر لو گی ناں۔“

”برداشت۔۔۔“ وہ فریال برداری سے سر جھکا گئی۔

موسم برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ۔۔۔ رویے؟ رویوں کی سردمی، لہجوں کی تپش روح کو جھلسا دیتی ہے اور لہجوں کی ٹھنڈک۔۔۔ انسان اکڑ جاتا ہے برف میں لگی لاش کی مانند۔

”اور اتنا دھیر کتابوں کا اور رسائل کا۔۔۔ اتنا بڑا ٹریک دیکھ مجھے تسلی ہوئی تھی بلکہ سب ہی کہہ رہے تھے یہ ڈاکٹر صاحب بھاگنے والی نہیں ہیں۔“

وہ مسکرا دی۔

”جی جگہ کی وجہ سے خاموش ہو۔ بیماری کی نقاہت ہے یا ایسے ہی خاموشی پسند ہو، کم گو۔۔۔“ ڈاکٹر شاہان بیڈ پر تنگ گئیں۔

”میں نے کبھی۔۔۔ اس بارے میں سوچا نہیں۔“

اب اسے کوئی جواب تو نہ تھا۔

”وہ میرا ذاتی خیال ہے۔ کتابوں میں گم رہنے والے لوگ انسانوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ انسانوں سے بچتا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے آپ میں گم۔۔۔ بہت بڑے جھوم میں بھی ایک کتاب کے سارے اکیلے۔۔۔ تھا۔

مجھے انسان کے یہ بھونڈے سہارے پسند نہیں۔ انسان کو انسان کا دریا ہونا چاہیے۔۔۔ گفتگو، باہم ملاقات، ہمسی، رونا لفظوں کی گہرائیاں انسان کی دوستی آنسوؤں کو بہنے کا راستہ دیتی ہے۔ اور پھر پوچھنے کے لیے ہاتھ بھی بڑھاتی ہے۔ مجھے کتب بینی پسند نہیں۔ میں ہمکلام ہونے کو ترجیح دیتی ہوں۔“

اتباع فاطمہ کو ڈاکٹر شاہان کے جملوں پر بہت سے اعتراض تھے وہ کتاب دوستی پر ایک گھنٹی کی تقریر کر سکتی تھی۔ مگر ان کے چند جملے بہت سچے لگے تھے۔ آپ جیسے۔۔۔

”کتاب پڑھنا تو بہت اچھا ہے اور۔۔۔“

”میں کتاب پڑھنے کو بے برا کہہ رہی ہوں۔“ وہ جان چھڑانے والے لہجہ میں بولیں۔

”میں تو ان لوگوں کی بات کر رہی ہوں جو کھلی کتاب چرے پر ڈال ارد گرد سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔“ ان کے کنبے میں چونکنے والا اتار چڑھا تھا۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

”بس میں خدمت خلق کے لیے یہاں رہتی ہوں سالوں سے۔ اور رہتی رہوں گی۔“ نرم روی سے مقابل کو ہمت دیتا بچہ دم کٹھور ہو گیا۔

اتباع خاموش رہ گئی۔ وہ بلاوجہ سوال پوچھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ دونوں دنوں بعد نکلی گئیں سے لپٹی دھوپ کو سینٹنے یہاں کے میدان میں بیٹھی تھیں۔

”اور یہی میرا بچ ہے۔ اور یہی جھوٹ بھی۔“

”یہ کیا بات ہوئی! وہ چونکی۔

”اور تمہارے لیے بھی ضروری نہیں کہ تم سچ بتاؤ کہ تم اتنا بڑا شہر بہترین تعلیمی ریکارڈ اور بہت سارے مواقع کو چھوڑ یہاں سطح سمندر سے اتنے اونچے علاقے میں کیا کرنے آئی ہو۔۔۔ جو بھی بتاؤ گی ہم یقین کریں گے۔“

اس نے جملے کی تلخی پر چونک کر ڈاکٹر شاہان کا چہرہ دیکھا اور بھر کھونچنے کی کوشش کی۔

وہ سفید رنگت کے ساتھ بے حد تھکے نقوش کی مالک تھیں ہری آنکھیں یا نیلی یا کوئی درمیانی حالت کا رنگ۔ بال گہرے سیاہ۔۔۔ مگر انہیں سیدھا سیدھا ہانا کر گردن پر جوڑنے کی صورت کس دیا جاتا تھا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ مگر اپنے ظاہری چلنے سے انہیں دیکھ بھلا گمان ایک سنجیدہ و متین خاتون کا آتا تھا۔ سویرے جگے رنگ سویرے ڈینٹ کٹ کے شلوار قمیض۔ بے آواز جوتے۔

اس نے بہت سنجیدگی سے سوچا کہ اگر وہ اپنے ظاہری چلنے میں ذرا سی تبدیلی کریں تو بہت کم عمر اور حسین ترین معلوم ہوں۔ حسین تو خیر اب بھی تھیں۔

”اب کس سوچ میں گم ہو گئیں۔۔۔“ ڈاکٹر شاہان نے چائے کی پیالی پر اپنی انگوٹھی بجا کر متوجہ کیا۔

آل۔۔۔ ناں۔۔۔ ہمیں کیس نہیں۔۔۔ بہت سے سارے جملے، حالات روئے جو اس کے فیصلے کا باعث تھے فلم کی طرح نگاہوں سے گزر گئے تھے۔

”دراصل ڈاکٹر شاہان۔۔۔ میرا جھوٹ جان دار نہیں ہو گا اور سچ شاندار نہیں ہو گا لیکن بس اتنا جان لیجئے کہ فیصلے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ مجھے لگا کہ اب شاید مجھے لوٹے لنگڑے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میرے قدموں میں اتنی سکت آگئی ہے کہ میں خود سے کھڑی رہ سکتی ہوں۔

اور میں نے زندگی سے یہ بھی سیکھا کہ اگر آپ پورے قدم سے کھڑا رہنا چاہتے ہیں تو پھر قدموں تلے زمین اپنی ہونی چاہیے۔ آپ سمجھ لیں۔ میں اپنے جسم کی جگہ ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی ہوں۔ بس۔

آئی ایم سوری ڈاکٹر شاہان۔۔۔“ وہ چونکی تھی اور واپس پلٹی۔

”ہر جگہ دکھڑے کھول کر بیٹھ جائیں غم کو رونا شروع کر دیں تو ہمدردیاں سمیٹنے کی عادت بڑھ جاتی ہے خوشی خود اعتمادی اور توکل کے لیے دامن تنگ پڑ جانا ہے۔۔۔“

وہ چھکی مسکراہٹ سے ڈاکٹر شاہان کو دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

”آپ کو یہاں آئے پانچ روز ہوئے اور ہماری ملاقات اب ہو رہی ہے۔ امید کرتے ہیں۔ آپ کو کوئی براہم نہیں ہوتی ہوگی۔ ویسے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“

”میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں شاید سفر کی تھکان تھی۔ بٹ ناؤ ایوری تھنگ از آل رائٹ۔“ وہ اسپتال کے مالک مسیٹر ڈاکٹر سرجن عثمان غنی کے کمرے میں براجمان تھی۔ گرے بالوں کے ساتھ بے حد سلمانی شخصیت والے ڈاکٹر غنی اسے پہلی ہی نگاہ میں بے حد پسند آگئے۔ وہ غیر محسوس مسکراہٹ سے آنکھوں میں نرمی کا تاثر لیے اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کی شخصیت کا تاثر سارے کمرے پر حاوی تھا۔ حالانکہ وہ اب تک سلام کا جواب دینے کے علاوہ ایک لفظ بھی نہ بولے تھے۔ اس کی گفتگو ڈاکٹر غنی کے بیٹے ڈاکٹر غازی سے ہو رہی تھی۔

”تو آپ نے راستہ بھی تو اس قدر خطرناک چنا تھا۔“

”میں نے کچھ نہیں چنا تھا نہ چھنے کا موقع دیا گیا۔ سیدھے راستے پر لینڈ سلائڈنگ کا معاملہ تھا سو میری فریڈ کا ڈرائیور مجھے اس راستے سے چھوڑ گیا۔“

”تو اسپتال کے گیٹ تک چھوڑ کر جانا چاہیے تھا یہ کیا کہ ایک موٹر پھوڑ کر کہہ دیا۔ سیدھے چلے جاؤ آخر میں منزل ہے۔ دس انڈن فیس۔“

ڈاکٹر غازی کے چہرے پر ناپسندیدگی تھی۔

”بہر حال ہمیں خوشی ہے کہ آپ بخیریت پہنچی ہیں اور اب ٹھیک ٹھاک ہیں۔“

”چائے لیجئے۔“ ڈاکٹر غازی نے چائے کا کپ بڑھایا۔

ڈاکٹر عثمان غنی نے چائے نہیں لی۔ وہ گرم پانی میں کچھ جڑی بوٹیوں کو بھاپ دینے کے غرض سے ڈال رہے تھے یہ شاید نزلے کا علاج تھا۔

”کوئی بھی ابھیں یا پرانے ہو تو آپ بلا جھجک بات کر سکتی ہیں۔ بالی آپ کل سے ڈیوٹی جوائن کریں اور۔“

”سر! آج سے کیوں نہیں۔۔۔ بلکہ ابھی سے۔“ وہ جودھیان سے سن رہی تھی۔ یکدم ٹوک گئی۔

دونوں باپ بیٹا کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔

”آپ کی طبیعت؟“

”میں ٹھیک ہوں سر۔!“

”لیکن ڈاکٹر شاہان کہہ رہی تھیں۔ آپ بازار وغیرہ جانا چاہتی ہیں۔ کچھ مناسب کپڑے وغیرہ تو اگر آج یہ کام بنائیں تو۔“ ڈاکٹر غازی کی یقیناً ڈاکٹر شاہان سے گفتگو ہوئی تھی۔

اس نے زور سے سر ملایا۔ ”جی سر! مجھے۔۔۔ خریداری کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے مگر۔۔۔ اکیلے ہی اکیلے ہی مت نکل جائیے گا۔ سیدھی سڑک کا گمان کر کے۔“ ڈاکٹر غازی نے دوستانہ مسکراہٹ سے تنبیہ کی۔

”اس دن آپ اکیلے کامپانی سے یہاں تک آ گئیں۔ مگر عام طور پر ایسے قہل کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اونچے نیچے راستوں پر چلنا بھی ایک آرٹ ہے اور کرتے کرتے یہ کام آئے گا پھر کچھ جنگلی جانور بھی کبھی کبھار فکرجاتے ہیں۔“

ڈاکٹر غازی کے لمحے میں چھپی فکرمندی اور احساس نے اسے شرمندہ کر دیا تھا پھر اچانک یاد آیا۔

”میں میں بالکل اکیلی بھی نہیں تھی وہاں اوپر عورتیں بچے تھے اور بچے۔۔۔ نیچے وہاں مجھے ایک صاحب مل گئے تھے۔ میرا ایک بھی اٹھالیا تھا سر۔۔۔ انہیں پتا تھا اسپتال کا وہ ہی ساتھ آئے۔“

”آپ جانتی تھیں انہیں کون تھے وہ؟“

ڈاکٹر غازی نے اچھٹے سے انہیں اور پھر کپ میں چچ گھماتے اپنے والد صاحب ڈاکٹر عثمان غنی کو دیکھا وہ شائے اچکا کر دل جتی سے دائرہ بناتے رہے کپ میں۔۔۔

”اتنی جلدی بھروسا کر لیا آپ نے۔۔۔ اتنا جلدی بھروسا کر لیتے ہیں کیا؟“ وہ استعجاب سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

اس کا اعتماد ہوا ہو گیا۔ اس کی فطرت میں گندمی غلطیاں۔۔۔ عادت چھوڑی جاسکتی ہے فطرت سے منہ کیسے موڑا جاسکتا ہے۔

”کرتے تو نہیں ہیں۔ کرنا چاہیے بھی نہیں۔ مگر میں دنیا کو اچھائی کی آنکھ سے دیکھنے کی عادی ہوں۔ بس دل مان گیا تھا۔ حالانکہ میں اسے نصیحتیں کر کے ہار گئی۔ اپنے آپ کو درست کرنا آسان نہیں ہوتا سر۔!“

اس کے لمحے میں ملال گھل گیا۔ وہ بڑی یا اعتمادی بیٹھی تھی۔ اب گریز پائی۔ یکدم اس کا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئی۔

”کون ہو سکتا ہے بابا۔۔۔؟“ اس نے ڈاکٹر غنی سے معلوم کرنا چاہا۔ ”کیا کوئی دیہاتی۔۔۔ یا۔“ وہ اس کی جانب مڑا۔

”دیہاتی تو خیر نہیں تھا۔ جینز جیکٹ۔۔۔ مگر یہاں کا جانا مانا پاس تھا۔ دراصل اس کے چہرے پر سوراخوں والا ٹیپا تھا تو۔۔۔“

”اے۔۔۔ ہاں۔“ ڈاکٹر کا منہ کھلا پھر جیسے ہڑبڑا کر اس نے تاثرات منائے۔

”ٹھیک ہے جانے دیں۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ بخیریت یہاں ہیں۔“ ڈاکٹر غازی نے قصہ یکدم سمیٹ دیا۔ وہ اپنا کپ اٹھائے کھڑکی تک آئے اور بلا تندی ڈوری پھینچی۔

”آگد سنی ڈے (ایک اچھا دھوپ بھران) اس کی ستائش سے بھرپور آواز اور سینہ تان کر کمرے میں تھکی روشنی نے اسے چونکایا۔

”آپ آج شاپنگ کا کام بنائیں۔“ موصیہ بد نے والا ہے اور یہ دھوپ بس آخری پار کی ہے۔۔۔ پھر بارش آریل تک اسے ترسیں گے۔“ ڈاکٹر غازی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ سر ہلا گئی۔

مانوس ہونا، مدغم ہونا، رنگ میں رنگ جانا انسانی جبلت کا ہی پہلو ہے۔ سو وہ خود حیران رہتی کہ اسے یہ کیوں لگتا کہ وہ صدیوں سے اپنی پھاڑوں میدانوں کی باسی ہے۔ اسے سردی پسند تھی اور یہاں خوب پیارے رنگوں کے ٹوپوں مٹھروں کوٹوں میں خود کو چھپائے وہ مزے سے گھومتی۔۔۔

اسے ماحول سے کوئی آکٹاہٹ نہیں ہوئی تھی چار اطراف کا منظر اسے ازہر ہو چکا تھا۔ پیچھے سیاہ سڑک جو شہر تک جاتی تھی۔ سامنے کھاس کے میدان اور ان کے اختتام پر آسمان سے ہم کلام پہاڑ۔ دائیں جانب وہی راستہ تھا۔ پگڈنڈی پہاڑ اور نیم تاریکی خوشبو۔۔۔

سبزے کی پاس انجان پھولوں کی انجمنی دل کو بھاتی مہک، خوفناک دریا ایک گمان کی صورت دکھائی پڑنا ہے۔

اور آکٹاہٹ ہوتی بھی تو کیسے۔۔۔ تیز دھوپ ہو تو آسمان کا رنگ شفاف نیلم کی طرح لگتا۔ دھوپ کم ہو تو منظر سناٹے کی چادر اوڑھ لیتا۔ ہر شے رنگ بدل لیتی۔ گھاس کے اتنے شید تو کسی مگر کیٹ لاگ میں بھی نہیں دکھائے گئے ہوں گے۔

ہر نئی صبح گرد و نوح کے نئے روپ کو پیش کرتی تھی اور باہر کے رنگوں کے رنگ بدلنے پر حیرت کرتی یا اندر آتے مریضوں کی آنکھوں کے رنگ پوروں پر لگتی۔

۔۔۔ ہلکی ہری، گہری ہری آنکھیں، براؤن شہد رنگ، سنہری نیلی آنکھیں، سرسری آنکھیں۔

کسی جو ہری کی دکان پر نیلم و زرد و یا قوت کی اتنی درائی نہ ہوگی۔ جتنی اس نے بٹھے پرانے کپڑوں میں ملبوس انسانوں کے چروں پر جی دیکھ لی تھی۔

دو ٹگنے شفاف، بے ریا۔ حیران معصوم آنکھیں۔۔۔

ہر صبح جیسے ایک نیا تجربہ تھی۔ ہر بل اکشاف کا۔۔۔

خوب صورتی تراوت خوشبو۔

وہ ذرا سا بھی موقع لئے رہا ہر نکل آتی۔ کبھی ڈاکٹر شاہان ہمراہ ہوتیں یا پلوٹے ٹکڑے اچھا لگتا تھا۔ ایک کتاب سینے سے لگائے وہ تماٹھے اور پھر کسی پتھر تک کر مطالعہ کرے اور جب ذرا سستہ کادل ہو تو۔۔۔

ان پھولوں کو کھوے اور چھو کر دیکھے جو اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے۔

اس دن بھی وہ اسپتال میں کام نہ دیکھ کر باہر نکل آئی۔ اکیلی۔۔۔ ہاں چوکیدار کو بتادیا۔ کچے راستے پر جا رہی ہوں۔ راستہ اب انجان نہیں تھا اور دوسرے ڈاکٹر صاحب بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ اتنی کم عمری قطعاً ڈاکٹر نہ دکھائی دینے والی ڈاکٹر موسم ماحول بے فکری اور اپنی ذات پر دل بدن بدھتا اعتبار ایک خوشی بن گیا تھا۔ طمانیت کے کمرے احساس کے ساتھ وہ ایک جتنے پتھر پر راجمان ہو گئی۔ پانی کی بول ساتھ گادی اور ٹھنڈوں پر رکھی کتاب کھول لی۔

یہ ایک معصوم تھا فخر اللہ خان کے قلم سے لکھا جناب انشاعی کی یاد میں۔۔۔

”انشا جی سے مل کر سارے دکھ دلدردور ہو جاتے تھے اور دل ہلکا ہو جاتا تھا۔ انشاجی بہت کم کسی پر کھلتے تھے۔ بہت لمبے دے رہتے اور جب کھلتے تو یوں لگتا جیسے بہار آگئی۔ وہ لپٹنے سا کر یا گدگدیاں کر کے ہنسانے والوں میں نہیں تھے۔ ان کی باتیں سن کر دل کی گہرائیوں سے ہسی کے فوارے چھوٹتے۔

ایک دن میں ان کے دفتر آیا تو کہنے لگے۔

”اچھا ہوا تم آگئے۔ اب میں تمہارے ساتھ عید کا چاند دکھوں گا۔“

شام کو میں اور انشاجی فٹ پاتھر پر آکر چاند دیکھنے لگے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے تم چاند دیکھو میں نے کہا ”تم کیوں نہیں دیکھتے؟“ تو کہنے لگے۔

”یار آج تو مجھے سورج تک نظر نہیں آ رہا اور

ابتلا نے کرنٹ کھائے انداز میں آنسوؤں سے لدی پلکیں اٹھائی تھیں۔

اپنے اترے چہرے کو چھپانے اور ٹوٹے اعصاب کی چیخ سے پریشان وہ سرشام ہی منہ سرلیٹ بستر میں چھپ گئی تھی۔ اس نے رات کا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

ڈاکٹر غنی کا انداز مخاطب۔۔۔ اسے ماضی میں دھکیل گیا تھا۔ اتنے میٹھے لمحے میں اسے زندگی میں ایک ہی بار۔۔۔ ایک شخص نے پکارا تھا۔ اس کی ماں نے۔۔۔ نہیں اس کے ابو نے۔ نہیں نہیں کسی اور نے۔۔۔ اور روح کی گہرائیوں سے دل کے نہاں خانوں میں چھپی بے اندازہ محبت سے پکارنے والا وہ شخص۔۔۔ اگلے روز۔۔۔ اگلے روز اس دنیا ہی سے چلا گیا۔

اور اس نے بھی کون سا بے کاٹوں سے اس لفظ کو سنا تھا یا اس سے نیکی شیرینی کو محسوس کیا تھا۔ نہیں اس نے تو فقط اس لفظ کو پڑھا تھا اور فقط پڑھ کر اس نے سوچا تھا کہ۔

اتنی مٹھاس۔۔۔ اتنی لگاوت، اتنی اپنائیت۔ فکر، درد مندی کا مظہر۔۔۔ بچھتاوے قیافے چھتا۔۔۔ کاش وہ اپنے کانوں سے سن بھی لیتی۔

ڈاکٹر غنی نے اسے کیا کہا تھا۔۔۔ ”بیاری بیبا“ اس نے بار بار سوچا تھا کہ اگر وہ اس مخاطب کو اپنے کانوں سے سن لیتی تو اس پر کیا اثر ہوتا۔

وہ سن کر۔۔۔ حق دق رہ گئی تھی۔ اسے لگا زمین و آسمان کی گردش رک گئی ہو۔ اسے لگا تھا وہ زندگی بھر اندازے لگاتی رہے گی اسے اچھا لگا تھا اس کے بے چین دل کو قرار ملا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔

زندگی بہت اچھی تھی وہ امی اور ابو کے درمیان سونے والی اکٹوتی بیٹی تھی۔ دائیں کروٹ امی، بائیں کروٹ ابو اور اگر چت تو دونوں کے بازو اس کے اوپر ہوتے۔

چار سال کی بچی کو دائیں کروٹ پر جب امی نہ ملیں تو وہ بہت شدت سے بائیں جانب ابو سے لپٹ گئی۔ اس کا باپ زندہ تھا اور وہ وہی طوطا تھی جس میں اس کی جان بند تھی۔ وہ اتنی چھوٹی سی تھی کہ اسے ہلایا گیا کہ ماں مٹی اوڑھ چلی اور زندگی میں اب ایک خلا ہے کھلونوں کپڑوں گہنائیوں اور باپ کی بے پناہ توجہ اس ٹھیک ہے۔۔۔ ایسی زندگی بھی ہوتی ہے۔

اسے کسی دوسرے کی چاہ نہیں تھی۔ ابو تھے ہاں وہ ہر مل اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ بس اسکول کے پانچ گھنٹے وہ ان سے جدا ہوتی تھی۔ ابو اپنا چھوٹا سا کاروبار چلاتے تھے۔ وہ اسے سچ ٹائم میں لے لیتے اور پھر رات گئے تک وہ ان کے ساتھ ان کے دفتر میں رہتی۔ وہی اسے ہوم ورک کرواتے۔۔۔ سپاہہ پڑھانے کو مولوی صاحب بھی دفتر ہی آتے۔

مگر ایک روز ایک ایسا دن بھی چڑھا جب ابو بیٹوں میں جکڑے بستر نشین تھے۔ اور وہ نا سنجھی کے عالم میں ان کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔ پھر بیٹیاں اتر گئیں پلاسٹر کھل گئے مگر نہ جانے کی ہڈی میں کون سا نقص رہ گیا کہ وہ حوائج ضروریہ کے بھی محتاج سے ہونے لگے۔ اس کی عرا تھی نہیں تھی کہ وہ انہیں اس حد تک مدد دے سکتی۔ وہ اپنے ابو کا بہت بڑا جذباتی سہارا تھی۔ مگر ابو کو جسمانی مدد کی ضرورت تھی۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں نے ایک میل نرس کا بندوبست کر دیا۔

وہ چھوٹی تھی وہ سمجھتی نہیں تھی۔ مگر سنی سب تھی۔

نانی اور چاچی کے جیلے وہ پہلے کمرے کی گندگی بدبو، دو خانہ ہونے کی شکایت کرتی تھیں۔ پھر کنبے لگیں۔

”غیر بندہ گھر میں گھسایا ہے اپنے گھر میں الٹ رہنا پڑتا ہے۔ عجیب بے سکونی کر دی ہے۔ پہلے مریض کے کھانے پینے کا بندوبست پر ہیز ناشہ یخچال پھر پتی نو سال کی ہونے کو ہے مگر بلاوے نو ماہ کی بتا کر رکھی ہے۔ جیم بیڈ سینڈویچ بخوس۔۔۔ اور اب ٹین

ہائے بندے کا کھانا چائے۔ ہونہ۔۔۔“ اور وہ جو سوچتی تھی کہ اب گھر میں سکون ہو گا وہ اس کی صورت حال سے پریشان ہو گئی۔

اس کی صبح ہے کہ وہ ان ہی چیزوں کو کھانا پسند کرتی تھی۔ امی کے بعد ابو نے اسے ایسے کھانے کھلائے تھے جو بنانے آسان ہوں مگر وہ کہہ نہ سکی کہ کتنے بہت سے دن گزرے وہ کھانا کتنے پر برتنوں کی کڑکڑاہٹ سننے ہی بنا کسی پکار کے خود ہی دستروخان کے سرے پر آکر ٹنگ جاتی۔

نانی چاچی اپنے بچوں کے خمرے اٹھاتیں اس کی تانے بے خبر وہ خود ہی اپنے لیے چپاتی پکڑا اس پر نشان کی مانند سان لگا لگا کر حلق سے اندر لے

وہ تو نچانے کب سے فرمائشوں، خواہشوں سے بچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ اپنی عمر سے بڑی تو نہیں ہوئی۔ مگر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ ٹنگٹی باندھ کر ابو کو دیکھتی رہتی

وہ باریک بین نہیں تھی۔ نہ زمانہ شناس۔۔۔ مگر اسے لگتا۔۔۔ اسے لگتا کہ۔۔۔

وہ انہیں اخبار پڑھ کر سناتی۔ اس کا قرآن پاک مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ انہیں آیات سناتی۔ ترجمہ دیتی۔ وہ خاموش طبع تھی۔ مگر ابو کی خاموشی سے گہرا گہر بہت زیادہ بولتی تھی۔ وہ ابو کو بولنے پر اکساتی تھی مگر وہ بہت خاموش ہو گئے تھے وہ خود ہی سوال و جواب کرتی۔

اسکول کے قصے سناتی۔ بے معنی، بے مقصد باتیں وہ اس کا دل رکھنے کو مسکراتے مگر ایسی مسکراہٹ۔۔۔ نہ ہی مسکرائیں تو اچھا۔

وہ باپ کی معصوم گود کی بچی تھی۔ دنیا سے نا آشنا، تجربہ خیز قیافہ، قیاس آرائیاں۔۔۔ مگر اسے لگتا۔

ابو زین بن ارونندھی بڑی بول کی طرح ہیں۔ جس کا کپڑ لگا ہے مگر غیر محسوس سی لہجہ۔۔۔ ٹپ۔۔۔ بول سے ٹپکتے نہ دکھائی دینے والے قطرے۔۔۔ ایک رنگہ لٹھے کی تو خالی بے وزن بول لڑھکتی۔۔۔ سرگتی کمرے باہر نکل چکی ہوگی۔

اور ایک صبح اس کے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔

بوٹی خالی ہو گئی تھی۔ زندگی اب ٹھوکروں پر تھی۔ اسے کبھی کسی نے ہاتھ سے دھکا نہیں دیا تھا۔ مگر وہ اوندھے منہ گری تھی۔ کسی نے منہ سے نوالہ نہیں چھینا۔۔۔ مگر وہ بھوک سے بلبلاتی تھی۔ اس گھر کی ہر شے میں وہ برابر کی حصے دار تھی۔ مگر اس کے حصے میں صرف ٹھوکریں تھیں۔

وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر سب اسی کو سناتے تھے۔

ہر جرم اس کے خانے میں بیٹھتا تھا۔ ہر خطا اسی سے سرزد ہوتی تھی۔ زندگی گویا رک گئی تھی۔ وہ باپ کے تنکے سے لپٹ کر سوتی تھی۔ اس سے باپ کا کمرہ لے لیا تھا۔ ”مٹی نہی سی بچی“ اتنا بڑا کمرہ۔۔۔ اکیلے اسے ڈر لگے گا۔

وہ کہہ نہ سکی۔ وہ اس کمرے سے جدا ہو کر زیادہ ڈرے گی۔ زندگی بھر ڈرتی رہے گی اس کا سائبان پناہ گاہ نہ چھینی جائے۔

اسے لڑکیوں کے کمرے میں گدا ڈال دیا گیا۔ وہ میبیلوں سو نہیں پاتی اس کمرے کا حق ملکیت اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ پگھلا چلائے، بند کرنے، ہتی جلائے بجھانے تک کی محتاج تھی۔ وہ دیوار پر اپنی ڈرائنگز تک نہیں لگا سکتی تھی۔ کوئی اس سے گفتگو نہیں کرتا تھا اسے پکارا نہیں تھا۔ وہ خود کلامیاں کرتی۔

ہاں اس کے نام کی پکاریں تب بڑتیں جب دستر خوان لگانا ہوتا تھا نا ہوتا۔ بچے نبھانے ہوتے گھر میں سب سے بدسلوک وہ تھی امی لیے اسے ہی سب سے پہلے سلیتہ سکھانے کا بار اٹھایا گیا۔

وہ بھرے پر ات آئے سے کشتی کرتی۔ برتن دھونے کا تار اس کی ہتھیلیوں میں دھنستا۔ برتن مانجھ مانجھ کر ناخن کھسکے اور پوروں کی کھال اتری اتری رہتی۔ اس کی فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود رو پودے کی طرح پروان چڑھ رہی تھی۔

ذہانت خدا داد تھی۔ کتابیں پڑھنا۔ ابو کو سنا کر وہ خود بھی رسیا ہو چکی تھی۔ تندر سے لائی روٹی جس اخباری کلزے میں لپٹی ہوتی، وہ اوھوری کٹی پھٹی خبروں کو ہی ازبر کرتی۔

واحد سہارا کتابیں تھیں۔ نصابی یا غیر نصابی۔ وہ گھر میں دوسرے درجے کے شہری سے بھی خراب حال میں رہتی تھی۔ مگر کلاس میں وہ واحد اول درجہ تھی۔

ڈسک پر سب سے آگے براہمن رہتی۔ یہاں اسے کوئی پچھاؤ نہیں سکتا تھا۔ وہ ذہین و فطین تھی۔ محنتی اور قابل۔

مگر قابلیت کے چراغ کو جلانے کے لیے تیل کی ضرورت ہوتی ہے اور تیل پیسوں سے آتا ہے۔ اس گھر میں اس کے لیے علیحدہ سے کوئی پیسہ نہیں تھا۔ تمام بچوں کی فیس کتابیں، یونی فارم، جوڑے اور دوسری ضروریات اکٹھے پوری کی جاتی تھیں۔ اسے کبھی منہ سے تو کچھ کہنا نہ پڑا۔ مگر جب اسے اپنی راہ الگ سے منتخب کرنا پڑی۔ تب۔

تایا کی دونوں بڑی بیٹیاں صرف اور صرف بناؤ سنگھار سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کے بعد تائی انہیں خود ایک نامی گرامی پارلر میں منہ مانگی فیس کے ساتھ داخل کروا آئیں۔ چاچی کی بیٹی اندر بس جانا چاہتی تھی۔ چاچی۔ بڑے خسرے منہ بنا بنا کر بیٹی کی اچھو منٹس پر آئے گئے کے آگے بھگان کر تیں۔ مصوری کا شوق۔

واہ۔ لڑکے سارے دھکا اشارت تھے۔ پڑھنے میں حسب معمول دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر انہیں ڈگریاں لانی تھیں۔ جیسے مرضی لائیں۔ سو ایزی چوٹی کا زور لگایا جاتا۔ نتیجہ وہی۔ ڈھاک کے تین بیات۔

ایسے میں اس کا ایف ایس سی میں شروع کے پانچ میں ہونا۔

”ہاں! ارے! کیسے؟ کب؟ اور آخر میں کیوں کے بعد قطعیت سے نہیں۔“

”پتا ہے؟ ڈاکٹری کی پڑھائی کتنی مہنگی ہوتی ہے۔“ اور لڑکی ہو، اول تو اتنا ہی کافی ہے۔ چلو شوق ہے؟

”بلکہ اتنا ہی کافی ہے۔ گھر رہ کر کچھ سلیقہ سیکھو۔ سال چھ ماہ میں بیاہ کا سوچو۔ آخر ہماری ذمہ داری ہے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو۔“

”میں۔۔۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں میرے نمبر۔۔۔ تلی جی۔۔۔“

”ارے نمبر۔۔۔“ تائی نے ٹھٹھا اڑایا، چاچا نے ساتھ دیا۔

”گھر میں رہ رہ کر نمبروں کا ہی تو جوہر دکھایا تم نے۔ کام نہ کاج بس چوبیس گھنٹے کتابیں۔ کسی اور طرف تو دھیان ہے نہیں۔۔۔ نہ بال نہ کپڑے نہ جوڑے نہ تلی دی ڈرامہ بس وہ موٹی روی کا ڈھیر اور اس میں گم ہونا رانی رنگ بھی کالا سا۔۔۔ آنے والیاں سو کن پورے باغی ہیں۔ مال باپ ہیں نہیں۔ یتیم سن کر پڑے ہی ٹھٹک جاتی ہیں کہ خالی کھسا ہونہ۔“

وہ کہہ نہ سکی ”یتیم کیوں چاہے تائے کیا ہوئے؟“ ”بیچھ نہ ہٹنا اتباع۔۔۔! رجا دانت پیٹتی۔

”بیٹا! تمہارا حق ہے، حق مانگنا سیکھو۔“ آئی نے دھیان کروایا۔

وہ اپنے دل کی سنتی۔ رجا کے بڑھاوے دیکھتی آئی کے حقوق و فرائض کے کیچھ پیاسا ب گھروالوں کو جنہیں وہ بہت بچپن سے جانتی تھی۔ اندر تک اس کے ساتھ کی سب لڑکیاں آگے بڑھ گئیں اور وہ گھر میں رہ گئی۔

خاموش گواں بے یقین مایوس اس کے لیے کوئی راہ نہیں تھی۔

وہ سوال کرتی نگاہوں سے تایا کا چہرہ دیکھتی کہ وہ پوچھ لیں۔ ”سب اپنے اپنے اسکول کالج روانہ ہیں۔ تم کیوں گھر میں ہو؟“

وہ پچا کے چہرے پر نظر کرتی وہ پوچھ لیں اس کے چہرے پر کیسی پچھلا ہٹ ہے۔ وہ کیا کہتے کہتے رک سی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت یہ کی چیز کی

اور پھر ایک دن رجا نے تایا کو پکڑ لیا۔

شوق، غشی، کامیاب، ذہین اتباع، فاطمہ۔ حق دار، تلی جی، وہ بھک تو نہیں مانگ رہی۔ اس کے ابو کا کاروبار چلنے کے بعد تایا چاچا کی زیر نگرانی چلا گیا اور آج تک قائم و دائم تھا۔

اور اس بڑے سے گھر میں بھی تو اس کا حصہ تھا۔ سلطان احمد کی ایک بیٹی کی جگہ پانچ بچے بھی یتیم ہوتے تو ان کے بچپن کا ٹکٹ بن سکتے تھے۔

رجا با اعتماد تھی۔ صاف گو۔ بے لاگ کہنے والی۔ اسے حق بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

وہ اپنے دل کے سارے ارمان نکال دوا زہ پار کر گئی۔

اس نے تایا جی کی عمر، رعب، دیدے کا ذرا لحاظ نہ کیا۔

وہ جو جو سوچتی تھی۔ اور اتباع کو سمجھانے بھڑکانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ وہ سب سنا کر گئی۔

”ختمے بیٹوں پر خرچ کر رہے ہیں۔ وہ اگلا سارا دن کرنا کالج کے باہر جو دن بیچتا ہے اتنا ہی شوق ہے ناں تو انکل! آپ اسے کسی کالج کینٹین کا وینر لگا دیں۔

لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ کم از کم ”کام کرتا ہے“ کا مونو گرام تو لگا ہو گا۔ ابھی تو صرف نام خراب کر رہا ہے صرف آپ کو لگا کہ وہ دوستوں سے لو کر آیا ہے۔ اصل کہانی یہ ہے کہ وہ لڑکیاں کے بھائیوں سے بٹ کر آیا تھا۔ اور سب سے مہنگی کوچنگ اسی کو دلوار رکھی ہے ناں آپ نے۔

دونوں بیٹیوں کا بھی سن لیں۔ اتنی زیادہ فیس کے لئے بس اپنا ہی سنگھار کرتی ہیں۔ انڈیا اپنا تک تو آیا ہیں۔ انہوں نے کیا لگے گھر نہیں جانا۔

اور چاچی آپ کی بیٹی بڑی صادقین کی جانشین اور کل جی کی پیروکار وہ جو کل بھوسی کلزے والے کو چارلس پیچے آپ نے پورے تین سو کی روی۔ وہ لڑکی کی ہوگی کم از کم تیس ہزار کی۔

اور پتا ہے وہ آرٹ کے نمونے جن پر آپ لوگ فخر کرتے ہیں۔ بھوسی کلزے والے نے کہا۔ ”کسی بچے نے کاغذ پر رنگ خالص کر دیے ہی ہی۔“

اور جو صحیح قاتل اور حق دار ہے کہ آپ اس پر خرچ کریں اور فخر کریں۔ دنیا میں بھی داد۔

تائی اچھل کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ سب ہی حق دق تھے۔ اتباع پسینے کاش وہ رجا کو روک پانی۔ اب کیا ہو گا۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ وہ باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔

”بس لڑکی! بہت دیر سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ تایا جی کھڑے ہو گئے۔ بہت ہو گیا اب ایک لفظ نہیں! وہ دھاڑے تھے۔

”میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی انکل!“ رجا کی آواز ان سے زیادہ بلند تھی۔ اس نے زمین پر زور سے پاؤں بھی مارا۔

”ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔“ وہ حاضرین کی جانب مڑی۔

”ہاں۔۔۔ دنیا میں بھی داد ملے گی اور آخرت میں ثواب۔ اور جنت کی بڑی گارنٹی لکھو ایس آپ۔۔۔“ وہ پکی تھی۔

”بکواس بند کرو بد تمیز لڑکی!“ چاچی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔

”چاچی! مجھے بد تمیز مت کہنے گا۔“ رجا نے بھڑک کر تادیبی انگلی اٹھائی۔ ”یہ میں اکیلی نہیں بول رہی تمام خلیہ یہی باتیں کرتا ہے۔ ہونا ناں اس ڈر پوک نکمی کی جگہ کوئی ذہانت سلطان کی جگہ بن سلطان تو ڈال دیتا حلق میں انگوٹھا۔“ اس نے اپنا ہاتھ اور کے سے نکالا انگوٹھا چاچی کی گردن کے سامنے یکدم یوں لہرایا جیسے کہ بس۔۔۔ اندر۔

”نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔“ تایا صوفے پر گر کرنے کے انداز میں بیٹھتے تھے۔

تائی جی شاید رجا کو دھکے دینے کے لیے اٹھی تھیں۔

رجا نے بھانپ لیا۔ ”آپ تکلیف نہ کریں۔ میں جا

ہی رہی ہوں۔“ رجا بے حد بد تمیزی سے بولی۔ ”ہو نہ۔۔۔ مجھے بد تمیز کہہ رہے ہیں۔“
 ”بد تمیز ہونے میں کوئی برائی نہیں۔“ رجا کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔
 ”بد تمیز ہی لیکن بد نیت نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ یکدم باہر کی جانب پکی۔ جاتے جاتے ایک زوردار ہاتھ اتباع کے شانے پر دھڑکی۔ غصے سے بھرپور دھکا سا۔

”بزدل، بے وقوف۔“
 اتباع رجا کی حق گوئی سے واقف تھی۔ وہ آئینہ دکھانے والے اس کے عرائم سن کر مسکرا دیتی تھی۔ رجا کی فطرت سے بخوبی واقف ہو جانے کے باوجود اسے کبھی خواب بھی نہ آیا تھا کہ وہ ایسا گری گزرے گی چٹان۔۔۔ پٹاخ۔

تاجی کا سیدھا ہاتھ اس کے سیدھے گال پر پڑا اور وہی ہاتھ واپس ہو کر اٹا۔ اٹے گال پر۔
 اور اس کے بعد۔۔۔

اتباع نے تھر تھر جھری۔ تاجی کے طمانچہ کی گونج۔۔۔ تپش، تکلیف آج بھی اس کے گال کو جلاتی تھی۔
 وہ اس وقت چولے کے نزدیک بیٹھی تھی۔ آگ کی حدت سے گال گرم ہو گئے تھے۔ اس نے دھیرے سے انہیں تھپتھپایا اور پھر بھی انگلیوں کو دیکھ کر زہر خندی سے مسکرا دی۔ اگلے پل وہ گھٹنوں میں منہ دے کر سبک رہی تھی۔

”ہماری بے عزتی، ذلت، ہمتا، حرام خور، استین کا سانپ۔“ وہ آج تک اندازہ نہ لگا پائی اسے جملوں سے تکلیف ہوئی یا دو پھپھوں سے۔
 زندگی پہلے کون سی پھولوں کی بیج تھی۔ مگر اس کے بعد تو۔۔۔

”ایسا کون سا دکھ ہے لڑکی جو تمہیں خون رلاتا ہے۔“ ڈاکٹر عثمان غنی کی زنج آواز۔ وہ اچھل پڑی۔
 اور میری یہ سبج میں نہیں آتا کہ رونے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟“ تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تمہارا رونا

مجھے کتنی۔۔۔ شدید تکلیف دے رہا ہے۔“ وہ کرسی ٹھکرت کر اس کے نزدیک بیٹھ چکے تھے۔
 ”میں نہیں جانتا۔ کون سا معاملہ اہل میں گڑا ہے۔ مہمت کر کے ایک بار اسے پہنچا لو۔“

اللہ کی دی اتنی بہت ساری نعمتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو تمہیں پل بھر کو خوش کر سکے۔ دکھ یقیناً، پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں سینے پر دھڑکے۔ خشک بے آب گیارہ۔ ان کے اندر نمی نہیں ہوتی تو کسی چیز کا نمو بھی نہیں ہوتا اور خوشیاں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ دریا کی ریت کے اندر پنہاں سمرے ذرات جیسی۔ ریت کے باریک ذروں میں سے سونا ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔۔۔ بہت مشکل کام ہے۔ دل گردے کا صبر، محض شہسراؤ۔۔۔ انتظار۔ خوشیاں بہت مشکل سے ملنے والے سونے کے ذرے کی طرح ہیں۔ مگر بیٹا سونا پھر سونا ہی ہوتا ہے۔ میری بات سمجھ میں آئی؟“ وہ بہت محبت سے اس کی سوتی سرخ آنکھوں اور ٹھیکے چہرے پر نگاہیں جمائے شہسرا کر بولے تھے۔

اتباع کا سر اثبات میں ہلکا۔
 ”اور تم تو پھر میچا ہو۔“ میچائی کا نتیجہ۔ دعا میں بے حدود بے حساب اور اگر کسی کی ایک دعا بھی لگ گئی تو حاصل فقط خوشیاں۔ اتنی کہ سنبھالنے نہ سنبھالیں۔ میں اب تمہیں دوبارہ کبھی ایسے روتانہ دیکھوں۔ ٹھیک ہے۔“

اتباع نے کوئی حرکت نہ کی۔
 ”اس بار بھی سر کو ہلاتا تھا۔“ ڈاکٹر غنی نے اپنا بیچ اس کے سر پر رکھ کر سر کو ہلایا۔ اتباع کے چہرے پر پکی پار شرمندگی آئی۔ وہ جیسے چو غنی تھی کہیں اور ہی تھی۔ جیسے واپس پٹی تھی۔

”چو ہما جلتا دیکھ کر اپنا زبانی کو کون سے آیا تھا تو حیران رہ گیا یہاں تو گویا آگ اور پانی کا ملن ہو رہا تھا۔ اہا۔۔۔ ان کا اشارہ اس کے رونے پر تھا۔ اتباع کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔ اس نے چادر سے چہرہ پونچھا۔
 ”جوشاندہ پیو گی۔۔۔ بتاؤں؟“ ڈاکٹر عثمان غنی نے

کیٹلی اٹھاتے ہوئے چٹکارا سالیسا۔ انداز یوں تھا جیسے دعوت شیرازی ہو۔
 اتباع کی ہنسی نکل گئی۔
 ایک رشتے کا آقا۔۔۔ اعتبار دوستی۔

اسپتال ایریا میں سکنلر رابرٹلم گیبیر تھی اور رجانے کے دل میں بات کرنے کی ناکید کی۔ سو جب اسے خبر ہوئی کہ ڈاکٹر عثمان غنی اسپتال کی کچھ دوائیوں اور دیگر دواؤں کی خریداری کے لیے ایبٹ آباد تک سفر کرنے والے ہیں۔ تو اس نے مدعا ڈاکٹر شاہان کے سامنے پیش کیا۔

”ایڈیڈا اچھا ہے مگر تم پیش کر دو گی۔“ وہ بڑے دوش سے بولی تھیں۔
 ”میں کبھی نہیں کہہ سکتی۔“ اس نے منہ بتایا۔
 ڈاکٹر عثمان غنی کی نقاب کشائی کے بعد اور اس جوشاندے والی رات کے بعد وہ تو جیسے ان کے سائے سے بھی بھاگتی تھی۔ وہ اتنی شرمندہ تھی کہ اس نے باوجود کوشش کے یہ قصہ ڈاکٹر شاہان سے بھی نہ کہا۔ یہاں تک کہ رجا سے بھی نہیں۔ البتہ ڈاکٹر عثمان غنی نے اپنے چہیتے سے ضرور ذکر کر دیا تھا جب ہی۔۔۔

وہ ایک عورت اور بچے کا چپک اپ کر رہی تھی۔ بچے کی پسی میں زوردار چوٹ تھی اور ماں کی پٹی آنکھ کے پاس جامنی سیاہ نیل اور بانی جسم میں مکوں کی مار سے شدید درد۔۔۔

اسے مقامی زبان کی شدید تھی مگر اتنی گاڑھی اور دلائی سے چلتی مجروح عورت کی زبان۔۔۔ سو وہ درد مندی سے سنتی بار بار سراٹھا کر سر پٹوٹے کو دیکھتی تھی۔ کیا کہہ رہی ہے؟ وہ سر ہلا کر تسلی کروائی کہ پہلے ڈاکٹر قصہ سمجھے۔

”یہ اپنے شوہر کی پسی بیوی ہے۔ پانچ بچے بھی ہیں مگر اس کے شوہر نے چند سال پہلے ایک عورت کے شدید عشق میں مبتلا ہو کر دوسری شادی کر لی اس کے

بچے بھی نہیں ہوئے۔ دلی پتی ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ یہ اپنے ماں ہونے پر غور کرتی ہے۔ مگر اگلی کو اس کی پرواہ نہیں۔ وہ کہتی ہے جو مرضی کر لے۔ شوہر زیادہ وقت بلکہ سارا وقت اسی کے ساتھ گزارتا ہے تو اپنے بچے کے کر بیٹھی رہ۔ تیری طرف تو دیکھتا بھی نہیں۔ اب بات سچی ہے اس کو کتنی ہے آگ۔۔۔

تو کل اس کے منہ سے یکدم نکلا۔۔۔ غور کس بات کا کرتی ہے پندرہ سال تک وہ ایکی بیوی رہی ہے تو۔۔۔ تو یہ کل کی عورت۔ خمرے کس بات کے ملا تو مجھے ہی مر رہے۔ جملہ مار کے اس کو ٹھنڈ پڑ گئی اور اس کو آگ لگ گئی۔ اس کے میاں نے کچے کچے مارے کہ مجھے جھوٹا کہا۔۔۔ تیری اتنی ہمت۔ رستے میں بچہ آیا تو اس کی پسی میں بھی پاؤں مار کے نکل گیا۔“
 ”اللہ اتنا ظالم آدمی۔۔۔ جی جی۔“ وہ نسخہ لکھنا بھول، قلم منہ میں دابے تاسف سے روتی عورت کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے تو کوئی جا کر اس کے شوہر کو پکڑے۔ ایسے مارتے ہیں عورت کو بھلا۔۔۔ بلکہ مارتے ہی کیوں ہیں۔ کیا کرتا ہے تمہارا شوہر؟“
 ”اوس کی کرنا۔ ڈاکٹر ساب دی ڈیویری کر دے۔“

”ارے۔۔۔ کون۔۔۔ کون سا والا۔“
 ”وہ عباسی۔۔۔ ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ پلوٹے نے لاپرواہی سے کہا۔

”لیاقت عباسی۔ اللہ۔۔۔ اس نے کھینچ کر کہا۔“
 وہ۔۔۔ دو۔۔۔ وہ تو اتنا خاموش، شریف سا کام سے کام رکھتا ہے اور تم۔۔۔“
 ”اس نے کام گھر پر رکھا ہے ڈاکٹر جی۔۔۔ پلوٹے کو گد گدی ہوئی۔

”بد تمیز فاتو کیوں بولیں۔۔۔ ارے دیکھنے میں کتنا سیدھا سا وہ دو دو بویاں۔“ وہ تو اچھل ہی پڑی تھی۔
 ”انتا دھیما بولتا ہے اتنی عزت کرتا ہے۔ میں نے تو سوچا ہی نہیں کہ ایسے۔ ایسا ہو گا۔ اللہ لوگ اپنے

چروں پر کیسے نقاب لگا کر گھومتے ہیں۔ اس کی حیرت اسے چین ہی نہ لینے دے رہی تھی۔
 ڈاکٹر کی ہمدردی اور حیرت پر مریضہ کے آنسوؤں میں شدت آئی اور پلوٹے کی مسکراہٹ بڑھ گئی۔
 ”یہاں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔“
 ”ہونے دیں سسٹر پلوٹے سب ایک جیسے۔ مگر ڈاکٹر اجنبی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بڑی جی دار ہیں بڑے بھوں کے منہ سے نقاب فوج سکتی ہیں کسی سے نہیں ڈرتیں۔“
 اجنبی کے منہ میں دیا قلم نیچے کر کے لڑھک گیا اور میز پر ٹکی کبھی پھسل گئی۔
 ”ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔ جی! پلوٹے نے فوراً“ متاثر ہو کر بوجھا۔

اجنبی نے تحیر سے ہاس سے گزرتے اور دو ایسوں کی الماری کا پٹ کھولتے ڈاکٹر غازی کو دیکھا۔
 وہ لکڑی کے پارٹیشن کے دوسری جانب مرو مریضوں کی اولیٰ ڈی میں تھے۔ کب فارغ ہوئے اور کب ان کی گفتگو سے بہرہ ور ہوئے۔۔۔ بھرو کرنے تک پہنچے۔
 تحیر شرمندگی ناگواری۔ نتیجہ غصہ۔ اس نے تیز تیز ہاتھوں سے کانڈ پر نسخہ لکھ کر مریضہ کو دیا اور پلوٹے سے کہا کہ وہ بیوی خود سے لگا دے۔

”ڈاکٹر شاہان۔۔۔ ڈاکٹر غازی کہتے ہیں۔ آپ ایسٹ آباد تک چلیں گی۔ شام تک واپسی۔“ ماسی نے اگر پوچھا۔ ”بڑے ڈاکٹر صاحب بھی کھڑے ہیں۔“
 ”اے وہ۔۔۔ ہمارا۔“ اجنبی اچھل پڑی۔
 ”کہنا سوچ کر رہتے ہیں۔“ شاہان نے سنجیدگی کا چولا پہنا۔

”آپ نے یہ کیوں کہا؟“ اجنبی نے پوچھا۔
 ”تیار ہی پڑو۔۔۔ لڑکی۔۔۔ جواب تو مجھے ایسا ہی دینا تھا۔ تم نہیں سمجھو گی۔“ وہ الماری کے پٹ کھول اندر

گھس گئیں۔

اجنبی نے آئینے میں اپنا نقادانہ جائزہ لیا۔
 جاگڑا بلو جینز پر اسکی گلابی گرم لانگ کوٹ مگر گلابی اور سیاہ ڈانس کا گرم ٹیپا۔ گردن پر سیاہ منظر دوبارہ کس لیا۔ سردی اتنی شدید نہیں تھی مگر اسے زیادہ لگتی تھی۔ دستاں کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیے۔
 اپنا بیگ از سر نو چیک کرتی وہ ڈاکٹر شاہان کی غصہ تھی۔ جو خود تیار ہو رہی تھیں ساتھ ساتھ فرمودات بھی۔
 ”یار کبھی بکھار تو ایسی تفریح ملتی ہے ورنہ وہی ڈل لائف فیکچر کی پو۔۔۔ فیمنائل کے جھکے اور ڈیٹل کا پرفیوم۔۔۔“

”آپ نے کچھ زیادہ پرفیوم نہیں لگا لیا۔ اتنی تیز اسمیل۔۔۔ گاڑی میں ہتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ پہلا جملہ ہی نکلا۔ ڈاکٹر شاہان کے پسینہ پرفیوم کی خوشبو گاڑی کے ہر کونے میں جا بسی تھی۔
 ”اچھا! شاہان نے حیرت سے اپنے گریبان میں گردن گرا کر کہا۔“ لیکن میں تو بہت لائٹ خوشبو استعمال کرتی ہوں۔“
 اجنبی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”لیکن آپ بہت زیادہ انڈیل چکی ہیں۔“

”کیا بری لگ رہی ہے۔“ وہ فوراً فکر مند سی پوچھنے لگیں۔
 ”نہیں بالکل نہیں۔۔۔ بھلا خوشبو بھی کسی کو بری لگ سکتی ہے اور آپ تو جن یوں بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“
 ”سچ کہہ رہی ہوں ناں؟“
 ”بالکل سچ۔ آپ نے کب جھوٹ پر انعام رکھا؟“ وہ مسکرا دی۔

دیر، دیر سے چل اے دل بے قرار۔۔۔ کوئی آتا ہے یوں تڑپ کر نہ تڑپا مجھے بار بار۔۔۔ کوئی آتا ہے

دیر سے۔۔۔
 ”آپ کی آواز بہت اچھی ہے ڈاکٹر شاہان۔۔۔ اور بہت بہت ہی پیارا شاعری بھی اور لے بھی یونہی فنی رہتا ہوا۔“ یہ موسم ماحول ارد گرد کے رنگ اور اس پر آپ کا گیت۔ دل جیسے خوشی سے بھر گیا۔ اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹ سی اتر آئی۔
 ”تم بھی خوش ہو۔۔۔“ ڈاکٹر شاہان نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ ”کیوں خوش ہو؟“
 ”پتا نہیں۔۔۔ اس کی جگمگاہٹ دھیمی ہو گئی۔“ دراصل۔۔۔

اس کا جملہ ادھر وارہ گیا ڈاکٹر غازی بھرا ڈرائیور اور ساتھ ڈاکٹر عثمان غنی۔۔۔ وہ ٹھنکی اور غیر محسوس طور پر سیٹ پر نیچے کی جانب سرک گئی مگر ڈاکٹر عثمان غنی کے ہاتھ میں ایک مبی لیسٹ تھی۔ جس پر قلم سے کسی چیز کا اضافہ کرتے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ اس نے چند لمحے گزارنے کے بعد طمانیت کا سانس لیا۔ وہ اس وقت ہاس ہی بنے ہوئے ہونے تھے اور جب وہاں ہوتے تھے تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جب وہ مسکراہٹ سے کبھی اس کی جانب غور دیکھتے تب وہ بغلیں جھانکنے لگتی۔

اپنا بیگ کھول اس کے اندر منہ دے کر بیٹھ گئی۔ وہ جیسے اندر باہر سے بالکل کٹ کر اپنے کالم میں گن تھی۔ مگر نہیں وہیں کاہل کھانا لکھڑاٹاٹا اسے بھولی محسوس ہو رہا تھا۔ بعض دفعہ تو اسے لگا کہ وہ دروازے سے اس بری طرح چپک جاتی تھی کہ ذرا سا اور دباؤ پڑا اور وہ۔۔۔ شاہ سے باہر مگر خدشہ دم توڑ گئے۔ وہ بااحتفاظ ایک سیدھے روڈ پر پہنچ گئے۔ اور یہاں دھوپ تھی اور سیدھی آنکھوں میں بڑتی تھی۔ اس نے سب کی پیروی کرتے ہوئے سیاہ گاڑی پر لگاڑے۔

ایسٹ آباد ماسوہ روڈ پر وہیں رکی تو سب کے پاس اپنے اپنے کاموں کی فہرست تھی۔ کس کو کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے کیا کیا خریدنا ہے۔ صرف وہی تھی جو قطعاً انجان ارد گرد کے مناظر سے آشنائی پیدا کرنے کی

کوشش میں گردن گھما گھما کر چار اطراف کو کھوج رہی تھی۔

”مجھے ابوب میڈیکل کالج کے پاس سے کچھ بکس کے نئے ایڈیشن معلوم کرنے ہیں اور میڈیکل اسٹور سے دو ایسوں کا نیا اشاک۔“
 ڈرائیور خانو نے اسپتال کے کچن کا تین ماہ کا سامان اکٹھا کرنا ہے سب سے زیادہ ٹائم لے لے گا۔ اگر کوئی خاص چیز جس کا کچن میں اضافہ چاہیے یا کوئی کمی ذہن میں ہے تو ڈاکٹر شاہان لیسٹ پر نظر ڈال لیں۔“
 وہ سب وہیں سے اتر کر دروازے کی شکل میں کھڑے تھے ڈاکٹر عثمان غنی پو گرام سیٹ کر رہے تھے۔

”خانو! تم ڈاکٹر صاحب کو لست فوراً“ چیک کروالو۔ پھر یہ جھگیں بازار میں گھس گئیں تو شام سے پہلے ہاتھ نہ آئیں گی۔“
 ”آپ جھگیوں میں کیا کرنے جائیں گی؟“ اجنبی نے ڈاکٹر شاہان سے سرگوشی کی۔

”بازار کا نام ہے ڈیر۔ ہاڑے کا کپڑا ایک دم زبردست۔۔۔ تم بھی ساتھ چلنا۔“ ڈاکٹر عثمان غنی کھنکھار کر متوجہ کیا۔

آپ کیا لینا چاہتی ہیں اور کس طرف جانا چاہیں گی؟“ وہ اجنبی سے مخاطب تھے۔
 ”مجھے تو بس فونز کرنے ہیں اور کچھ بکس لینی ہیں اور بس۔۔۔ ہاں اگر ٹائم رہا تو۔۔۔ ہاڑے بھی دیکھ لوں گی۔“
 ”ہوں۔۔۔ تمام صاحبان سوچ میں کم ہو گئے۔“
 ”آپ پھر میرے ساتھ چلئے۔“ ڈاکٹر عثمان غنی نے کہا۔

(ارے لو خوا خواہ۔۔۔) اس نے بدک کر دوسری راہ تلاشی چاہی۔
 ”اور وہی ڈاکٹر تاس مارے تال چلو۔“ پچھلی یار کی طرح ختم ترنخ واسمان لے لے لے سال۔“ خانو نے یاد آنے پر تڑپت کہا تھا۔

(بڑی ڈاکٹر آپ میرے ساتھ چلیں پچھلی دفعہ کی طرح ایکسپس ہاؤس کا سامان خرید لوں گا)
 ”لیکن مجھے تو۔۔۔“ ڈاکٹر شاہان نے انکار کرنے کے

لیے جواز کھڑا چاہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے شہلہ! آپ اس کے ساتھ جائے کینٹ بازار پھر اس طرح جلد فارغ ہوں گی تو ڈاکٹر ابتلع کے ساتھ باڑہ دیکھ بیٹھے گا۔ ہم فارغ ہو کر ”ایلیاسی مسجد“ کے پاس ہوں گے۔ میں کال کر لوں گا۔“

”میں پھر الزا سلوٹ مشین والے کے پاس جاتا ہوں۔“ ڈاکٹر عثمان غازی نے خود ہی فیصلہ دیا۔
”چلو ٹھیک ہے پھر یہ بھی حل ہوا؟“
”تو سر۔“ تقریباً سب کی آواز ساتھ نکلی اور پھر مشترکہ بنی۔

تھوڑا سا ساتھ چلنے کے بعد سب کے راستے بننے لگے تو وہ ڈاکٹر عثمان غازی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اس نے گاڑز گریبان میں انکالیے اتور کی آخری تاریخ بھی مگر سرور نے اس کے پیچھے پیچھے کو لیے تھے۔
سواں پکھلی دھوپ کی چمک اور نرم سی حدت بے حد خوشگوار تھی۔

اس نے اپنے سے چند قدم آگے چلتے ڈاکٹر عثمان غازی کو بغور دیکھا۔ دراز قامت، سر بالوں سے بھرا ہوا۔ ان کی کمر سیدھی اور چال توانا تھی۔
”پہلے بکس لیں یا فونز کرنے ہیں؟“ ڈاکٹر غازی یکدم مڑے۔

”آں۔ ہاں۔“ وہ چونکی ”میں پہلے فون کروں گی۔“
”تو یوں کریں یہاں اس طرف پیچ پر بیٹھیں اور میرا انتظار کریں ورنہ پھر بات مکمل ہو جائے تو یہاں اس شاپ میں آجائیے گا۔ رائٹ۔“ اس کے چہرے کو بخود دیکھتے وہ پوچھ رہے تھے۔
اس نے سر ہلادیا۔

اس نے لاہور نمبر ملایا اور کو لیگ سے والد کے انتقال پر افسوس کرتی رہی۔ اسے دلاسا دیتی رہی۔
پھر کراچی کا نمبر ملا کر کتنے ہی پل فون کی منہی اسکرین کو ٹھونکتی رہی اس میں ہمت نہیں تھی کہ اوکے کاٹن دیانی۔

گیارہ ہندسوں کے پیچھے گیارہ لوگ تھے۔ گیارہ ہل۔ گیارہ دکھ۔ اور نہیں۔ دکھ گننے کے لیے انکھوں کی پوریوں پر گنتی کے خانے کم تھے اور یادداشت اتنی وسعت کب رکھتی۔
اور اگر وہ نہر ملادے تو بھلا کون اٹھائے گا۔ گھر کے گیارہ افراد۔ اور ان میں سے کون بھلا۔
لیکن کتنے دکھ کی بات ہے گیارہ کے گیارہ افراد میں سے ایک کو بھی بارہویں کی آواز سن کر خوشی نہ ہوئی۔
مرست نہ ہوئی۔
دیکھی خوشی کی کھبی۔ اتنی نازک چھوٹی منہی۔
پل بھر میں گل سڑ کر فنا۔

اس کا جی ہر شے سے اجاٹ ہو گیا۔ اس پر ڈپریشن کا شدید ترین حملہ ہونے کو تھا۔ وہ اس روشن چمک دار دن سے نگاہیں چرائے تھیں یادوں کی تاریکی میں کھونے کو تھی۔ مگر نہیں۔ اس کے اندر سے کسی نے اسے لتاڑا۔

”ٹھو ابتلع۔! تم خوشی میں خوشی ہی کو یاد کیوں نہیں رکھتی ہو۔ بلا وجہ کا تماشا۔ سب سے بہترین عقل وہ ہوئی ہے جو انسان کے اندر سے اٹھتی ہے۔“
اس نے خود کو صحیح وقت پر سرزنش کی تھی۔ اس نے تیزی سے سر بن دیا کہ اسکرین سے نمبر غائب کر دیے سورج کبھی کے پھولوں سے سجاوال پیپر۔ جیسے اس کے اندر سے اٹھتی سیایت کو پرپ کر گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کتابیں دیکھنے کے لیے اسی بک شاپ سے اگلی شاپ میں گھس گئی۔ جہاں ڈاکٹر غازی تھے۔
اگلا یوں گھنٹہ بے حد خوش کن اور اگر وہ کو بھلا دینے والا تھا۔ رنگ برنگی چادر والی چمیلے سروالی خوب صورت عنوان سے سجی کتابیں۔

اسے سب پسند آ رہی تھیں۔ وہ بہت طمانیت سے اور انا پیٹ رہی تھی۔
مصلح ہوتے اعصاب کے لیے کت مینی بہترین نسخہ بن کر آئی تھی۔ اس کا ٹوٹا دل شرمایا گیا۔ اس کی بے سکونی کو قرار آ گیا۔

”دغل اندازی نہ سمجھیں تو کچھ کہوں۔“ ڈاکٹر غازی بک شاپ سے نکل کر اس کے ساتھ پیچ پر براجمان ہوتے ہوئے بولے۔
وہ بری طرح چونکی ”نال۔ نال۔ نال۔ نہیں۔ پلینز۔“
”یہ تمام بکس آپ صرف دیکھ رہی ہیں یا خریدیں گی۔“ ان کا اشارہ اس کی گود میں پڑے ڈھیر کی جانب تھا۔ کچھ کتابیں پیچ پر دونوں کے درمیان بھی پڑی تھیں۔
”نہیں سر۔ سب تو نہیں خریدوں گی۔ مگر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“
”تو کون سی یں فیصلہ ہوا یا۔۔۔؟“
”سر! مشکل فیصلہ ہے سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بہر حال چند ایک تو ضرور لوں گی ان میں کچھ میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں مگر دوبارہ لینے کی خواہش ہے۔“

پڑھی ہوئی کتاب کو دوبارہ پڑھنا ایسے ہی ہے جیسے راتے دوست سے عرصہ بعد ملاقات کرنا اور اسٹوڈنٹ لائف میں ہمارے پاس پر چیز نگ یاد نہیں ہوتی تھی۔ ”وہ کھوسی گئی۔“ ذکر اے پر لیتے تھے یا اولڈ بک ہاؤس سے چھائی کرتے تین سو کی کتاب خریدی جی بھر پڑھتے اور واپسی پر ڈھائی سو واپس مل جاتے۔ شاذ ہی کوئی نیو بک خریدی ہو۔“
وہ جیسے خود کا می کر رہی ہو، اس نے بعد میں رات کو سوتے وقت جب اس سارے دن کو سوچنا تھا تو لازمی خود کو تارٹی کی یوں کیوں مکمل جاتی ہے۔
اور ڈاکٹر عثمان غازی میں ایسی کیا بات ہے جو ہمیشہ وہ ان کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔
مگر اس وقت تو۔۔۔ یوں اچھا لگ رہا تھا۔

”بہت افسوس کی بات اور لمحہ فکریہ ہے ہمارے ہاں گھٹیا گندی سی ڈیزدس بیس روپے میں جگہ جگہ ملتی ہیں اور بکس کی جگہ چند ایک اور قیمتیں بساط سے باہر

اب تو کراچی جیسے شہر میں بھی لائبریری ڈھونڈنا بکس کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنا ہے۔ پرائیوٹ لائبریریوں تک عوام کی رسائی نہیں۔“
”بہت دکھ ہوتا ہے سراب تو بچے عمران سیر زلور فریدی، حمید کوئی نہیں پڑھتے بلکہ وہ تو ان کے نام بھی نہیں جانتے ہوں گے میں اور جاب۔ رجامیری دوست سر۔۔۔ آسٹریلیا میں رہتی ہے اس کو فون کرنا ہے مجھے۔۔۔ ارے۔“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ گھڑی کی جانب متوجہ ہوئی۔

”سوری سر! میرا دیا ہوا ٹائم ہو گیا سر۔“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔
”اس اوکے ڈاکٹر ابتلع۔۔۔ آپ ریلیکس ہو کر بات کریں۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا یہ بچہ کتابیں آپ کے ہاتھ میں ہیں یہ تمام کی تمام میری لائبریری۔۔۔ میرا مطلب ہمارے اسپتال میں میری ایک چھوٹی سی لائبریری ہے۔ وہاں یہ سب موجود ہیں اور آپ ان سے مستفید ہو سکتی ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میرے علاوہ کوئی انہیں دیکھنا بھی نہیں۔ نہ ڈاکٹر غازی۔ اور نہ ڈاکٹر شہلہ۔ ہاں پلوٹے کبھی کبھار کوئی ناول وغیرہ مانگ لے تو مانگ لے۔“

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“
”آپ آکر دیکھنے کا ملی بی!“ ان کی آنکھوں میں مخصوص شرارتی مسکراتارنگ ابھر آیا۔
”اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ ہماری بہت اچھی دوستی ہو سکتی ہے۔ آپ بھی کتابوں سے محبت کرتی ہیں اگر فون کرنے میں کچھ دیر ہے تو کچھ کھانے پینے چلیں۔“
”کہاں جائیں گے سر۔۔۔“
”دیکھیے ایبٹ آباد آئیں اور ایلیاسی مسجد کے پکوڑے نہ کھائیں تو بات کچھ بنتی نہیں۔ پکوڑے کھا لیتی ہیں ناں آپ۔“
اس نے فقط سر ہلادیا۔ ”مگر سر! یہ بکس۔۔۔؟“
”میں بلاتا ہوں کسی کو۔۔۔ ٹھہریے۔“

”جھے شرمندگی ہو رہی ہے سرائی بکس اتنی دیر سے لیے بیٹھی ہوں اور لی ایک بھی نہیں۔“

”ارے بی بی! وہ ہنسنے ”آپ میرے ساتھ تھیں اور میں اندر ہزاروں روپے دے کر آیا ہوں۔ آپ ذرا ذرا سی بات پر نیشن کیوں پالتی ہیں۔“

دیکھیے یہ الیاسی مسجد ہے یہاں بہت عرصے سے قدرتی چشمہ پھوٹتا تھا۔ پھر یہاں مسجد بنادی گئی۔ ساتھ مدرسہ جہاں بچے قرآن حفظ کرتے ہیں۔ بلکہ اب یہ ایک سیرو تفریح کا مقام سامن گیا ہے۔ جا بجا چھوٹے موٹے ہوٹل ہیں۔ اور ہم ہمیں کے پکوٹے کھائیں گے۔ اس ٹرپ کا سب سے لازمی کام۔۔۔ کام سے فارغ ہو گئے تو پھر آپ کو ”سمرن ہوٹل“ سے شان دار کھانا کھلایا جائے گا۔ اس سب کو آنے دیجئے۔“

وہ ان کے ہمراہ چلتے ہوئے انہیں بخور سن رہی تھی۔

”آپ اپنی کالز کرنا۔ میں تب تک نماز ادا کر لوں۔“

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا نا؟ بس جگہ مت چھوٹیے گا۔“

اس نے سر زور زور سے نفی میں بلایا منہ سے کچھ نہ بولی۔

☆☆☆

سفید ماربل کی مغلیہ طرز تعمیر سے متاثر الیاسی مسجد اس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ مسجد کے گنبد اور میناروں میں عقیدت اور محبت پیدا کرتے تھے۔ آتے جاتے لوگ، مگن تیز رو۔۔۔ دھیمے۔ سر پر گرم ٹوپیاں گرم چادر سے خود کو چھپائے۔ لکڑی کی گاڑی میں آگ جلائے مٹی کے دانے بھونٹا پھان۔ اس کے پاس رش تھا۔ یہ لوگ مٹی کے دانوں کے شائق تھے۔ یا آگ کی لپٹوں سے گرما ئش سیننے کے لیے نزدیک تھے؟ ایک اخبار والا اخبار کی سرخی زور زور سے پڑھتا بھاگتا جا رہا تھا اور وہ اس سب جھوم اور شور سے زبرد پر سکون گوشہ چن کر آسٹریلار جا سے ہکلام تھی۔

اس کے چہرے پر آسودگی تھی۔ مسرت اور جوش

اس کی آواز کبھی مدہم ہو جاتی اور کبھی وہ جوش و خروش میں فون کو ایک کان سے دوسرے کان پر منتقل کرتے سلسلہ جوڑے رکھتی۔

ایک ہاتھ سے فون تھا دوسرے سے اپنے بیک کی لیس سے لپکتی وہ اس وقت اس ابتلا سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی جس کی آنکھوں میں خالی ہوا تھا۔ جو اکثر بے حد اوس اور چپ نظر آتی تھی۔ خفا خفا۔۔۔ لگے کرتی نگاہیں۔۔۔ انجان۔۔۔ بے یقین۔۔۔ کھول سی خود سے ہکلام۔۔۔

وہ ویسے ہی اپنی عمر سے کم دکھائی دیتی تھی اور ڈاکٹر صاحبہ تو بالکل نہیں مگر اس وقت بے ساختہ ہنسنے ہوئے وہ کھنڈری کان گرل دکھائی دے رہی تھی۔

اسے ایسا بے بند موبائل پر نیل مار مار کے عاجز ڈاکٹر غازی انہیں تلاشتے مسجد تک آگئے تھے۔ غالب گمان تھا کہ وہ نماز کی ادائی کے لیے اندر ہوں گے اس لیے فون بند ہو گا مگر وہ ان کی مرید کہاں گئی؟

وہ ایک درخت کے تنے پر لٹکی دکھائی دے گئی۔ سکھ کا سانس لیتے وہ چائے لینے مڑے۔۔۔ بھوک اور تھکان۔۔۔

تام چینی کی نیلے رنگ کی چدیک اور چھوٹی سی پیالیاں۔۔۔

”ہاں۔ زندگی میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ زندگی پر سکون ندی کی طرح ہو گئی ہے سب خرابیاں خرابی۔“

”یار! خون کی کشش بہت معنی رکھتی ہے۔ رات کو جب نرم گرم بستر میں چھپ کر آنکھیں موندتی ہوں تو سب کے چہرے چم سے آگے آ جاتے ہیں۔ دکھ بس تب ہوتا ہے جب اچھے رویے دیکھ کر دل دکھاتے روپ یاد آ جاتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر مدہم ہو چکی تھی۔

”اچھ شرمہ اور انداز ایاوس سا۔“

”نہیں نہیں رجا۔۔۔ اس نے تیزی سے صفائی دینے کے لیے منہ کھولا تھا۔ ”اب بھی کیس پھنسلو تو فوراً سوچتی ہوں رجا ہوتی تو کیا کرتی۔“ وہ ہنسی۔

بس پھر وہی کرتی ہوں۔“ اس وقت بھی تمہارا بھجھا پنک کوٹ پن پنا رکھا ہے۔ پتا نہیں اچھی لگ ہی رہی

”گال۔“

اس نے لاپرواہی سے ایک کنکرا اٹھا کر دوڑ پھینکا۔

ڈاکٹر غازی نے اسے سر تپا گری نگاہ سے دیکھا اور اس کے قیاس کی دل و جان سے تائید کی، وہ بے حد ماری اور منفور لگ رہی تھی۔

”پاکل ہو تم۔۔۔ میں کوئی پڑوسن پڑوسن کھیل رہی ہوں کہ جی پاپا! چائے کی پتی تم ہے دے دیں۔“ وہ ہلکے ہنسی۔

اور تمہارے مشورے کے مطابق منہ میڑھا بھی کریں تو کیا۔۔۔ کہوں۔۔۔ جی اپنا لپ ٹاپ لوہا روے میں مجھے اپنی بھانجی دیکھنی ہے۔ واہ ارے لو خواہ شوق کیوں نہیں۔ میں تو مری جا رہی ہوں۔ اس کمال اچھا منہ دیکھنے کو۔“

اس نے تلا کر گویا نادیہ طور پر بلا لیں۔

”لے لے۔۔۔ مہلا پارا سبلی۔ سوہنا۔“

ڈاکٹر غازی نے بہت مشکل سے اپنا نقشہ ضبط کیا وہ مدد و بیش کی طرح بیٹھے تھے۔ کب گفتگو کا خاتمہ ہو اور وہ چائے پیش کریں مگر خاتمہ۔۔۔؟ ابھی تو شاید وقفہ ہی دور تھا۔

ڈاکٹر ابتلا فاطمہ ارد گرد سے بے گانہ تھیں۔

ڈاکٹر غازی نے پیانی میں چائے انڈلی اور بھد از ازم ذرا سا آگے ہوا پنا منہ دکھاتے ہوئے پیش کی۔

موصوفہ گفتگو نجانے کب سمیٹتیں ٹھنڈے موسم میں ٹھنڈی چائے؟ اونٹنوں۔

ابتلا کا سارا ادھیان رجا کے جملوں کی جانب تھا۔ وہ اس ادائی چائے کی پیانی مشکرا نہ نگاہوں سے دیکھ کر غامض۔

اب کس بات پر دل کھول کر نہا جا رہا تھا۔ اس بات سے قطعی بے فکر نہ۔ ڈاکٹر غازی ایک طرفہ گفتگو سے بھر مستفید ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے بڑی اذیت سے ساتھ ہی تو بیٹھے چائے حلق سے اتار رہے تھے۔

ساتھ ہی دل کو دھڑکا لگا۔ کنکرا اچھا اچھا کر گفتگو کی خواہش صاحبہ نے اگر پیانی بھی اچھا دی تو۔۔۔

”تم نے درست کہا تھا رجا۔ انسان کو نلہ نہیں ہوتا اور نہ ریت کہ رڑکے۔ انسان نمک سے بنا ہے۔ حل ہو جانا، خم ہو جانا اس کی فطرت ہے۔ تمہیں پتا ہے چینی ٹھنڈے پانی میں دیر سے گھلتی ہے اور گرم میں جلدی۔ یہاں بہت زیادہ ٹھنڈ ہے۔ دیر ہی سے سسی گڑ میں بھی گھل گئی۔“

اس کا جملہ کسی حد تک شریر ہوا اور پھر کچھ خود اذیتی سے بھر گیا۔

”تم یہ فلسفیانہ جملے بہت خوشی سے بھی کہہ سکتی تھیں کہ رجا میں خوش ہوں مطمئن ہوں۔ زندگی کا مقصد ہے۔ کوئی ناقدری نہیں۔ مگر تم کو بھی عادت ہو چکی ہے اپنے دکھوں کا نام ہرگز زنی سانس کے ساتھ کرنا۔“

”ایسا نہیں رجا۔۔۔ مگر میں ان سب کو بھول نہیں پاتی رویوں کو، لوگوں کو اپنے شہر کو اپنے گھر کو۔ میں۔۔۔“

”انسانوں کو کیٹ گرا نر کیا جائے نا تو تم۔۔۔ نوازی ہوئی مخلوق ہوگی اور اگر احمقوں کو درے لگائے جائیں تو تیل میں بھیجے ڈرڈھ سو۔۔۔ تمہارے لیے نا شکر کی فرست تیار ہو تو پانچ سوپکے۔ چھ سات کی فرمائش میں بھی شامل کر دوں۔۔۔ ہونہ۔“

رجا کا موڈ واقعی خراب ہو گیا تھا۔

”یہی سب کے باوجود۔۔۔ رشتے والوں کے ناروا سلوک کے باوجود۔۔۔ مالی پریشانیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی۔۔۔ تم ڈاکٹر بن گئیں ابتلا۔ اور نہ یتیم ٹھوکروں پر ہوتے ہیں یتیم خانوں میں رہتے ہیں اور جمعرات کے جمعرات چار خانہ رویال کندھوں پر سجا تنکوں کی ٹوپی سر پر رکھے۔۔۔ چندھانگے جاتے ہیں۔

رشتے داروں کے غیر انسانی رویوں سے خطی، پاگل نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں مفت کا نوکر بن کر گالیاں کونے، کئے سستے ہیں۔ ان کی اپنی سوچ اپنی خواہش اور اک بزم سب بزم ہو جاتا ہے حکم کے غلام عاجز

بندے۔

”تو کیا میرے ساتھ یہ سب نہیں ہوں۔“ اس نے بہتی آنکھوں سے بھرائی آواز کے ساتھ اسے اچھل کر ٹوکا تھا۔

”میرے ساتھ بھی تو۔۔۔ میں بھی سردی سے کپکپاتی۔۔۔ وال کی بلبل کی قیص میں کوئٹہ کی بستی ہواؤں کو سستی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دعو توں کے بڑے بڑے ٹیلے مانتی تھی جب سب مکان مٹانے کو آڑے ترچھے لڑھکے چائے کے سب لیتے تھے۔ مجھے بھی تو میرے گھر سے کمرے سے، کھلونوں سے دور کیا گیا۔ میرے پاس۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔

”تم تو ہر چیز کی گواہ ہو رہا۔ اس کا لہجہ دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ تمہاری امی نے مجھے سویٹر بن کر دیا تھا۔ تمہارے لپٹ بکس میں میرے لیے راتھا ہوا تھا۔ میں بریک میں گلاس روم میں بیٹھتی تھی کہ میرے پاس۔

میرے گئے چچا، تایا۔۔۔ میں نہیں بھول سکتی۔

”اور پھر وہی چچا تمہارے لیے نجات دہندہ بنے۔ تم یہ کیوں بھول جاتی ہو۔“

”چچا چلائی تھی۔“
”تم رلی نہیں برباد نہیں ہوئیں۔ والدین کی موجودگی عیش و آرام توجہ، محبت ہر شے حاصل ہونے والے بچے کے، کھٹو نکلتے ہیں۔ ناکام، اچھے رزلٹ نہیں دیتے۔ اپنی تربیت پر حرف لگاتے ہیں۔ بدنامی زلت کا موجب بن جاتے ہیں مگر تم۔ اللہ نے کچھ چیزیں لے کر۔۔۔ تمہیں کتنا نوازا دیا محفوظ مستقبل، عزت و ارپوشین محبت سب دی۔ اور میری جیسی ناصح۔

تائی، چاچی پر اٹھے بنا کر نہیں دیتی تھیں تو کیا اللہ نے میری امی کو یہ کام سونپ دیا اور پھر چچا کی محبت۔ اظہار کرنے کے لیے چوچا چلی نہیں تھی مگر ثابت ہوا ان کا ان کنڈیشنل (بے غرض محبت)

تم ان کی نگاہ میں ہمہ وقت نہیں رہیں۔ مگر تمہارے لیے مگر گئے جو سب سے بہترین عمل تھی اور تم۔“

”وہ بہترین عمل۔۔۔ سزا بن گیا۔ میں گھر سے باہر ہو گئی۔ نفرت آگاہت بیزاری نے۔“
اس نے رجا کی بات بے صبری سے کالی تھی۔ آنسوؤں کو سختی سے رگڑتے وہ بولنا شروع ہو چکی تھی۔

”ارے۔۔۔ سوری اتباع۔۔۔ رانیہ جاگ گئی شاید اس نے کپڑے گندے کر دیے۔ سوری یا سہ۔۔۔ میں ذرا اسے دیکھوں۔“

اتباع نے اچانک سیاہ ہو جانے والی سکرین کو گھورا اسے بھراس نکالنے اور اتنے دنوں بعد بولنے سے بہت سکھ مل رہا تھا۔ بے بسی کے احساس نے اسے نہان کر دیا تھا۔ اس نے چند لمبی سانسیں کھینچ کر خود کو دارم اپ کرنا چاہا۔ مگر وہ بائیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اتنے دنوں بعد رجا کو سننے سے ملنے والی خوشی۔

سب بھاڑ میں گئی۔
رجا رجا رجا مقصود۔

اس کا واحد مخلص زندہ رشتہ جس کی محبت اور بے غرضی پر اسے کوئی شک نہ تھا۔ مابوس زندگی کے دلدل میں دھنستے ہوئے اسے مل جانے والا ہاتھ رجا۔ رجا اور اس کی امی۔

رجا اس کی زندگی میں فیصلہ کا فہم بن کر داخل ہوئی اور اس کی امی بزرگ دوست ناصح اس کی فکر کرتیں۔ اسے بچکارتیں۔ ولا سادیتیں۔ ہاں گلاس اڈھا خالی ہی نہیں ہوتا۔ وہ اڈھا بھرا ہوا بھی ہوتا ہے۔

وہ جیسے ماضی کو یاد کر کر اور رو رو کر تھک گئی۔ تڑھال ہو گئی اب رونے میں وہ شدت نہیں تھی۔ مگر وہ قفقے قفقے سے ابھرتی سسکیاں بڑے امتحان کی بات تھی۔

سو ڈاکٹر غازی ”جاؤں نہ جاؤں“ کی تکرار سے پریشان اس کے سامنے آ گئے۔ وہ حسب عادت گرد

بے خبر خود ہی میں مگن تھی۔ ڈاکٹر غازی کرسی سے اٹھ کر کچھ بھی گئے۔

”وہ بڑی طرح جوگی اور آنسوؤں سے اٹھا کر سرخ آنکھیں ان پر نکا دیں۔ بے اور تکلیف کے احساس پر شرمندگی، شرمندگی اور ہنس بولنے کا غم۔“

”اے اللہ الیاسی مسجد کے سامنے چائے کا کپ مزے سے چڑھا لیا۔ یہ نہ دھیان دیا موصوف ساتھ ہی تو اپنے ہیں۔ ہوش اس وقت آیا۔ جب ڈاکٹر غازی نے آفر کی کہ وہ اپنی بھانجی دیکھنے اور بمن سے بات کر کے لیے ان کا لپٹاپ لے سکتی ہیں۔

وہ لپٹاپ ہاتھ میں لیے بوسائے کمرے تھے۔ ڈاکٹر غازی نے اسے پہلے تو اسے تھما پڑا۔

مگر نہیں۔۔۔ یہ باپ بیٹا۔ انہیں ذرا شرم نہیں۔

”یقین کریں جب آپ اندر داخل ہوئیں۔ میں اس کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا بلکہ میں نے آپ کو مسکرا کر بھی دیکھا۔ مگر آپ۔۔۔ آپ شاید بہت زیادہ ایکسائیزڈ تھیں۔ آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔“

”ہیں۔۔۔“ وہ بے حد شرمندہ ہو گئی ”ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

”میں آپ سے زیادہ امیر ہوں ہوں نہ نکلنے کے کھان نہ بیٹھنے کی ہمت۔۔۔ یعنی نہ جانے رفیق نہ پائے۔“

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں ماضی یاد رکھنے کی چیزیں دور پھر ماضی بھی وہ جو تکلیف دہ ہو۔۔۔ آپ حال نظر ڈالنے اور مستقل کے خوب اچھے خواب بننے میں آپ کے دل کا حال نہیں جانتا۔ مگر آپ اپنی نفسی ڈاکٹر ہیں اپنے پیشے سے مخلص۔ قابلیت اور مہندی، فکر مہندی۔ احساس ذمہ داری اور

اس سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر کے لیے کیا ضروری ہو سکتا ہے۔
آپ آج یہاں ہیں کل کہیں اور ہوں گی اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر ہاتھوں ہاتھ بی جائیں گی۔ آپ کے لیے ہر راستہ روشن ہی ہے۔

”کیوں۔۔۔ کیوں۔۔۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کالی۔ گویا کرنٹ کھلایا۔ ”کیوں میں کل کہیں اور نہیوں ہوں گی۔“ وہ بے حد دکھ سے چلائی تھی۔ ”کیا نکلنا میرا نصیب نہیں۔۔۔ میں کہیں جم نہیں سکتی میرے حصے کی زمین کہیں نہیں۔۔۔ میں جب دل لگانے لگتی ہوں۔۔۔ درو دیوار سے محبت کرنے لگتی ہوں، مجھے کہہ دیا جاتا ہے کوچ کرو تیاری پکڑو۔۔۔ آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ کل۔۔۔“

”غم کی شدت نے آواز حلق میں گھونٹ دی۔ اس کے رونے اور پھٹ پڑنے سے حواس باختہ۔ ڈاکٹر غازی غلج سے اس کے لیے پانی کا گلاس بھرنے لگے کچھ بھی پانی چھلک گیا۔

”آئی ایم سوری ڈاکٹر امیر! یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا آپ کے لیے دنیا بہت روشن۔ آپ اور ترقی کریں گی مزید پڑھائی۔ تجربہ۔ آپ کے تو راستے روشن ہیں پلینز۔“

اس نے گلاس بڑھایا۔
اتباع نے ڈبڈبائی سیاہ کھنی پلکوں والی سیاہ آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

شکوہ کنال نگاہیں۔ پھر سر جھکا کر پانی کے گھونٹ اتارنے لگی۔

”آپ لوگ سچ کہہ رہے تھے۔ باڑہ کے کپڑے واقعی بہت شان دار ہیں۔“ اس نے ستائشی نگاہوں سے ڈاکٹر شاہان کو دیکھا۔ وہ ہلکے نیلے اور پراؤن گرم نئے سلے سوٹ میں بے حد بیادری لگ رہی تھیں۔ ”تم نے اس دن انٹرنسٹ ہی نہیں لیا۔ ورنہ چلتیں



جنوری
2013
کے شمارے کی
ایک جگہ

اناطولیہ کا پاسیان
اس کی کہانی سن کر ہر دل میں ہلچل مچا دے گا۔ اس کی کہانی سن کر ہر دل میں ہلچل مچا دے گا۔
اسلم وادی کے نام سے جانے جاتا ہے۔
داسی
دوسری بار دیکھ کر اس کی دلکش سیماں سے دل بہا کر لے گا۔ اس کی دلکش سیماں سے دل بہا کر لے گا۔
جادوگر
ایک بچہ جس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
عذاب
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
دیا اور طوفان
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
رقص اجل
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
قیامت سے قیامت تک
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
خوشی
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
نئی بھرتی
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
روزی قتل کیس
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
گناہ گار
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
ادھوری سازش
میں نے اس کا نام دیا ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔ اس کی زندگی میں جادو کا راز ہے۔
جنوری 2013 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

”ڈاکٹر غنی۔۔۔ نے آپ کو۔۔۔ بس کو پڑھنے کا کہا؟“
 پلوٹہ حیرت سے رک رک کر بولی۔ ”اور چاہی بھی
 دی؟“
 اتباع نے حیرانی سے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ ان
 دونوں کے حق و باطل دیکھ رہی تھی۔

”بس اللہ جانے کون ایسی بے پرکی اڑا دیا کرتا ہے۔
 آسودہ والا نمک استعمال نہ کریں۔ خاندانی منصوبہ
 بندی کے لیے اس میں کچھ ملایا ہوتا ہے۔“
 بولیو کے قطرے نہ ملایے جائیں۔ یہ بھی آنے
 والی نسلوں کی بار آوری کو ختم کرنے کا قطرہ قطرہ زہر
 ہے خواستہ کی کو اس ہونہ! ڈاکٹر شاہان ناگواری
 سے بولتے ہوئے سلمان اٹھا رہی تھیں رکھ رہی
 تھیں۔ وہ بھی تیار تھی۔ دراصل آج انہیں دو کڑیوں
 کی صورت دور اوپر پھاڑی علاقوں کی جانب جانا تھا۔
 جہاں پردے کی بے پناہ بندی تھی۔ اور وہ ہم خود شات
 پر یقین مرتے رہتے رہتے۔ مگر انگریزی علاج سے دور
 بھاگتے انہیں قائل کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ خود تین
 ماہ بعد یا چھ ماہ بعد اپنے علاج معالجے کے لیے اسپتال
 تک چل کر آئیں۔ وہ لوگ خود جاتے۔
 اس بار اسے بھی جانا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر اور پلوٹہ کا جانا ہی ضروری تھا کہ
 عورتیں عورتوں میں گھس جایا کرتی تھیں۔
 بیچوں میں سوار ہونے سے پہلے ڈاکٹر غنی نے
 سب کو بلان دیا۔ وہ سب دائرے میں کھڑے ہمہ تن
 گوش تھے۔ سر اثبات میں ہلارہے تھے۔
 ڈاکٹر شاہان اپلوٹہ دونوں میرے ساتھ۔“
 ”اور آپ ڈاکٹر اتباع ڈاکٹر غازی کے ساتھ۔“
 اتباع غصے۔
 ”وہ۔۔۔ اور ڈاکٹر غازی۔۔۔ اکیسے؟“ چند منٹوں تک
 اس کا ذہن ہر چیز سے خالی ہو گیا۔ وہ اب صرف ہلتے

مندی اور گاجری رنگ کا گرم سوٹ۔۔۔ سیاہ
 خوب صورت تھا۔ لپا بہت ملائم چیتا پرنٹ۔ جبکہ شکل
 سیاہ تھی مگر۔۔۔
 ”میں یہ رکھ لیتی ہوں۔“ اس نے سوٹ اور لپا اٹھا
 لیا۔ ”میرے پاس آل ریڈی ہوٹلک مثال ہیں۔“
 ”ارے کو کوئی بات نہیں پلوٹہ! وہ سفید شاپر۔۔۔
 اتباع دوسری مثال لے لیں گی۔“
 پلوٹہ نے شاپر بیڈ پر پلٹ دیا۔
 ”یہ میں نے اپنے گھر والوں کے لیے خریدی ہیں۔
 میرے بھانجے آتے ہیں برف باری دیکھتے تو لے
 جائیں گے کوئی مسئلہ نہیں۔ ڈاکٹر شاہان اسے ہم
 دلائی۔
 رنگ ہی رنگ۔۔۔ مشکل مرحلہ۔۔۔ مگر اس نے
 یکدم ہاتھ بڑھا کر ایک مثال اچکی۔
 گھر کے نیلے رنگ پر۔ سفید اور گلابی ریشم شیشے کا کام
 تھا۔ پسندیدگی نے چہرے پر مسکراہٹ دوڑا دی۔ وہ
 کراس کی ملازمت کو محسوس کر رہی تھی۔
 ڈاکٹر شاہان کے پھیکے ہاتھ چہرے اور پلوٹہ کے
 چونکنے کو محسوس ہی نہ کر سکی۔
 ”ویسے تم نے اس دن کون سی کتابیں خریدیں۔
 دکھائی نہیں؟“
 ”کہاں خریدیں۔۔۔ خریدنی تو بہت سی تھیں۔
 مگر۔۔۔ وہ اپنی الماری کی جانب بڑھی اور تین کتابیں
 ڈاکٹر شاہان کو دکھائیں۔
 ”صرف تین کتابیں۔۔۔ جبکہ تم تو اتنا شور کر رہی
 تھیں کہ بس اور رسائل لینے ہیں۔ دنیا سے کٹ کر
 بیٹھے ہیں۔ ملی نہیں کیا کتابیں۔۔۔؟“
 ارے نہیں۔ کتابیں تو بہت ملیں۔ نیو بس بھی
 مگر سرکنے لگے کہ ان تین نیو بس کو چھوڑ کر غازی
 کی تمام ان کی لائبریری میں ہیں میں وہاں سے لے کر
 پڑھ سکتی ہوں۔ بلکہ انہوں نے مجھے فاضل چاہی ہی
 دی۔ پرسوں رجا سے بات کرنے میں لائبریری ہی لٹا
 تو تھی۔“

میرے ساتھ تو۔۔۔“
 ”تو پھر اب چلتے ہیں کسی روز۔۔۔“ اس نے کہا۔
 ”بھول جاؤ گی روز کو۔۔۔ نومبر کا آغاز ہے اور ڈاکٹر
 عثمان غنی۔۔۔ یہ جو ہم اس دن پورا دن ایسٹ آباد کے
 چپے چپے میں گھومے ہیں ہم نے دراصل سرویوں کا
 اشاک اٹھا لیا ہے۔ خوراک راشن امدادیاں پکڑنے
 ۔۔۔ اور ہر وہ چیز جس کی ضرورت یہاں اسپتال میں
 سرویوں میں پڑے گی۔ شدید سردی اور اگر برف باری
 ہو جائے تو جانا پتوں میں پانی جم جاتا ہے اور گاڑیوں
 میں پٹرول۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر اسے بند ہو جاتے
 ہیں۔ ایک ڈھیر اس دن خرید آگیا ہے ایک چھوٹی لٹ
 ابھی اور تیار کر لی گئی ہے اور وہ بھی اسی ہفتے بنیادی
 جائے گی۔

جیسے جانور پرندے سرویوں کی تیاری کرتے ہیں
 خوراک ذخیرہ کرتے ہیں۔ اور بعض اپنی اپنی کمین
 گاہوں میں چھ چھ ماہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ ہم
 بھی مانو پونی کرتے ہیں۔ بس یہ کہ انسان ہیں تو
 خوراک کے علاوہ سوا اور لوازمات۔ ڈاکٹر صاحب نے
 تو دو ایمان کا بہت بڑا اشاک اٹھا کر لیا۔ کبھی بھی
 ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم تو اب مارچ ہی کے بعد لکھیں
 گے بہار کے ساتھ۔ اگر تمہیں جلدی ہے تو معلوم
 کر لو۔۔۔ ایک چکر اور۔۔۔ ڈاکٹر شاہان نے اسے
 طویل تفصیل سے آگاہ کیا۔
 ”میں نے تمہارے لیے بھی کچھ چیزیں لی تھیں۔
 سوٹ شمال اور ایک ٹیپا۔ تین روز سے مسلسل کیس
 آتے رہے۔ آج ہی تو شاپنگ پیچھو کھلے ہیں۔
 پلوٹہ ڈاکٹر صاحب کو ان کا بیگ دو۔“
 ”مگر اس کی یا ضرورت تھی؟“ اس نے حیرانی
 سے پوچھا۔
 ”لو کیوں۔ ضرورت کی کیا بات۔۔۔ تم صرف کو
 پسند آیا کہ نہیں۔“
 اتباع جھنجھکی سی کھڑی رہی۔ پلوٹہ ہی نے بیگ
 پلٹا۔

لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ قوت سماعت دماغ تک پیغام نہیں پہنچا رہی تھی۔ دماغ کو کچھ اور ہی سگنل مل رہے تھے۔ جو بیانی اور زبان پر حاوی ہو گئے۔

ہندی رنگ شلوار پیچس پر پشوری ٹوپی پہنے ڈاکٹر غازی اور آشی گلانی گرم سوٹ میں وہ۔

اسے سامنے کے منظر کے بجائے کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا۔

ڈاکٹر غازی کے ہمراہ وہ۔۔۔ نہیں ماموں کے سالے کے ہمراہ وہ۔۔۔ ہاں ایسا ہی منظر تھا۔

وہ کراچی بدر ہونے کے بعد لاہور چلی آئی تھی لاہور ماموں کے گھر وہ مرحومہ ماں کے بھائی تھے۔ اسے ان سے خوشبو آئی۔ مامی کی خلوص کی محبت کی۔ وہ دو ہیال سے بہت محبت کرتی۔ جب اسے وہاں سے نکل جانے کا کہا گیا تب اس کے پاس دو سراٹھکانہ کون سا تھا بھلا۔ ہاں وہ مالی طور پر مضبوط ہو چکی تھی۔ مگر یہیہ ہر مسئلے کا حل ہوتے ہوئے بھی بعض جگہ بے کار ہوتا ہے۔

وہ کہاں جائے گی۔۔۔ وہ کہاں جائے گی؟ یا اللہ۔

اور پھر ماموں نجانے کیسے آگئے اور لمحوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ ان کے ساتھ جائے گی۔ وہ وہاں اپنی ڈاکٹری کی برصائی کرے گی۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

تو کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک تھا اور وہی اس کی اعتبار کرنے والی فطرت۔۔۔ اسے اپنے ارد گرد پھیلی معنی خیز خاموش نگاہوں کی گفتگو بتا بھی نہ چلتی۔ سمجھتا تو دور کی بات۔

وہ ماموں زاد بہن بھائیوں کے اکلوتے ماموں کو ماموں ہی کہتی تھی اور اس کے علاوہ۔۔۔ کہنا بھی کیا چاہیے تھا۔

مگر پلاننگ کیا تھی۔ اس کے اپنے ماموں زاد بہن چھوٹے تھے۔ اسے بہلایا گیا بنایا گیا۔ سمجھایا گیا کہ اس کا مستقبل بہت شان دار ہو گا ماموں کے سالے کے ساتھ لیکن اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی اس رشتے کے لیے اس کے عزائم سیدھے سادے تھے۔ پڑھائی کی روٹیاں۔

اس نے صاف انکار کر دیا اور روسیے بدلنے پر ہاسٹل شفٹ ہو گئی۔

پھر ایک روز ماموں مائی آئے معافی تلافی۔ وہ دوبارہ سے چھٹی میں گھر جانے کی سب ٹھیک تھا مگر نہیں۔۔۔

اسے باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ ماموں مائی نے سالے صاحب کے ساتھ اسپتال لانے لے جانے کا کام دیا۔ اسے نگاہیں تسلیم کر لیا ہے۔

مگر یہ اس کا اعتماد جیتنے کی کوشش تھی۔ ماموں گاگر لاہور شہر کے کافی باہر تھا۔ وہ راستے میں کتابوں کا مطالعہ کرتی گرد و پیش سے بے خبر بیٹھی رہتی۔ گاڑی کا ویرانے میں رکتا۔ سالے صاحب نے بہت دیر تک بوٹ اٹھا کر درستی کی کوشش کی پھر جیسے جھک کر پچھلی نشست پر نیم براز ہو گیا وہ آگے سے اتر آئی۔

”آپ ایسے کیسے لیٹ گئے ہیں چھوٹے ماموں! اندھیرا بڑھ رہا ہے اور اتنی سنسان سڑک۔۔۔ پلینز کو شش کریں ناں۔“ وہ پچھلی نشست پر اس کے پیروں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”کو شش ہی تو کر رہا ہوں۔ ایک سال سے۔“ وہ آنکھوں پر رکھے ہاتھ کو اٹھاتے ہوئے عجیب سا مسکرایا۔

”جی؟“

”اب تو عمل کا وقت ہے۔“ اس نے یکدم ذرا سا اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچا۔ وہ دھڑام سے اس کے اوپر آگری اور جکڑی گئی اس کے پرہوس لہجے میں۔۔۔

”کیا کر رہے ہیں۔ چھوٹے مامی۔“ اتباع کا منہ اس کی گردن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ بمشکل سر کو ذرا سا اٹھاتے ہوئے وہ پوری جاں سے چلائی تھی۔

”اونہوں۔۔۔ چلانے کی کوشش نہ کرنا۔ کوئی نہیں آئے گا۔“ اس نے اس کو ذرا سا ڈھیلا کرتے ہوئے اس کے بال ہلوائے تھے۔

”مجھے چھوڑ دیں۔“ وہ حلق کے بل چلائی مگر ناکامی کا سامنا۔

وہ بری طرح جکڑی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح جھکی جا رہی تھی۔ اس کی پوری کھال اتار کر نمک مرچ لگا کر رکھ دیا جاتا وہ تب بھی اپنی شدت سے نہ تڑپتی چلاتی۔ جتنی جدوجہد اس نے کی مگر آگے باقاعدہ پلاننگ تھی۔ وہ ملی ٹلی ۲۰ تھان بے خبر۔

وہ لھاگ۔ تو مند زور آور اور سب سے بڑھ کر بد نیت ہوس کار۔ ہر شے اس کے لیے سازگار۔

خمر نہیں۔ اتباع کا منہ اس کے شانے کی جانب دیا ہوا تھا اور اس کا سانس گھٹا ہوا تھا۔ گردن میں دل میں کوئی محض نہیں تھی۔

اس نے گردن کے نرم گوشے میں اپنے دانت پورے جسم کی طاقت لگا کر کاڑ دیے۔ بولی یقیناً اس کے دانتوں میں دب گئی تھی آگلی ہی پل وہ آزاد تھی۔

اس نے پوری طاقت سے دروازہ بند کر کے پنڈلی کی ہڈیوں پر شدید چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ ایک جوتا نکلا پھر وہ سرا پھر دوپٹا۔ پھر بال کھل گئے۔

اس کے پیروں میں جھپٹے والے پتھروں کاٹنوں سے نکلنے والا خون پر استوں پر نشان چھوڑ رہا تھا۔

وہ بچ گئی تھی۔ اس نے اپنی عزت بچائی تھی۔ اس نے متعلق چرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ زندگی میں دوبارہ کبھی۔ کسی کا اعتبار نہیں کرے گی۔ ہر شخص کے اندر کیا چلتا ہے۔ نہیں پہچاننا جا سکتا۔ وہ کبھی۔

”نہیں۔“ وہ بری طرح کھوئی ہوئی تھی اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔

”آپ کہاں ہیں ڈاکٹر اتباع؟“ ڈاکٹر غازی نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لگایا۔

”آہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہیں۔“

”کیا نہیں۔۔۔؟“

”میں۔۔۔ مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ وہ قطعی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئی اور کسی چھوٹے بچے کی طرح ڈاکٹر عثمان غنی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ اس نے بالکل

ناجسمی کے عالم میں ان کے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ ڈاکٹر غازی کا چہرہ نا جسمی کے بعد بیکار سا پڑ گیا۔

ڈاکٹر عثمان غنی کو بل بھر کچھ احساس سا ہوا۔ اُنہاں ہاتھ غیر محسوس طور الگ کرتے ہوئے وہ سب کو دیکھ کر مسکرائے۔

”ٹھیک ہے اتباع میرے ساتھ اور ڈاکٹر شاہان‘ پلوٹے آپ غازی کے ساتھ نکلے۔“ انہوں نے بیٹے کو اشارہ کیا۔

”ایسے کیسے ایک منٹ میں۔۔۔ پوری پلاننگ ہوتی ہے عیوں یکدم۔“ شاہان کے چہرے پر حیرت کے بعد ناگواری سی آری۔

”اس اوکے شاہان۔۔۔ کام تو ایک ہی کرنا ہے ناں آپ نکلے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے جیب کی جانب بڑھے۔ اتباع کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی معمول کی طرح پیچھے لپکی۔ گاڑی اشارت کرنے سے پہلے وہ پل بھر کو رے اور اتباع کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا۔ انہیں لگا وہ کہیں اور ہی پہنچی ہوئی ہے۔

”سب ٹھیک ہے ناں بیٹا۔۔۔؟“ وہ ذرا سا جھکے اپنائیت سے پوچھ رہے تھے۔

”ہاں! اس کے منہ سے ٹھنڈا سانس نکلا۔

”میں ٹھیک ہوں سر! آپ چلیے ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

ڈاکٹر غنی نے چند پل رک کر گاڑی اشارت کر دی۔

☆ ☆ ☆

ایک بہترین مصروفیت کے ساتھ گزرا دن خوش گوارت کا دیرپا احساس چھوڑ گیا۔ اس کے اعصاب پر سکون تھے۔ نئے تجربے، نئے لوگ، نمایاں۔۔۔ وہ مگن سی ہو گئی۔ اور یہی اس کی فطری خامی تھی شاید۔ او اس ہے تو گرد و پیش سے بے بہرہ۔ خوش ہے تب بھی ایے خبر۔ کیا ہو رہا ہے۔ ہلکے پھلکے بدلاؤ کا پتا لگنا تو مشکل ہوتا ہے مگر بالکل الٹ ہو جائے تو۔۔۔

اسے ڈاکٹر شاہان کا رویہ کچھ رکھا، الجھا اور خفا سا مروت کے اندر گندھا گندھا سا لگا۔ وہ بے تکلفی اور

انہایت۔ اسے کمرے کا ماحول کچھ ٹھہرا سا لگا۔ شاید وہ ہم۔

مگر مجھ وہاں یا ہر۔ ڈاکٹر غازی۔ اوہ اس دن اس نے کیا کر دیا تھا۔ اس نے کافی کام بنایا۔ خود کوشاں میں لیٹا اور کئی سے بیٹھ کر اس دن کو سوچا اور جی بھر کے سوچا۔ نتیجہ۔ شرمندگی، آفس، پچھتاوا۔

بے خیالی میں کیا کر دیا۔ اسے معذرت کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر غازی جیسے اچھے درد مند انسان۔ ان کے کردار کی پاکیزگی، سوچ کا نکھار ان کے چہرے سے چال و حال سے جھلکتا تھا۔

لیکن اس دن۔۔۔ وہ معذرت کرے گی تاکہ رگڑنے کی حد تک، کسی کے بارے میں غلط گمان نہ کرنا۔ گناہ عظیم ہوتا ہے۔ ہاں۔

وہ خود کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہاں۔ جب ذہن و دل صاف ہوا تو ہر شے اچھی لگنے لگی۔ وہ بہت خوشیے انداز میں ڈاکٹر غازی کے کمرے تک آئی مگر دھڑلے سے دروازہ کھولنے کے اگلے پل ہی سارے جملے ہوا برد ہو گئے۔ دماغ خالی بھک۔ زبان تالو سے چپک گئی۔ اب وہ کیا کرے گی۔

ڈاکٹر غازی اور ڈاکٹر شاہان ٹیبل پر کنہیاں لٹکائے تقریباً ”سرجوڑے بیٹھے تھے درمیان میں رخصی چائے پر کتھنی ہی تہہ جم چکی تھی۔ کوئی گھیر مسئلہ۔ گفتگو میں تیزی تھی۔ مگر انداز سرگوشیاں تھا۔ اس کی آمد نے دونوں کو جب لگادی وہ استغماہیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”آئی ایم سوری۔۔۔ میں بعد میں آتی ہوں۔“

”ہاں۔ نہیں۔ آئیے آپ!“ ڈاکٹر غازی کی جملہ خوش آمدیدی مگر مجھ محتاط تھا۔ وہ متزلزل ہو گئی۔

”میں چلتی ہوں غازی! تم فارغ ہو تو پھر دیکھتے ہیں۔“ ڈاکٹر شاہان نے اپنی ٹھنڈی چائے ایک ہی لیے گھونٹ میں حلق سے اپاری اور کوٹ کلائی پر بجاتی اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتی باہر نکل گئیں۔

”پلیز۔۔۔“ وہ دروازے میں استغماہ تھی ڈاکٹر غازی نے ہاتھ کے اشارے سے کرسی دکھائی کہ ”او“

اور بیٹھو۔“ ابتلع کو اندر آنا ہی تھا۔ وہ بیٹھ ہی گئی مگر بولے کیسے۔۔۔ کہاں سے شروع کرے۔ کیا سیاق و سباق اور جزئیات نگاری سے کام لے۔ یا صرف سہوی کے؟

وہ حسب معمول جملہ تیار کرنے کی ادھیڑ میں گروپ پیش سے بے گناہ ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر غازی نے کھنکھار کے اسے حاضر کرنے کی سعی کی۔

”آل۔۔۔!“ ابتلع چونکی۔ ”میں آپ سے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے یکدم کہہ دیا۔

”یہ میری زندگی کا سب سے اٹوکھا، ناقابل یقین واحد واقعہ ہے۔“ غازی نے فوراً ”کامیابی وہ بھی وہی سب سوچ رہا تھا اور وہ معذرت کا مختصر تھا۔ اسے خواہش تھی وہ گویا انتظار میں تھا۔ ”میں نے ایسی ذلت آمیز، بے اعتباری کبھی نہیں جھیلی۔“

دونوں کے درمیان خاموشی آکر بیٹھ گئی۔ ابتلع کو کوئی جملہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ آٹانہ، مشکل، بے حد، چھوٹے سے اطلاعی فقرے میں سب شکوے سمٹے ہوئے تھے۔

”میں نے کبھی آپ کو۔۔۔ یعنی جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ میں نے آپ کو کبھی شلوار قمیص میں نہیں دیکھا۔“ اس نے جھکی پلکیں اٹھا کر غازی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”واٹ۔۔۔!“ وہ جھج اچھل بڑا تھا۔ اچھنھا مسکراہٹ وہ کیا کتنا چاہتی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی۔ مگر ابتلع بہت دور جا چکی تھی وہ بول رہی تھی۔

”تو وہ بھی ہندی۔۔۔ شاید سواری سے رنگ کا سوٹ۔۔۔

سواری رنگ کے کپڑے پہنا ایک شخص دنیا کا سب سے بُرا انسان تھا اور۔۔۔ اور گلابی رنگ کے کپڑوں میں لڑکی اس وقت اس کائنات کی سب سے بے بس مظلوم لڑکی تھی۔ آپ کبھی بھی ویسے نہیں ہوں گے۔ بلکہ نہیں ہیں مگر تاہم اس وقت میں کہاں چلی گئی تھی۔ میں نے اس روز آتش گلابی کپڑے پہن رکھے تھے۔ آئی ایم سوری ڈاکٹر غازی ا“

اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھیں بے چارگی، بے بسی، اہم، تکلیف جیسے کوئی اسے لوہے کے برش سے رگڑ رہا ہو۔

ڈاکٹر غازی نا سمجھی کے عالم میں اسے تنک رہے تھے۔ جن دقیق بے یقین کیا ہوا ہو گا؟

”آپ یقین کیجئے سر۔۔۔ وہ اس پوری دنیا کا سب سے برا انسان تھا۔ ایسے ہی ہم راستے میں اکیلے تھے۔

ایسی ہی سہوی تھی۔ اس نے بھی سر پر پشاور ٹوپی پہن رکھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ شام۔۔۔ دوبارہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔“ اس کے حلق میں گولا اٹکا۔ اس کے انداز میں بے بسی اور بچوں جیسی معصومیت کے ساتھ شکوہ تھا۔ نہ سمجھا سکتی کی الجھن۔۔۔

”وہ بہت برا۔۔۔ آدمی تھا سر۔۔۔ مجھے لگا۔“ وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ پھر اسے دفعتاً ”وہاں آیا۔“

”مگر میں۔۔۔ نے۔۔۔ اسے۔۔۔ میں جیت گئی تھی سر۔۔۔ جی۔۔۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ پلکیں جھکی سی اور ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ۔

غازی نے سب کچھ بھلا کر اس دھوپ چھاؤں کے منظر کو اپنے دل میں کھینچے دیکھا تھا۔



”وقت سب سے بڑا استاد ہے آج اس کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا۔ گود سے گور تک علم، انکشاف۔ سوانح فاطمہ آج آپ نے یہ سیکھا کہ کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھ دل کتنا ہے اور تکلیف سے آنسو بھی نکل پڑتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو خوش دیکھ کر خوش بھی ہوا جاسکتا ہے۔“

اس نے گرم شال کو اپنے وجود پر مزید کتے ہوئے سوچا۔ آتش دان میں کڑکٹی لکڑیاں اور دہکتے سرخ رنگ کے شعلے مگر مائش مسکھ، سکون و اطمینان۔ اور خوشی۔ شدید سردی سے انگلیاں ٹھنڈی سی تھیں۔ مگر وہ سب بے نیاز سے تالیاں بیٹھتے تھے۔

دوسرے کمرے سے آتے لوگ گیت کی آواز نہ بڑی بوڑھی عورتیں اپنی لرزتی ہیکپیائی آواز میں لمبی

تائیں اڑاتی تھیں ان کے گیت میں خوشی تھی مستقبل کے خواب۔ دعائیں۔ کچھ اشعار چلے جانے والوں کا نوحہ بھی تھے۔ موسمی کی سختی اور اپنی جفاکشی کے قصے۔ جو گانا نہیں سکتی تھیں۔ وہ بولے منہ سے سمراتی تھیں کہ ہم گانے والی سے متفق ہیں۔ ہم خوش ہیں۔ گاؤ گاؤ اور گاتے جاؤ۔۔۔ کچھ زندہ دل خوشی سے جھومتے ہوئے کھڑی ہو جاتی تھیں اور ایک دائرے کی صورت کھڑے ہو کر ہاتھ اور کر کے گھما گھما کے رقص کرتیں۔

معزز مہمان ڈاکٹر صاحبان کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ رقص میں حصہ ڈالیں مگر بڑی مشکل سے دونوں ہی نے انہیں تالیاں سینے پر ہی راضی کیا۔

کمپاؤ ڈریوسف کے ہاں شادی کے سترہ برس بعد جڑاں بچے ہوئے تھے بیٹا، بیٹی۔ بے نام و نامور اور بچے کا دکھ ستنے یوسف اور خالدہ کے لیے یہ مجروح تھا۔ مایوسی کے گھپ اندھیرے سے اچانک روشنی کی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔ اجالا اتنا۔۔۔ اتنا۔۔۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا۔

ایک مشکل کیس۔ خالدہ کی بڑی عمر۔ بلند پربشر اور سوتلا حس۔ مگر ڈاکٹر شاہان کی مہارت اور بے حد دلچسپی۔ ابتلع اور پلوٹو شہد گانے۔

”اور اگر آج یہ اسپتال نہ ہوتا اور اگر اتنے قابل ڈاکٹر نہ ہوتے۔

لیکن جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اپنی زندگی کے حوالے سے ہر فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیں ہی دیا جاتا ہے اور پھر ہم ان اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تب ہم کو ”اصل اختیار“ غیر محسوس طریقے سے چھینوڑ دیتا ہے کہ میں ہوں اور یہ چاہتا ہوں۔

اور تب ہی ہم کسی غیر مرئی مقابلے کی کشش کے سہارے وہاں تک کھینچے جاتے ہیں جہاں دراصل ہمیں ”ہونا چاہیے تھا“ ہم باپ بیٹے کا یہاں آنا اگر ہم اپنی دس سالہ پلاننگ پر نگاہ ڈالتے تو ڈاکٹر میں دس سالوں کے دس دن بھی یہاں کے لیے نہیں تھے مگر اب دیکھو، اصل پلان میکر نے ہمیں آنکھ بھروسوں سے

یہاں پہنچ دیا بلکہ جمادیا۔ شرا دیا۔ اب تو لگتا ہے صدیوں سے یہیں کے ہیں۔ اور رحمت یہ ہوئی کہ کوئی پچھتاوا نگاہ باہر نہیں ہر نکلتا دل کو خوشی دیتا ہے اور خود پر محسوس ہوتا ہے وہ کہتا ہے جو میرے بندوں سے پیار کرتا ہے وہ مجھے پیارا ہے۔ تو ہم کو کشش کرتے ہیں کہ ہمیں بندوں سے پیار ہو اور ہم کی درس دینا چاہتے ہیں کہ بندوں سے پیار کرو۔ جس حد تک جس طرح کر سکو۔ بس۔“

ڈاکٹر غنی نے اس کے سوال کے جواب میں بہت محبت سے کھوئے لہجے میں وجہ بیان کی تھی۔ ”ہم ہونی سے ناواقف ہوتے ہیں جبکہ اسے ہو کر رہنا ہوتا ہے۔ زلزلوں سے نشان پھٹ جاتی ہے اور پہاڑ آٹھ میں ڈالنے کا سرمہ۔ مگر یہی زلزلے بعض مہر لگے دلوں کو پھاڑنے سے قاصر ہوتے ہیں۔“

”ہم میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو پچھٹی زمین کو دیکھ کر آنکھیں پھاڑتے ہیں۔ مگر ان کے دل نہیں سمجھتے۔ اپنی بد اعمالیوں بد عیوب پر قائم رہتے ہیں۔ مجھے خود پر حیرت ہے کہ میں نہیں اپنے دل کے انتہائی اندر کی بات بتا رہا ہوں مگر۔ خیر۔۔۔“

کراچی جیسے شہر میں رہتے ہوئے آپ کسی اور جگہ پر رہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اس شہر میں سحر ہے جو جکڑ لیتا ہے۔“

اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ بھی تو یہی سوچتی تھی۔ منہ پھونکنے والی ہوائیں۔ ساحل کی ریت۔ جب ہی تو وہ لپکتی تھی۔

”تمہیں شاید میری بات بہت عجیب لگے ہو سکتا ہے ناگوار گزرے۔“ ڈاکٹر غنی نے بے نیازی سے شانے اچکائے تھے مگر ہر حال یہ ایک حقیقت ہے۔ یا اگر تھوڑا مارجن دو تو اسے میرا ذاتی خیال کہہ سکتی ہو۔ وہ پیسٹ کھاتے ہوئے الفاظ جمع کر رہے تھے۔ ”ڈاکٹر بے حس ہوتے ہیں احساسات سے عاری اب خود سوچو جو آنے والے کو خوش آمدید اور جانے والے کو ودیاع ملنے کی آس نہ دے کہ اچھا جی پھر ملیں

گے اس انسان کا سنگدل کھانا تو بنتا ہے ناں بد اخلاق۔ وہ بنے تھے اور اگر کوئی بہت سی محبت لگاؤ جھانسنے پر آئے۔ پیروں کی طرح دعا دینے پر آجائے تو وہ یہ کہ خدا آپ کو دوبارہ یہاں بھیج نہ لائے۔“

جملے کے اختتام پر ان کی ہنسی میں ابتلا کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔ ”میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ کسی حکمران نے حکم جاری کیا کہ تمام سلطنت کے لوگ فلاں تالاب میں ایک ایک گلاس دودھ ڈالیں۔ تاکہ وہ صبح تک بھر جائے۔ یہ حکم اس لیے کہ معلوم ہو کہ یہ شخص اپنی ذات میں کتنا عمل دار ہے۔ اب ہر شخص نے یہ سوچا کہ ساری مملکت کے لوگ تو ڈالنے جائیں گے ایک میں نہ گیا تو کیا فرق پڑتا ہے کیسے پتہ چلے گا تمہیں گے ایک اگلی صبح تالاب جوں کا توں خالی تھا۔ کیوں کہ مملکت کے ہر فرد نے یہی سوچ رکھا تھا کہ ایک میں نہ گیا تو۔ کیا ہو گا۔“

اور تمہیں اب شاید حیرت ہوگی کہ حصہ نہ ڈالنے کا ارادہ باندھنے والا ایک فرد میں بھی ڈاکٹر غنی نے نگاہیں دیوار پر نکادی تھیں۔ وہ چونک چونک گئی اور کچھ نہ سمجھی۔

”2005ء کا زلزلہ ساری قوم کو جگا گیا۔ ہم نے اپنے تئیں اتنا فرض پورا کیا کہ وہاں ترح ہوئے۔ سامان کو اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے پیک کرنے اور نام و مقام لکھنے ہی کو کل سمجھا سازی ڈاکٹر ز کے ساتھ وائیکسٹری طور ان علاقوں کی طرف جانے کا کہنے لگا تو میں نے منع کر دیا۔ یہ سب میرے آبائی علاقے تھے۔ میں سالوں پہلے ان سب کو چھوڑ کر بہت آگے بڑھ چکا تھا اور واپسی کے لیے پیچھے۔ کوئی وجہ نہیں۔ کچھ میرا استہسا کا مسئلہ۔ میں گزرتا رہا۔ جان چھڑاتا رہا۔ ہم کر تو رہے تھے جو کر سکتے تھے۔ اتنے سب لوگ ان علاقوں میں چلے جاتے تو یہاں کون رہتا۔ مگر غازی جوان خون ٹھان چکا تھا۔ میں نے اسے لاکھ ان علاقوں کے موسم سے ڈرایا مصعوتوں پر دھیان دلایا۔ مگر وہ طے کر چکا تھا۔“

وہ میرا بہت لاڈلا بیٹا مکمل سرمایہ ہے۔ میں اس کے لیے فکر مند تھا۔ اس کی جلد واپسی کا شکر۔ ”آپ کے خیال سے بابا میں آؤنگیا ہوں مگر میرے پاس دن آنے میں نمک بھی نہیں۔ وہاں زخم ہیں درد ہے اور آنسو۔ دس سال بھی کم ہوں گے چیزوں کو واپس جگہ پر جانے کے لیے۔ ہم سب لوٹ آئے ہیں اور جو ہیں وہ بھی پلٹ جائیں گے۔ مگر وہاں تمام ارباب میں لوگوں کو قوتی توجہ کی نہیں۔ پوری سرپرستی کی ضرورت ہے ہر حال میں۔“ وہ دکھ سے چور چور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”دو ایناں، پکڑے، دودھ بمکٹ، بکبل، بابا! وہاں تو وہ لوگ ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ پولی فیکس لگاتے ہیں کہ کھاتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ لوٹ آؤ۔ سب بہتر ہو جائے گا۔ کیسے ہو جائے گا بہتر۔ کون رکا ہے وہاں بہتر کرنے کے لیے۔“ وہ بہت آزرہ اور باؤس تھا اور اس کے ان جملوں نے مجھے بہت سال پہلے کا منظر یاد کر دیا۔

جب اپنے باپ کی بیماری پر امدادی کیمپ سے ملنے والی بہت مہنگی دوا چلے گئی تھی۔ مگر میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا کہ کیسے استعمال کروں۔ کب کر لوں اور۔۔۔

تب مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میں نے عہد کیا تھا کہ میں اس قابل بنوں گا کہ مجھے پتا ہو اور میں سب کو بتاؤں کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ مگر وعدوں کو فراموش کرنا اور دعاؤں کی مستجابی کے بعد اللہ کی رحمت کو بھول جانا انسانی فطرت ہے۔ غازی تو اٹھ کر چلا گیا مگر میں جہاں کا تھاں جم گیا۔

یہ سب میرے پڑھوں کی زمینیں تھیں میں چپے چپے سے واقف۔ اور بس اب تو بھول ہی گیا کہ اس دنیا سے پرے بھی ایک دنیا ہے تب یہی دنیا ہے اور یہی خاتمہ۔“

ابتلا حرزہ تھی۔ لوگ کیسے ہوتے ہیں اور کیسے ہو جاتے ہیں۔ اچھے سے برے اور برے سے اچھا۔ تو کیا وہ بھی یہاں آئی نہیں ہے۔ بھیجی گئی ہے

مگر کیوں۔۔۔؟؟

”مجھے نہیں پتا تمہارے یہاں آنے کی وجوہات ارادے، خیالات۔۔۔ مگر میں تمہیں یقین دلا دوں معاوضہ، وقت، محنت سب اپنی جگہ اٹل مگر ہر حال تم ایک نیکی کا حصہ بن گئیں۔ ہر وقت اداس اور روٹی پالی جاتی ہو۔ کوئی چیز تمہارے دل کے لیے نہیں ہے۔ نصیحت کرنا مجھے پسند نہیں۔“

مگر باری بیا! تم کم از کم مجھ سے یہ یقین لے سکتی ہو کہ تم نیکیاں جمع کر رہی ہو اور ان نیکیوں کو نیک میں جمع کرواؤ نہ کرواؤ مگر ان پر سو لگتا رہتا ہے۔ دو کنا چوگنا اور یہ سود حرام نہیں ہوتا۔“

وہ انداز مخاطب پر انہیں تادیب کرنا چاہتی تھی۔ مگر ان کے جملے کے اختتام پر اس کی آنکھیں جھرجھرنے لگیں۔

ہاں۔ وہ اپنی زندگی کو اس نظر سے بھی تو دیکھ سکتی ہے۔

”سارے قصے سے قطع نظر ابتلا۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ لوح محفوظ پر ہر شے لکھ دی گئی۔ تو ساری وجوہات، حالات اپنی جگہ مگر اس کے لیے یہ جگہ بھی رکھی گئی تھی۔ تو خوش رہو اور نصیحتیں بیشہ کاٹ دار نہیں ہوں گی۔ وہ بے ضرر چٹکی کا احساس بھی ہو سکتی ہیں اگر ان کے اندر چھپی حکمت کو بھانپ لیا جائے اور تسلیم کر لیا جائے۔“

اور اس وقت یوسف اور خالدہ کی خوشی میں تالیاں پیٹتے وہ اتنی خوش تھی اتنی کہ شاید ہی کبھی اتنا کھکھلا کر نہ ہئی ہو۔

اندر محبت کی گرماش تھی۔ باہر برف کھڑکیوں دروازوں سے ٹکرا ٹکرا زمین بوس ہوئی جاری تھی۔

”آپ بستر آجائے ڈاکٹر شان۔!“ ابتلا نے آواز دی۔ وہ بہت دیر سے آرام کر رہی پر کبلی میں چھپی الطاف فاطمہ کی ”چلتا مسافر“ پڑھ رہی تھی۔ آتش دان کی چٹکی لکڑیاں بھی اس کا آٹھاک توڑنے

سے قاصر تھیں۔

وہ تو بس یونہی ورق پلٹتے ہوئے سامنے کھڑی پر نگاہ
پڑی تو وہ چونکی۔ ڈاکٹر شاہان نجانے کب سے کھڑی
تھیں اور باہر دیکھتی تھیں۔ گہری سوچ، کچھ حسرت
کچھ ملال چہرے پر اپنی اپنی باری سے آتے جاتے تھے۔

ان کے وجود پر اکثر و بیشتر ایک نسل کی سی کیفیت
چھا جایا کرتی تھی۔ کبھی وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتیں۔ ابتاع
اچھ جاتی وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر اول روز کی تادیب۔۔۔
”مجھے یہاں کبسل میں آگ کے پاس بیٹھ کر بھی ٹھنڈ
لگ رہی ہے اور آپ کب سے یہاں ہیں اب بھی
واش روم جانے کی مجبوری سے اٹھی ہوں۔“ اس نے
کہا اور کھڑکی کے شفاف شیشے سے باہر جھانکا۔

یوسف کے کچھ دور دراز کے دوست بچوں کی
مبارک باد دینے آئے تھے۔ یوسف نے ان کے
کھانے پینے کا خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ تمام اسپتال
کے مرد بھی مدعو تھے اور اب شاید کھاپی کرفارغ تھے۔
جب ہی الاؤ کے گرد شدید ترین سردی سے بے نیاز
خوشی منانے کے لیے رقص کر رہے تھے۔ ایک دیہاتی
کوئی ساز لے کر بیٹھا تھا۔ وہ کچھ گامی رہا تھا۔

مزے کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر عثمان غنی اور ڈاکٹر
غازی بھی رقص میں شریک تھے اور ان کی مہارت
قابل دید تھی۔

”یہ تو بڑے مزے کا سین ہے“ وہ مزے سے بولی۔
”واؤ۔۔۔ حیرت ہے ان لوگوں کو سردی نہیں لگ
رہی۔“ اس نے سوال شاہان کو پیش کیا۔

”الاؤ دھک رہا ہے اور رقص تو ویسے ہی رگوں میں
خون کو دوڑانا ہے بلکہ انہیں تو شاید گرمی لگ رہی ہو
۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ مجھے واقعی سردی لگنے لگی ہے۔ تم بھی
آجاؤ۔“

ڈاکٹر شاہان جواب دیتے ہوئے پلٹ گئیں۔ ابتاع
نے جی بھر منظر دیکھا اور واپس اپنی جگہ پر اکسل میں
کچھ مجھ ہو گئی۔ وہ اپنی ٹھنڈی ہتھیلیاں آگ سے
تپنے کو آتش دان کی جانب جھکی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر شاہان نے اپنی کرسی بھی آگ سے نزدیک
ترین جمائی۔ وہ یہاں بیٹھ کر اپنے موبائل کے گانوں
سے لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔ ابتاع نے دوبارہ کتاب
کھول لی۔

”ڈاکٹر شاہان۔۔۔!“ اس نے دفعتاً پکارا۔ ان کے
کانوں میں پینڈز فری لگی تھیں۔ سو متوجہ نہ ہوئیں تو
ابتاع نے عجلت سے ان کا ہاتھ ہلایا۔

”کون سا گان سن رہی ہیں۔ کیا ہوا بھلا۔۔۔ چہرے پر
انتانم اتنا شدید ادا اس رو دینے والا تاثر۔۔۔“

وہ بری طرح چونکی مگر آنکھ کھلتے ہی چہرے کے تاثر
میں صرف ”سوال“ رہ گیا باقی سب غائب، آئی ایم
سوری۔۔۔ دراصل۔۔۔“

موراسیاں موسے بولے نا
میں لاکھ جتن کرہا ری۔۔۔ میں لاکھ۔۔۔

بہت مدہم سی آواز پر بھی اس نے گانا پہچان لیا۔
شاہان نے سرعت سے آف کاٹن دیا دیا۔

”نہیں کچھ نہیں۔۔۔ بعض گانے، جملے آپ کو
ٹرانس میں لے جاتے ہیں۔“ وہ پھر خود کو چھپا چکی
تھیں۔ ”تم بتاؤ کون سی کتاب پڑھ رہی ہو دونوں سے
تمہارے پاس ہے۔ کیا ہے بھلا یہ۔۔۔؟“

ابتاع نے ٹھنڈی سانس بھری۔ (ہاں ٹھیک ہے
نال ہر شخص کے دل دنیا اس کی ملکیت ہی ہے۔ جواب
دینا اتنا ضروری بھی نہیں۔

”چلتا مسافر۔۔۔“

یہ کیسا نام ہوا، مسافر ہے تو چلے گا ہی ناں۔۔۔
”نہیں نہیں۔۔۔!“ ابتاع نے سرفنی میں ہلایا۔

یہ بہت ہی شاہکار ناول ہے الطاف فاطمہ نے اس
ناول کو نگلے دیش کے پس منظر میں لکھا ہے۔

مرکزی کردار نہیبیا ہے۔ یہ خاندانی لوٹڈی ہے۔
آبوسی حسن کی مالکہ، ایک انتہائی خوب صورت شہزادہ

فدا ہو جاتا ہے اس پر مگر وہ پوری مضبوطی اور وقار
سے اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے بھی

واقف ہے اور زندگی کے حقائق سے بھی۔ محبت کی
آج اس کے دل تک پہنچتی ہے لیکن وہ نہ جل کر راکھ

ہوتی ہے اور نہ اپنی ہستی کو فراموش کرتی ہے۔ وہ عملی ہے۔ خوابوں خیالوں سے پرے۔ پھر زندگی کے ایک موڑ پر وہ اپنے ہی جیسے ملازم سے شادی کر لیتی ہے جس کی بیوی پانچ بچے چھوڑ کر مر جاتی ہے اور وہ کہتی ہے۔ زندگی خوابوں خیالوں کی نذر کرنے والی شے نہیں۔ اسے کسی کے کام آتا ہے۔“

اس نے کسی رٹوٹوٹے کی طرح نصیبیا کے کردار کی وضاحت کی تھی۔

”یہ بیک میں نے کئی سال پہلے بڑھی تھی مگر کرائے پر لے کر۔ سر کی لاجبیری میں نظر آئی تو فوراً لے آئی۔ سرکتے ہیں کہ۔“

”ڈاکٹر غنی کی کیا رائے ہے۔ اس کردار کے بارے میں؟“ ڈاکٹر شہلان نے اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ۔۔۔ تو بہت ہی متاثر ہیں اس کردار سے بھی اور کہانی کی بہت سے۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے برصغیر کی عورت کی اصل شبیہ ہے۔ نسوانیت اور محبت سے گندھی عورت، ممتا سے بھرپور وقار کی علامت جو تمام عمر دکھ اور درد سے بھی سکھ فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔“

”اتباع! بیاہل کی آواز کے پیچھے جانا بے وقوفی ہے ڈلت ہے۔“ شہلان نے پوچھا۔

”میرے خیال میں تو نہیں۔“ اتباع نے پرسوج لہجے میں کہا۔ ”لیکن دل غنی وارنگ کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیے۔“

”یہ تو بڑی بے ہودہ بات ہوئی نال کہ دل میں کسی اور کو بسایا جائے۔ اور گھر کی اور۔۔۔ کا۔“

”ارے نہیں۔ نصیبیا نے ایسا کیا۔ لیکن اس نے ناممکن کے حصول میں زندگی گزارنے کے بجائے زندگی کی حقیقتوں کو ترجیح دی۔“

”چھوٹو نصیبیا کو۔“ شہلان نے بیزار سے کہا مگر انداز کچھ کھیا کھیا سا بھی تھا۔ ”یہ بتاؤ کیا محبت کو حاصل کرنے کے لیے کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

”جانتا نہیں ڈاکٹر شہلان۔ مگر۔“ وہ جملہ بنانے کو

شہری۔ ”محبت ریاضی کا سوال نہیں ہوتی کہ بار بار کی کوشش سے حل ہو جائے گی۔ کوئی نہ کوئی فارمولا جواب تک لے جائے گا۔ محبت تو شعاعی کی طرح دل پر وارد ہونے کا نام ہے۔ یہاں کوئی کوشش کام نہیں آتی۔“

”تت۔۔۔ تم اتنے وثوق سے اتنی گہرائی سے محبت کا فلسفہ کیسے بیان کر رہی ہو، کیا تم نے کسی سے محبت کی؟“

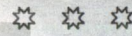
شہلان نے اپنی پتلا بھول اسے ٹوکا اور وہ جو کھوئے انداز میں کہیں اور تھی۔ بری طرح چونک کر بیٹھی۔

وہ کیا جواب دیتی۔ وہ تو خود اس امر سے انجان تھی کہ ایک شخص کے قدموں کی چاپ کیسے اتنے شور میں بھی پہچان لیتی ہے۔

”مجھ خوشی لے کر آتی ہے کہ وہ بس ایک نظریہ کہ لے۔“

شام دکھ اواسی کہ یہ کالک سفیدی کا لبادہ کب اوڑھے گی اور اور وہ اسے دیکھ سکے گی۔

تصویر کے تصور بننے میں شاید ابھی وقت تھا۔ گمان سے یقین کا سفر۔ پر خطر۔



ہم خواب دیکھتے ہیں خواہش کرتے ہیں ارادے باندھتے ہیں تو دراصل اللہ کے پاس موجود جراثیم سب کچھ دوج کرواتے جاتے ہیں۔ پھر وقت آنے پر اس کے حکم سے ہر چیز ظہور پذیر ہو جاتی ہے سوطے ہوا کہ خواہش خواب اور ارادہ شرط ہے۔

سو یہ خواہش بھی پورا ہونا تھی۔ اس نے بہت خوش دلی سے سوچا تھا۔ طراب ہر بار ناکام ہو ہو کر بد دل ہو کر بیٹھی تھی۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود سنوین بتائی نہ پاری تھی ایک قد آور سنوین۔

پلوٹے، ڈاکٹر شہلان ڈاکٹر غازی۔۔۔ خان بابا ڈورا پور کے نو عمر بیٹے سب لوگ کچھ نہ کچھ بنا کر اب خیرے اپنی پیش کش کے ہمراہ کھڑے تھے۔ نوک پلک سنوارے، صرف وہ تھی جو سر پکڑے بیٹھی تھی۔

”آپ مقابلے سے آؤٹ ہو جائیں گی، ٹائم ختم ہو کر ہے۔“ پلوٹے نے کہا۔

”کیوں؟ کیوں؟ مجھے دوسروں سے زیادہ ٹائم دیا جائے۔ میرا فرسٹ ایکسپریس ہے۔“ اس نے نقطہ نکالا۔

ڈاکٹر عثمان غنی جج کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کا سر اثبات میں ہلا۔ وہ اتنے سال بعد ہونے والی بے حد برف باری سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے وزن سے چونے گرم کپڑے پہنے ان کے ہمراہ انجولے کرنے آتے تھے۔ ڈاکٹر غازی اپنے بابا کی وجہ سے فکر مند تھے۔ وقتاً فوقتاً فلاسک میں سے قہوہ ڈال کر ہمدردی اور مسلسل چلوڑے کھانے پر زور دیتے ڈاکٹر غنی کو ایسا موسم اس نہیں آتا تھا۔

برف کی سفید چادر ہر شے کا حجاب بن گئی تھی ہر رنگ روپ غائب تھا۔ سفیدی سفیدی پاکیزگی کا پرتو

پہاڑوں پر جہی برف اور آسمان کا رنگ ایسے ہم آہنگ تھا کہ باقاعدہ نظر لگانا پڑتی۔ پہاڑ کا ختم اور آسمان کہاں شروع۔

”نہیں بننا مجھ سے۔“ اس نے بار بار کر برف پر ٹھوکر مار دی۔ وہ بہت زیادہ افسردہ ہو گئی تھی۔ بار بار ہانکی۔۔۔ ہونہ۔ سب اپنے اپنے شاہکار کے ساتھ تصویریں بخوار ہے تھے۔

”آپ بھی ادھر آکر تصویر بنوائیں۔ یہ موسم جانے پھر کب آئے۔“

”ایسے ہی کیوں خوا خواہ۔“ اس نے زونٹے پن سے کہا۔ ”میرا اپنا تو بتانا نہیں مجھے نہیں پرانے پر حق جمانا۔“ اس کے چکانہ انداز پر سب ہنس دیے۔

”میں بتاتا ہوں تم کہاں غلطی کر رہی ہو۔“ ڈاکٹر عثمان غنی اس کے پاس آگئے۔

”بنیاد مضبوط ہونی چاہیے۔ تمہیں برف جمانا نہیں آ رہی۔“ وہ برف کی ڈھیریاں اٹھانے لگے۔

”ارے بابا۔ کیا کر رہے ہیں تمھنڈ لگ جائے گی۔“ غازی چلایا۔

”چھوٹیں ڈاکٹر عثمان غنی! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر شہلان جلی آپس۔

پلوٹے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے کرنے دو۔ بس پانچ منٹ۔۔۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے اسے بنیادی خای بتانے لگے۔ اب سب اپنا کام چھوڑے ان کے گرد جمع تھے۔

سارا کام اسی نے کیا مگر ہر حال ڈاکٹر عثمان غنی اس کے مددگار تھے اور ان ہی کے مدد کے سہارے اس کا سنوین اپنے پورے قد سے کھڑا تھا۔

”بابو! اس نے بچوں کی طرح اچھل اچھل کر خوشی کا اظہار کیا۔ سب کی تائیلوں نے اس کے چہرے کو گھل کر دیا۔ سب نے اپنے موبائل سے تصاویر بنائیں۔

”ڈاکٹر غنی کی تکنیک ہے ساری۔“ ڈاکٹر شہلان نے ڈاکٹر غازی سے کہا۔

”محنت میری ہے۔“ وہ چلائی۔

”وہ تو آپ بہت دیر سے کر رہی رہی تھیں۔“ غازی نے چیخاڑا سب ہنس دیے۔ اس نے خفا نگاہوں سے ڈاکٹر غازی کا چہرہ دیکھا اور اپنے سنوین کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اس کے سر پر تو نپا ہی نہیں۔۔۔ اور مقرر۔“ اس نے اپنا میوٹ مقرر اس کے گلے سے باندھا۔

”اب نپا۔۔۔؟“ اس نے متلاشی نگاہیں کھنائیں۔

”نپا پہ لے لو۔“ ڈاکٹر عثمان غنی نے اپنے سر سے میوٹ پھندنے والا نپا آگے بڑھ کر سنوین کے سر پر لگا دیا۔

اتباع سمیت سب حق دق رہ گئے۔ بل بھر کو سناٹا چھا گیا۔ ان کے سر پر اب ہلکی تہہ والی گرم ٹوپی تھی۔

”ٹھنڈ لگے گی بابا۔۔۔ پیار پڑ جائیں گے آپ۔“ غازی نے کہا۔

ڈاکٹر شہلان نے بے بسی آمیز ناگواری سے یاد دلایا۔

”پھر سانس لینے میں تکلیف ہوگی مارے۔“

”اتباع کی تصویر تو ہو جائے ذرا۔۔۔“ وہ بولے۔

ان کے متوجہ کرنے پر سب سنوین کو دیکھنے لگے۔ وہ جگ گیا تھا۔ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ سب کے مویاں نکل نک چل رہے تھے ”میں رجا کو سمجھوں گی“ تصویریں۔ اس نے کہا۔ ”دفعاً“ اسے بہت پرانی خواہش یاد آئی۔

”سنوین دوست دوست سا لگتا ہے اپنا اپنا سامیں اس کے ساتھ چھٹا ڈال سکتی ہوں ابو! وہ یکدم سنوین سے لپٹ گئی۔ ابو اسے لگا وہ اسے کہیں سے دیکھ رہے ہیں اس کی معصوم بچپن کی خواہش پوری ہونے پر خوش ہیں بہت۔۔۔

مگر۔۔۔ اس کی چیمپی میں کچھ زیادہ ہی شدت تھی۔ اگلے پل ہی سنوین دھڑام سے گر کے اس کے قدموں میں برف کا ڈھیر بن گیا اس کے پیروں سے گئے۔ وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑی اور بار بار پاؤں اٹھا کر برف کو جھٹکا۔ اسی اچھل کود میں میون پھندے والا ٹپا اس کے پیروں تلے اگیا اور گرید اگیا۔

”ہاں آں۔۔۔ اس کی آنکھیں خوف، شرمندگی، غیرت سے پھٹ پڑیں۔ ”یا اللہ! اس نے تیری سی تیزی سے ٹپا اٹھایا جھاڑ اور سینے سے لگا لیا۔“ آئی ایم سوری۔ آئی ایم سو۔“ ٹوٹے جملے کے ساتھ آنکھ سے موتی بھی ٹوٹ ٹوٹ نکلے اس کا چہرہ خفت سے سفید ہو گیا تھا اور ہونٹوں پر لرزہ۔

”کوئی بات نہیں لاؤ وہ کیا ہو گیا؟“ ڈاکٹر غنی نے مشفق انداز میں کہا اور ہاتھ بڑھایا کہ ٹپا لے لیں۔ ”نہ۔۔۔ نا۔۔۔ نہیں۔“ وہ دو قدم پیچھے ہو گئی۔ سب کے لیے یہ بہت عجیب صورت حال تھی۔ ”یہ۔۔۔ اب سر پر رکھنے کے قابل نہیں۔۔۔ رہا۔۔۔ آئی۔۔۔ سوری۔

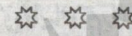
”بے وقوف ہیں آپ۔ کیوں نہیں رہا قابل گامیں دیں۔“ ڈاکٹر غازی آگے آئے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر دھکا ”نہیں۔

میں۔۔۔ میں آپ کو ناپا لاکر دوں گی۔ یہ نہیں۔ نہیں۔“ اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے تھے۔

گھڑی بھر کا وقفہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔ ٹپا سینے سے لگا تھا اور پھندنا ہونٹوں کو پھونک رہا تھا۔ اس نے جذب کے عالم میں ٹپا کے پھندے کو پورے دیا۔ وہ یکدم مڑی اور برف پر گر پڑے بھاگتی جلی گئی وہ جلد از جلد اس ماحول سے اس شرمندگی سے نکلتے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

ٹپا سر کی عزت، پگڑی۔ اس کے پیروں تلے مل گئی ہائے۔ اس کی بے کلی کو آرام کہاں۔۔۔ ڈاکٹر عثمان غنی اس کے لیے کیا تھے؟ کاش وہ چاہتی۔

وہ ساری رات کمر میں منہ دیے رو رہی۔ تمام لوگوں کے لیے اس کا رویہ ناقابل یقین ناقابل فہم اور۔۔۔ اور۔۔۔ ناقابل۔۔۔



صبح ہسپتال میں بھی اس کی سوچی آنکھیں سب کو متوجہ کرتی رہیں۔ وہ بہت افسردگی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔

برف باری کے بعد نزلے زکام اور کچھ نمونیہ کے مریض آگئے تھے۔ رش تھا اور سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ ڈاکٹر شاہان کیس کر رہی تھیں۔ پلوٹے ان کی مدد گاہ۔

”اٹھو بیٹا! آنکھیں کھولو بمسرت چھوڑو اور منہ دھو لو۔۔۔

”اتنا روٹا ٹھیک نہیں ہے۔“ ڈاکٹر شاہان نے اسے صبح اس طرح چگایا تھا۔ ”آپ کے روٹے نے ہم سب کو بہت حیران کیا۔“ ”ٹوپی تو سر کی عزت ہوتی ہے ناں۔۔۔ اس نے جواب دیا تھا۔

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی شرمندگی ہے۔“ وہ بہت افسردہ تھی۔

”اٹس اوکے۔“ شاہان نے کچھ اور پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا (ٹپا چوم کر کون سی شرمندگی مٹانے کی خواہش یا کوشش تھی؟)

”آپ بہت قریب ہو گئی ہیں ڈاکٹر غنی سے۔“

پلوٹے نے رائے دی یا سوال کیا۔ ”وہ ہیں ہی اتنے اچھے۔ اپنے اپنے سے۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”یہاں موجود ہر شخص نے میری زندگی بدل دی ہے پلوٹے۔ ڈاکٹر شاہان جیسی ہمدرد پر خلوص دوست۔۔۔ تمہاری ہم راہی۔۔۔ تمہاری باتیں۔ میں نے تم سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے کہ کیسے اپنے علاقے کے لوگوں کی مدد کے لیے تم نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود کرتے رہتے اپنی نرسنگ مکمل کی۔ اور ڈاکٹر غازی۔۔۔ ان کی عمر کے نوجوان شہوں میں پارٹنر گید رنگ میں زندگی کے ہر پہلو سے اپنا حصہ کشید کرنے کے لیے ہر صحیح غلط راستہ اپنانے کو تیار رہتے ہیں جبکہ وہ خود تو آئے ہی اپنے والد کو بھی لے آئے اور۔۔۔“

”اور ڈاکٹر غنی؟؟؟“ شاہان نے کی قدر غفلت سے رائے جانی چاہی تھی۔

”وہ۔۔۔ اس نے لمبا کھینچا ”وہ تو۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ”میرا ذخیرہ الفاظ ان کے بارے میں۔۔۔ وہ میرے۔۔۔“

”ہیلو ڈاکٹر what's up (کیا ہو رہا ہے)“ ڈاکٹر عثمان غنی کی آمد نے تینوں کو چونکا دیا۔ وہ گلے میں مفلر لٹکائے فل فارم میں تھے البتہ سرخ ناک سردی کا اثر دکھا رہی تھی۔

”اور دھورارہ جانے والا جلد۔۔۔؟“

ابتلاع کی چپکنی آنکھوں میں شرمندگی اگر راجا بن ہو گئی۔ اس کی نظریں زمین پر جم گئیں۔ ڈاکٹر عثمان غنی ڈاکٹر شاہان سے مریض کا حال پوچھنے لگے جو تین روز پہلے برف سے لڑھکتا کھائی میں گر کے شدید زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔

دونوں ڈاکٹر زبے حد پروفیشنل انداز میں محو گفتگو تھے۔ پلوٹے ہدایات سننے کے لیے سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

”موسم ٹھیک ہوتے ہی میں آپ کو ناپا لاکر دوں گی سر! اس نے اپنے خیالات سے سراٹھا کر اچانک کہا۔

”ہائیں۔۔۔ ناپا لیا۔۔۔ ڈاکٹر ابتلاع کی رائی اہمی تک ہوئیں تھی۔ ڈاکٹر عثمان غنی مڑے اور اس کی ٹیبل کے پاس آ رکے جو سر جھکائے نظریں جوتوں پر ٹکائے میز کی سطح ناخن سے کھرتی کھڑی تھی۔

”لیکن مجھے تو وہی ناپا چاہیے۔“ ڈاکٹر غنی کا لہجہ شریر اور دونوں حاضرین کے لیے حیران کن تھا۔

ابتلاع کا مودل غموم گیا۔ ”جب میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتا۔ تو آپ ضد کیوں کرتے ہیں؟“ اس کا چہرہ نار چڑھا انداز۔ ڈاکٹر غنی کا قہقہہ درود پوار کے لیے بھی حیران کن تھا۔

”صرف تمہاری شکل بھڑ چھٹی ہے۔ بچہ تم ملیوں والا مارتی ہو۔۔۔ سمجھیں۔“

وہ اپنی دی مثال پر دوبارہ ہنس دیے۔ سنجیدہ خاموش طبع فانی کتابوں میں گم رہنے والے ڈاکٹر کا یہ روپ پلوٹے کے لیے از حد حیرانگی کا باعث تھا مگر اپنی بے ساختہ نہی کو روک نہ پائی۔

ابتلاع کی شکوہ کنال نگاہیں ڈاکٹر عثمان غنی کے چہرے پر اٹھیں۔ پھر اس نے ناراضی کا تاثر دینے کے لیے بی بی ایش کا ذکر حکم بند کیا اور گویا رخصت کو تیار۔۔۔

”اب پھر کسی کو نہ کھدے میں بیٹھ کر رونا ہو گا۔ ہے ناں۔“ وہ جیسے اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔

ابتلاع نے برا سامنہ بنایا۔ ”جی نہیں! میں لائبریری جاؤں گی۔“

”یعنی کافی امپروو منٹ ہو گئی ہے۔ اب بی بی غم کو بھلانے کے دوسرے راستوں کو پچھاننے لگی ہیں۔“ ان کا شریر لہجہ ”تم چلو۔۔۔ میں نے کچھ کتابیں نکال رکھی ہیں۔ پھر مل کر پڑھیں گے۔“

”میں اولیٰ میں ہوں۔ آپ فارغ ہو کر آئیے ڈاکٹر شاہان!“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر ہنسنے لگی۔

داخلی دروازے سے دو عورتیں ایک روتے چلاتے بچے کو لیے اندر داخل ہو رہی تھیں یعنی ڈاکٹر

اتباع کے مریض۔ وہ دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔
ڈاکٹر شاہان اور پلوٹے کے لیے ساری گفتگو اچھبے کا
باعث تھی۔ اتنی بے تکلفی، اپنائیت، احساس اور
جذب سے گندھی گفتگو۔

یہ رشتہ کب بنا؟

کب پروان چڑھا؟

کہ سارے دار و تحریکی طرح گھنیرا ہو گیا؟؟؟

ڈاکٹر عثمان غنی جیسے شخص کا۔ اتباع جیسی۔
انہوں۔

ایک مضبوط تعلق۔ ساحاس۔

تعلق۔؟؟؟ جائز۔ یا۔

☆☆☆

بہار تیلی کے پر جیسی تھی۔ ہلکی پھلکی بے وزن اور
رنگ دار۔

سورج کا پچھلا سونا ہریالی کے اندر گویا اپنی چمک
پھونک رہا تھا۔

سردی اور برف سے ٹھھری ہوئی دھرتی انگڑائی
لے کر بیدار ہو گئی تھی۔

اس کی شوخیوں کے کیا کئے۔ جنگلی پھول پتوں کی
مہک قوت شامہ کے لیے امتحان تھی۔ کہاں سے آئی
اور کس کی ہے۔

اعصاب پر طاری یہ پا کاپن بے حد خوشگوار تھا۔
ڈاکٹر عثمان غنی اور وہ لکڑی کی بیرونی سیڑھیوں پر بے

فکری سے بیٹھے تھے دونوں کی گود میں کتابیں تھیں۔
”ہمارے جیسے ہر شے درست کر دی ہے مجھے لگتا

ہے سارے دلدار سردی کے تھے اب تو مریض بھی
نہیں آتے۔“ اس نے سہمہ کیا۔

”یہ فرصت شاید ہمارے لیے ہے ڈاکٹر شاہان
فارغ ہوں تو فارغ ورنہ تین تین دن تک پلک

چھپکانے کا وقت بھی نہیں ملتا۔“ ڈاکٹر غنی نے یاد
کروایا۔ ڈاکٹر شاہان ایک ایمر جنسی ڈیووری کیس

پینڈل کرنے بھاگی تھی۔
”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے تائیداً سر ہلایا۔ ”آپ

بتائیے کون سی بکس ہیں۔“

”آواز دوست ہے۔ مختار معبود نے 47 کے
واقعات سے متاثر ہو کر لکھا ادبی سطح پر اس کا بڑا چرچا

رہا۔

”میں پڑھ چکی ہوں سراسر۔ اور یہ شہاب نامہ
تو شاید کئی بار۔“

”شہاب نامہ دراصل ہماری ادبی و سیاسی تاریخ کی
طرح ہے ناں۔ بلکہ مجھے لگتا ہے ایوب خان دور میں

ادب کی جو سرپرستی کی گئی۔ وہ پھر دوبارہ نہیں ملی۔ اسی
دور میں شاید سب سے اچھا ادب لکھا گیا ہے۔“

”بالکل درست۔“ ملائی لڑکی ہو۔
”نا صرف بلکہ اشفاق و بانو انقار حسین اور ممتاز

مفتی کا علی پور کا امیلی، بھی اسی دور کا شاہکار ہیں۔ سر
اب شاید ایسا ادبی کام نہیں ہوتا۔ پروفیشنل ازم ہر شے

پر چھا گیا ہے۔“ اس کے انداز میں ہلکی سی آگئی۔
”اس موضوع کو نہ چھیڑو بی بی! اس پر تو ہم چھ ماہ

بحث کر سکتے ہیں۔ پھر بھی نتیجہ جیڑی سے دور۔ تم یہ
کتاب لو۔۔۔ سچ ابلاغہ حضرت علی کے خطبات و

اقوال ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر سمجھ میں آجاتا ہے کہ
یہ کیوں لکھا گیا کہ میں (نبی) علم کا شہر ہوں اور علی اس

کا دروازہ۔ پہلے پڑھی ہے؟“
”نہیں سر۔“ اس نے اشتیاق سے کتاب پکڑ لی

”میں ضرور پڑھوں گی۔“
”اے پڑھو۔ زندگی گزارنے کا ڈھنگ۔۔۔ سیکھ

لو گی۔“ وہ ایک ایک جملے پر زور دے کر بولے۔
”آپ خوش نصیب ہیں ڈاکٹر اتباع۔۔۔ بابائے اپنی

سب سے قیمتی کتابیں آپ کے حوالے کر رہی ہیں۔“
ڈاکٹر غازی کہیں باہر سے لوٹے تھے اتباع جھینپ

کرورق پلٹنے لگی۔
”کہہ رہے تھے، مرتے وقت تم پر چھوڑ کر جاتا تو

دیکھ چاٹ جاتی۔ اب اتباع کو دے کر جاؤں گا وہی
اس کی اصل حقدار ہے۔“

اتباع کی ٹھوڑی گردن سے چپک گئی۔
”تمہاری غلط فہمی ہے جان پد۔۔۔ میں اپنی زندگی

کی سب سے اہم ترین متاع بھی اسی کو دینا چاہتا
ہوں۔“

ڈاکٹر غازی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ”یہ لے لیں
گی؟ کتابوں کو تو سینے سے لگائے بیٹھی ہیں۔“ اب کی

بار ڈاکٹر عثمان غنی کے قہقہے سے لکڑی کی بیڑھیاں
تک تھرا اٹھیں۔ اتباع اس معنی خیز جملے کو خاک نہ

سمجھی۔

”ہونہ۔!“ وہ بھٹا کر کھڑی ہو گئی۔ ”مجلس میں دو
افراد کو اشاروں میں بات نہیں کرنی چاہیے آداب کے

خلاف ہے۔ ہونہ۔“
”تو مصوفہ جا کہاں رہی ہیں۔ سن سکتی ہیں تو سن کر

جائیے۔“ ڈاکٹر عثمان غنی کالجہ خوش دلی اور شوخی سے
معذور تھا۔

”ناراض تو ہو کر جا رہی ہو مگر تم ہوا اچھی لڑکی۔“
اتباع کے بڑھتے قدم رکے۔ اس نے ہونٹ کا کونہ

دانت میں بچھ کر مسکراہٹ دی۔
”ناراض تو کر دیا ہے۔ مگر یہیں آپ بڑے اچھے

۔۔۔ وہ مڑکے کتے رکی۔
”ہااا۔۔۔ کوئیاں لڑکے۔۔۔!“ ڈاکٹر عثمان غنی

کے لطف کی حد نہ تھی۔
غازی نے بہت دلچسپی سے اس نوک جھونک کو

دیکھا۔ وہ مصنوعی خفگی دکھائی اندر جلی گئی۔
میروں پھولوں والے زرد سوٹ میں کالی گھٹی پلکوں

والی لڑکی۔۔۔ باغ میں کھلے سارے پھولوں سے زیادہ
ٹھگفتہ لگ رہی تھی۔ موسم کا جوین اس پر بھی ٹوٹ کر

برساتھا۔

برف اور سردی نے ہر شے کی خوب صورتی
ڈھانپ دیا تھا۔ اب بہار میں گرم موٹے کپڑوں سے

آزاد اس کا نازک سر لپٹا شگل کی طرح چمکتا تھا۔
ڈاکٹر غنی نے بیٹے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے کچھ کہا

تھا۔ دونوں ہنس پڑے۔
اس ساری گفتگو کے کچھ حصے کچھ آوے گا نے

جملے کسی اور کے کانوں میں بھی پڑے تھے۔ ڈاکٹر
شاہان حق دق رہ گئیں۔ وہ سنی مجھنے کی طرح جوں کی

توں کھڑی تھیں۔ صرف کپکپاتے ہونٹ۔۔۔ اور پھر
ٹپ ٹپ گال پر پھسلے آنسو۔ بتاتے تھے یہ مجسمہ

نہیں انسان ہے زندہ انسان۔
”کیا ہوا ڈاکٹر شاہان! کیا ہوا؟“ پلوٹے کی نگاہ بڑی۔

”آں۔۔۔ مجھے لے چلو۔ پلوٹے! مجھے کہیں لے
چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

☆☆☆

وہ اپنے ذاتی لیب ٹاپ پر رجا سے ہکلام تھی۔ یہ
ڈاکٹر غازی نے اسے منگو کر لیا تھا۔ پیسے اسی کے تھے۔

مگر خصوصی دلچسپی غازی ہی کی تھی۔ ڈاکٹر شاہان سر
تک چادر نائے سو رہی تھیں۔ دو تین روز سے ان کی

طبیعت خراب تھی وہ رات کے آخری پھر رجا سے محو
گفتگو تھی۔ بد بھدہ۔

”تم مجھے فون نہیں کرتیں لیکن مجھے برا نہیں لگتا
اور سچ کہوں میں نے انتظار کرنا بھی چھوڑ رکھا ہے۔

ایک طمانیت ہے کہ تم کہیں نہ کہیں مصروف ہو گئیں
تب ہی تو۔۔۔ میں اپنے قصورات میں تمہیں دیکھ کر

بہت خوش ہوں اتباع! مجھے خوشی ہے تمہیں دوست
مل گئے ہیں۔“

”مجھے محبت بھی مل گئی رجا!“ اس کالجہ خوشی سے
معذور تھا۔

”تو تسلیم ہی کر لیا۔ کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ کبھی
دکھا بھی دو۔“ رجا کی آواز میں شوخی تھی۔

”دکھا دوں گی کبھی۔ کیا کہوں کہ جی ذرا سکرین
کے سامنے آئے آپ۔“

”آپ کا برد دکھوا ہوتا ہے۔“ رجا نے اس کی بات
کاٹ کر کہا۔

اتباع نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔
”میں نے تم سے کہا تھا ناں! مپاڑا دنیاں و دنیاں

مجھے بلاتی تھیں۔“
”ڈاکٹر صاحب کا نام بھی شامل کر لو ان ناموں میں۔

وہ بھی حد امیں لگاتے ہوں گے۔“ رجا پھر چپکی۔
”تم بہت بد تمیز ہو۔“

”اور تم بہت کھٹی مہسنی۔“

”لو میں نے کیا کیا ہے؟“

”وہ پھول دینے والا قصہ پورا نہیں سنایا تھا۔ میں خود ہی قیام لگا کر رہی۔“

”اچھا وہ۔“ اتباع نے لمبا کھینچا۔ ”ہماری سسٹر ہے پلوٹھے۔ میں نے یونی اس سے کہا کہ یہاں کے لڑکوں کو لڑکی منانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہوگی۔ اتنے پھول ہیں۔ سارے رنگوں کا گلہ دست دو اور لڑکی راضی۔ پلوٹھے نے انکار کیا کہ آپ کے لیے پھول اہم ہوں گے۔ نہ لڑکے دینا پسند کرتے ہیں نہ لڑکیاں لیتا۔ سب سے اہم معاشی طور پر مضبوطی ہے۔ پھول و دل سب کتابتیں۔“

”معاش ضرور اہم ہے مگر محبت سے بڑھ کر نہیں۔ میں تو تار ہو جاؤں اگر کوئی مجھے اس طرح پھول دے۔ میں نے کہا۔

اب اس نے یہ قصہ مزے لے لے کر سب کو سنایا۔ اگلے روز سے پھول دینا شروع۔ اتنے دن ہو گئے ہیں کتنی یاد نہیں۔ مگر وہ روز میرے لیے ایک پھول لاتے ہیں۔ اور تم حیران ہوگی ہر دن نیا پھول۔ کبھی بڑا کبھی چھوٹا۔ کل میں سر جھکائے ایک کیس کے سلسلے میں میڈیکل بک پڑھ رہی تھی بے حد تنہائی سے کچھ لینے کے لیے اندر آ گئے۔ قسم سے میرا پورا دھیان کتاب پر تھا۔ یکدم آواز آئی۔

”چائیں آپ کب بخار ہوں گی۔ میں گروڈ فوآج کے چپے چپے سے پھول دھونڈ کر روزوار رہا ہوں۔ فکر صرف یہ ہے کہ اشاک ختم ہو گیا تو کیا پھر پوسانی کے میدانوں میں جاؤں گا۔ وہاں سے اب ہر روز صبح تو آ نہ سکوں گا پھر آپ کی محبت میں اتنا بھی نہ کر سکا۔ لوگ چاند تارے تو ڈالنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ میں نے وعدہ کو کوئی نہیں کیا مگر پھولوں کی اقسام اب ختم ہونے کو ہیں۔ پھر اس کے بعد کیا کروں۔“

اتنی مصعومیت سے سوال کیا کہ میں سب پھول بھال مند دیکھتی رہی۔

”تو آپ کو کہا کس نے ہے پھول لانے کے لیے؟“

”اسی لیے۔۔۔“ فوراً افسردہ ہو گئے۔ ”میں بغیر کے لا رہا ہوں جب ہی آپ ناقدری کر رہی ہیں۔ جواب ہی نہیں دیتی ہیں۔“

”اری احسن! فوراً“ آئی لو یو یول دیتی۔“ رجا نے سر پٹا۔

”یہ آسٹریلیا نہیں ہے۔“ اتباع کی جان جل گئی۔ ”تو پھر آئی ہیٹ بوکس دینا تھا۔“ رجا کو تپ چڑھی۔ ”ارے واہ خوا خواہ۔۔۔ کیوں؟“ اس نے تیزی دکھائی اور دونوں ایک ساتھ ہنس دیں۔ ”لیکن کوئی جواب تو دیا ہو گا ناں۔“ رجا کی تشفی نہ ہوئی تھی۔

”کسی لڑکی کا پھول قبول کر لیتا تمام سوالوں کا جواب ہوتا ہے۔“

میں استانی بن گئی فوراً ”اور ان کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ایک رنگ آئے ایک جائے۔ پھر فوراً“ سر پر ہر رکھ کے بھاگے شاید کچھ دیر اور رکھتے تو بھنگا ڈالتے۔ اپنی عمروں سے کاٹا ڈالیا ہو گا۔ اس کی آواز خوشی سے چلی پڑ رہی تھی۔ رجا دل کھول کر ہنسی۔

”اور۔۔۔ بتاؤ ناں؟“ وہ نچالے کیا انگوٹا چاہتی تھی۔

دونوں اپنی خوشی میں مست تھیں۔ کھٹی کھٹی سسکیوں کی جانب دھیان ہی نہ گیا۔

”میرے اندازے غلط ہی نکلتے ہیں مگر آج مجھے اندازے کی غلطی پر رنجیدگی نہیں ہے۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

”کون سا اندازہ۔“ پلوٹھے کی آواز بھی بلند تھی۔ وہ سب پر آدے میں کھڑے تھے۔ بارش کی بوندیں منہ زور تھیں۔ آدھا ہر آدہ لگتا ہو چکا تھا۔

”میری اندازہ کہ بارش کا اصل لطف ساحل سمندر پر ہے۔ نہیں بارش کی اصل خوب صورتی تو یہاں ہے۔ تیز دھار نے نظروں کے آگے سر مٹی جالی دار پردہ حائل کر دیا تھا۔ ہر منظر دھند میں چھپ گیا تھا۔ حد نگاہ

نور ہو رہی تھی۔ پہاڑ شاہہ رکے تھے۔ شاید نہیں سمجھتے، نظروں میں نہیں رہے۔“

”میں جی۔ یہ سمندر رولی بارش نہیں۔ آپ بھی اپنا تھپ تھپ کریں۔ پیار رجا میں گی۔“

”اور آپ کو کہہ نہیں سکتی ڈاکٹر شاہان! آپ بہت کمزور اور دل کی دھماکی دے رہی ہیں۔ نیلے میوے بہت میں وہ بہت پر مشورہ دکھائی پڑتی تھیں۔“ اور پلینز لڑکی اور رنگ پن لیا کر سن۔ یہ بہت جتنا ہے آپ پر مگر عین کریں دوسرے رنگ بھی بہت پیارے لگیں گے۔“

”کس کس۔ کس کو پیارے لگیں گے؟“ آنکھوں میں تہی تہی اداسی سے زیادہ ناامید جملہ۔

اتباع انک گئی۔ ”کسی کو پیارے نہیں۔ آپ بہت اچھی لگیں گی۔ رنگ زندگی کے احساس کا نام لیں۔“

”میں کسی کو اچھی نہیں لگ سکتی۔“ وہ قطعیت سے بولیں۔

”ہائیں۔۔۔“

”چائے لیں پانزوالی بی! بعد ارا پکوٹے مزے کے بنے ہوں۔“ ڈاکٹر عثمان غنی نے آواز لگائی۔

وہ برآمدے کے دوسرے سرے پر کرسی سنبھال چکے تھے گرم چائے اور پکوٹوں کی مہک۔

”ام ام! یہ مزے دار کانا بناتی اے۔“ پانزوالی بی اولے بے نیازی سے اندر غائب ہو گئی سب حق دہ۔ اور پھر زور و شور سے ہنس دیے۔ پکوٹے واقعی مزے دار تھے۔

ڈاکٹر شاہان کے چہرے سے ٹپکتی نقابت اور آنکھوں کی اداسی ماحول پر غالب آ گئی۔ پانچ افراد کی موجودگی کے باوجود بارش کا شور حاوی تھا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ ڈاکٹر شاہان یکدم ادھوری چائے چھوڑ کھڑی ہو گئیں۔ پلوٹھے بھی اٹھ گئی۔ اتباع نے نا سنجی سے دیکھا۔ اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا پلوٹھے کے انداز میں

ہمدردی کی۔ ڈاکٹر عثمان غنی کی آنکھوں میں جھیلن اور قطعی پن۔

انہوں نے بس اک نظر کھڑے ہوئے لوگ دیکھے اور ذرا سا پہلو بدل جائے کے کھوٹ لینے لگے۔ اتباع کو گمان گزرا غازی کے چہرے پر ناگواری و ناراضی سی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ ڈاکٹر شاہان کے پیچھے گیا تھا۔

اتباع کو عجیب سا لگا۔ کچھ تھا جس کی سب کو خبر تھی۔ اس کی ٹوہ والی فطرت نہیں تھی اور کچھ شاہان کی پہلی تائب۔ ہاں ہر شخص کے پاس اپنی کہانی اپنی وجوہات اپنے دکھ سکھ ہوتے ہیں اور کچھ دل اتنے سخت بھی ہوتے ہیں کہ سب سستے ہیں اور عیاں نہیں ہوتے۔

اس کے ذہن میں مختلف واقعات فلم کی طرح چلنے لگے۔ شاہان فطری طور زندہ دل تھیں مگر جب اپنے خول میں گھسٹیں تو ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی اجنبی بن جاتیں۔

”اتباع! ڈاکٹر غنی کی پُرسوج آواز ابھری وہ اپنے خیالات سے ابھری۔

”تم سے کچھ مانوں۔۔۔ تو۔۔۔ دو گی؟“

”مجھ سے؟“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھی۔ ”میں کیا دے سکتی ہوں سر۔! میرے پاس کچھ نہیں ایسا جو۔“

”تمہارے پاس ہے ایک۔ ہاں۔۔۔ مجھے اسی کی ضرورت ہے۔“

کس چیز کی ہاں؟ وہ نا سنجی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس پر کبھی راکر تین بھی تھا۔ طمانیت کی کیفیت۔

”کیا ہوا پلوٹھے۔۔۔؟“ اس کی نگاہ یکدم ٹھہری۔ ڈاکٹر غنی بھی چونکے۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا فون لینے آئی تھی۔ اوھر رہ گیا تھا۔“ وہ کچھ گھبرا کے صفائی دے رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔ رہا۔“ اس نے موبائل اٹھا کر دونوں کو دکھایا اور ان کے قدموں پلٹ گئی۔ اتباع نے اچھے سے ڈاکٹر عثمان غنی کا چہرہ دکھا اپنی بات کا سلسل ٹوٹنے پر

ان کے چہرے پر ناگوار بھی اور وہ کیا کہہ رہے تھے۔
اسے گھبراہٹ سی ہوئی۔ کوئی پراسراریت۔۔۔؟؟؟
کوئی رانس۔ کیا تھا۔
”آ۔۔۔ آپ کچھ کہہ رہے تھے سر!“
”آل ہال۔۔۔“ وہ سچوں سے ابھرے۔
اتباع! الجھی۔۔۔ یہ کون سی بات ہوئی۔

اور ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ کھو گئے۔ شاید الفاظ مجمع کر رہے تھے۔ اتباع منتظر تھی۔ ڈاکٹر غازی واپس آگئے تھے۔ ڈاکٹر شلمان نے آرام کرنے کا کہہ کر انہیں بھیج دیا تھا۔ غازی کے چہرے پر سنجیدگی اور کچھ غصہ سا تھا۔ اتباع کو صورت حال بہت عجیب ناقابل فہم لگ رہی تھی۔ اتباع کے چہرے پر ہمارا نگاہ پڑتے ہی غازی دل سے مسکرایا کرتا تھا۔ مگر اس بار بس اس کے چہرے پر ایک نرم تاثر پل بھر کو ٹہرا تھا۔
”میں تمہیں ایک ہی نام سے پکارنا چاہتا ہوں اتباع! مگر تمہیں وہ پسند نہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے تم سے بہت انسیت لگاؤ اور محبت ہو گئی ہے۔ بہت زیادہ۔“
اتباع کے سر پر دھماکہ ہوا۔ اس کی آنکھیں اٹل پڑیں۔ پیروں سے مانو زمین کھسک گئی۔
جملے کا پہلا حصہ۔ جملے کا دوسرا حصہ۔۔۔

”اور اس غازی کو بھی۔۔۔ مگر اس نے کہا نہیں ہوگا۔ میں نے پہلے کہہ دیا ہے۔ سو میری بات مان لو۔ ہمارے گھر آ جاؤ ہمیشہ کے لیے۔“
”ہا۔۔۔ اس کی انگلیاں ہونٹوں سے چپک گئیں۔

”غازی! کاتھ پکڑ کے۔۔۔“ ان کے جملے میں اداسی، فکر مند، شرارت اور محبت بھری ہوئی تھی۔
ایک بے حد عجیب طرح کے بے حد قاتل اعتراض دکھائی دیتے جملے کا انت۔۔۔ اتنا خوب صورت چونکا دینے والا۔

لڑکیاں ہمیشہ اظہار کے خوب صورت جملوں، رویوں کی منتظر رہتی ہیں۔ اسے کس طرح کا ری ایکشن دینا چاہیے۔
اس کے چہرے کے حق بن لکھے تاثرات پہ ڈاکٹر

عثمان غنی زور سے ہنس دیے۔ غازی کا چہرہ بھی کھلا کھلا تھا۔
”مجھے یقین ہے اس نے تمہیں کچھ نہ کہا ہوگا سوائے پھول دینے کے۔“ اتباع اچھل (ڈاکٹر غازی بھی) میں اظہار محبت کر چکا ہوں احقر! اگر تمہیں ہنسنے کہنا ہے تو تم بھی کہہ سکتے ہو۔“
غازی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر ہنسنے لگے۔
”نہیں! باقی بھی آپ ہی کہیے۔“ اس نے جل کر کہا تھا۔
ڈاکٹر عثمان غنی دل کھول کر ہنسنے لگا۔ اتباع کا سر جھکا ہوا تھا۔
”تم نے جواب نہیں دیا پیاری لڑکی۔۔۔ تم کو کیا واقعی ہم سے محبت نہیں ہوئی۔۔۔ کمال ہے۔“ وہ حیرت سے بولے۔

اتباع نے سر اٹھایا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لالباں تھیں۔
”بنت ت۔۔۔“ ڈاکٹر عثمان غنی کی تاسف سے پُر آواز گونجی وہ غازی کو لٹا ڈر رہے تھے۔ ”مجھے یقین تھا۔ تمہارا پرنسول کسی بھی لڑکی کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو بھر دے گا۔ اتنا کہ۔۔۔ جی جی۔۔۔“
”نہیں نہیں۔۔۔“ اس نے بے ساختگی سے سر اٹھا کر نفی میں گردن ہلائی۔
اس کا تجلٹ بھرا انکار ڈاکٹر عثمان غنی کے چہرے پر طمانیت آمیز شرارت لے آیا اور غازی نے بہت دیر سے کچھ ہونق دکھائی دیتی اتباع کو نہ کھا۔ یہ اتنی اچانک صورت حال۔۔۔

”تو پھر تمہارا جواب۔۔۔ کیا ہو گا؟“ اتباع کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ وہ کیا جواب دے۔
”رشتے ایسے طے ہوتے ہیں۔ ماں باپ رشتے دار دوست۔۔۔ سب کہاں تھے؟“ اور ڈاکٹر عثمان غنی کو چہرہ بڑھنے میں کمال حاصل تھا گویا۔
”تم یہاں کر دو۔۔۔ پھر باقی جس جس سے کوئی میں اس کے پاس چلا جاؤں گا وامن پھیلانے۔“ وہ پدارنہ

اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔
اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو پٹ پٹ رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹا کی نگاہیں اپنے چہرے پر ناف محسوس ہو رہی تھیں۔ دھڑاڑیں مار مار کر رونے کی خواہش پر کیسے کنٹرول کیا تھا۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا اس کا سر نفی میں ہلا۔
”کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی نہیں رہا۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

”ارے بے وقوف!“ ڈاکٹر عثمان غنی نے یکدم اس کے شانے پر بازو پھیلا دیے۔ ”یہ کیسی بات کر دی۔ کیا کرتے ہیں ختم میری بیٹی بن جاؤ۔ یہ غازی بھی تو کچھ کلمہ کرنے آئے میرے پاس تمہارا ہاتھ مانگنے۔۔۔ لہو زنی منت ترے کرے۔۔۔ جو تیاں چٹائے۔ ایسے نہیں اپنی بیو کا ہاتھ دوں گا نہیں۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟“

ڈاکٹر غازی نے شانے اچکا کر کوئی اعتراض نہ ہونے کا اشارہ دیا تھا۔
وہ آنسو پونچھے لگی۔ دل بھر بھر آ رہا تھا۔

بیاری بیو اسد! خوش و خرم و کامران رہو
جب تک یہ سطور تم پر بھنا شروع کر دو گی۔ میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔ تم بقیہ تیاں حیران ہو رہی ہو گی کہ میں نے تمہیں کیسے مخاطب کیا۔ پہلے بھی آئے تھے سامنے ایسے پکارا نہیں ناں۔ ہماری کبھی گفتگو بھی تو نہ ہوئی ناں۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ ہم نے بھی باہم کوئی نہ کلمہ کیا ہو۔

لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہیں جانتا نہیں تھا۔ تمہارے وجود سے انجان تھا۔ بے خبریا۔۔۔ انخواہتہ تنفر۔۔۔ توبہ استغفار۔۔۔ بھلا بیٹوں کے ساتھ ایسے جملے سچے ہیں وہ تو بس پیار کیے جانے کے لیے ناں میں بھیجی جاتی ہیں۔

کل رات میری طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔
لوٹ و بے ہوشی کے وقفے۔۔۔ دل میں درد تھا۔ رگوں

میں خون کی جگہ مرچیں دوڑنے لگی تھیں جیسے حلق خشک۔ سب سمجھے جانتی کابل بس یہی ہے مگر میں تو کہوں گا فرشتہ اجل بس پیر کا انگوٹھا ہلا گیا۔ کہ بس آ رہا ہوں۔۔۔ فرشتے ایسی مہلت کب دیتے ہیں اس تشنجی کیفیت سے نکلا تو لب کی سفید روشنی میں ہر شے بہت ٹھہری تھی۔ ہر منظرو واضح۔۔۔

ارو گرد کھڑے میدان دھیرے دھیرے پلٹ گئے کہ ابھی بڑھے میں دم ہے اور ابھی کچھ نہیں ہوا۔ سفید چادر میں جپٹ لیٹا میں بظاہر ہر سکون دکھائی دے رہا ہوں گا مگر تم سوچو جس نے چند لمحے پہلے آخری کلمہ پڑھ لیا ہو۔ وہ ہر سکون ہو سکتا ہے۔ جب ہم موت کو قریب دیکھتے ہیں تو کتنے ہیں ساری زندگی کا ہر پل فلم کی طرح نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ اور میری فلم کامیاب تھی۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج سب تو کر لیا۔ حقوق و فرائض۔۔۔ مگر دیکھو تم وہاں نہیں تھیں مگر اچانک اس کمرے میں آؤ ہمیں۔ تم منہ سے کچھ نہ بولیں۔ مگر مجھے دفعہ تہا خیال آیا اگر اللہ نے مجھ سے نماز سے پہلے تمہارے بارے میں سوال کر لیا تو۔۔۔؟

مجھے گلے یاد تھے اور ماتھے پر سجدوں کا کالان نشان۔۔۔ بتا دیتا۔ میں نے کبھی فرض کی آوازیں میں کو تائی نہیں کی۔

مگر بیو! یہ میرا پل سیانی کی جانب مائل چہرہ جو انت میں اتنا سیاہ ہو گیا کہ سجدے کے نشان پر بھی چڑھ گیا۔ اب کیا دکھا کر عذاب سے جان چھڑاؤں اور رحمت کا مطالبہ کروں۔

میرے بہترین اعمالوں کی گٹھری میرے منہ پر مار دی گئی۔ جاؤ چلے جاؤ۔

تمہارے گھر میں ایک یتیم مٹی میں رتا رہا۔ ٹھوکروں میں پلتا رہا اور تم نے ایک بار بھی اس کے سر پر دست شفقت نہ رکھا۔

میرا قلم لکھ رہا ہے بیو۔۔۔ میں رو رہا ہوں ناں۔

اور یتیم کون ہوتا ہے یتیم وہ ہوتا ہے جس کے

حقوق کی پاس داری کے لیے آجوں پر آئیں اتاری جاتی رہیں۔ اچھا ہے تم میرے سامنے نہیں ہو ورنہ پتا نہیں۔

مجھے یاد ہے بیڑا! سارے گھر کو تم ہی سے شکایتیں ہوتی تھیں۔ نقصان، شور، بد تمیزی، غلطیاں سب تم سے منسوب کر دی جاتی تھیں۔ مگر تم جواباً ”کچھ کتنی بھی تو نہیں تھیں۔ بدھلپامیری یادداشت کھا گیا ہے مگر مجھے کچھ یاد ہونہ ہو، یہ ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ تمہاری مائی اور چچی تمہاری شکایت لگانے میرے پاس کھڑی تھیں۔ تم متوقع سزا کے ڈر سے سہمی کھڑی ہو اور تب ہی ایک عجیب حرکت کرتیں کہ میرے نزدیک آکر میری ہی پشت پر کھڑے ہو کر میری آستین جکڑ لیتیں۔ اب منصف کیا سزا سنائے۔ مجرم اسی کی تو پناہ میں ہے۔

تم ایسا کیوں کرتی تھیں مجھے جواب کی شدید طلب ہے۔ اس گھر جائیداد میں تم برابر کی حق دار تھیں۔ تین بھائیوں کی مشترکہ ملکیت یہ گھر تمہارا بھی تھا مگر پتا نہیں کب تمہارے ابو کے انتقال کے بعد وہ ہم دونوں بھائیوں کی ملکیت رہ گیا۔ اسی طرح کاروبار میں بھی سلطان کا انتہائی حق تھا مگر وہ مر گیا تو حصہ تم ہو گیا؟ تم تھیں ناں اس کی وارث۔ مگر ایک اکیلی لڑکی کو انتہا ہوا حصہ کیسے دیا جاسکتا ہے اور اب تم کلڑوں اور گھوکروں میں بڑی تھیں۔

جج کوں مجھے کبھی احساس نہیں ہوا۔ ہاں گھر میں اچھا یک رہا ہے تو سب کھا رہے ہیں۔ ہاتھ پکڑ کر کون روکے گا۔

سب کے لیے اچھا بننے کو آتا ہے ناں۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں، ہمیں تو تفریق کیسی۔ یاد ہی نہ رہا تیسرے بھائی نے ایک بیٹی چھوڑ دی دو کے آکر ہے۔

میں نے کبھی تمہارے چہرے پر ہنسی نہیں دیکھی۔ مسکراہٹ۔ تم مسکراتی کیوں نہیں تھیں؟ دلی پتلی۔ مسلمانی خاموش ویران آنکھوں والی

خاموشی سے گھر کے کاموں میں لگی یا پھر گود میں کتاہیں رکھ کر بیٹھی تھانڈی۔

میرے۔ ہاتھ رشتہ زدہ ہو رہے ہیں۔ کاش میں سب لکھ پاتا۔ تمہاری کہا نیکی چہرے سے نکلتی ہیں تو قدرت نے دی تھی۔ اس پر طاری مسکینہت ہمارا کارنامہ ہی رہی ہوگی۔ ہے ناں۔ کیا تم ہمیں معاف کر دو گی؟ بیٹا! کر دینا۔ کیونکہ اب معافی مانگنے کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں۔ رات سے اب تک تم ہزار روپ بدل کر میرے سامنے آ رہی ہو اتنی بار تو حقیقت میں بھی نظر نہ آئی ہوگی۔

میں تم سے خالی خوبی معافی طلب نہیں کر رہا۔ میں یاد آ کر کرنے کی کوشش بھی کروں گا مگر تم جان لو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تمہاری پرواہ اور فکر۔ یاد رکھو زندگی پر غوشیوں پر تمہارا بھی پورا حق ہے اور وقت آنے پر وہ تمہیں مل جائیں گی۔ بس بہت جوان رکھنا۔ سبوس مت ہونا اور اور بھی بددعا مت دینا کی کو بھی۔

اللہ پر یقین رکھنا اس نے ہر شخص کے لیے ہر چیز طے کر رکھی ہوئی ہے۔ ہاں ایک بات اور۔ میں جو کر کے جا رہا ہوں۔ اس پر تم ڈٹی رہنا پیچھے نہ ہٹنا یہ تمہارے حق سے تو بہت کم ہے۔ مگر بے تمہارے ہی لیے۔ اپنی تعلیم جاری رکھنا۔ تم سلطان کی طرح بہت قابل لڑکی ہو اسی کی طرح ذہین۔

حیران ہو رہی ہوں ناں۔ پیاری بیڑا! ابھی تو بتایا کل رات فرشتہ پر کاٹگو تھا ہاں کیا تھا۔ تم۔

آگے بڑھ کر بی بی بے اختیار لکیر سی بکھینچی تھی۔ اس نے بچکوں سے لڑنے وجود کو بھٹک سہارا دیا تھا۔ سالوں پہلے بھی وہ اس خط کو ہر ہر نقطے کو بڑھ کر ترپ ترپ کر روٹی تھی۔ اس کی بے جلی کو آرام نہ تھا۔ اس نے اپنا نام سر پیٹ ڈالا تھا۔ اور اتنے سال بعد بھی سینہ کوئی کی خواہش کو روکنے کے لیے اس نے ہونٹ کٹ کٹ ڈالے تھے۔ جڑے اتنی سختی سے جھنجھکے کہ گردن کی رگیں پھٹنے کو ہو گئیں۔

وہ ان کے پہلو سے جا کر کیوں لگتی تھی؟ ان کی پناہ مانگنے کا مطلب۔۔۔ وہ ابو کے بھائی تھے ناں تو ابوی کے جیسے لگتے تھے۔

بھٹک! آواز۔۔۔ اس پر کوئی پہاڑ توڑ ظلم نہیں تھا۔ مگر وہ ماں کی بیٹی تھی اور اس کی ماں نہیں جانتی جو اسے روکتی کہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پیلے پس دھوئے جاسکتے۔

اس کے سر میں جو کس بھانگیں اور جسم پر میل کی بیانیٹ جا تیں۔ اس کے باپ کی لائبریری بکن و سچ کرنے کے لیے بھاری کٹی اور ”رہی“ آٹھ آنے سے بچی گئی۔ باپ مر گیا تو گھر کے بڑے ہوتے تو لڑکوں کو وہ کدوے دیا گیا۔ ”وہ لڑکی ہے تو لڑکیوں کے بچ رہے ناں۔“

ڈیل اسٹوریز بے بی بیڈ ڈالے کرے کے کونے میں اس کا گدرا۔ ”نے سی میں سوتی ہے ناں۔“ وہ بڑھنے لکھنے کی وی دیکھنے کھانے کے درمیان آرام سے اٹھالی جاتی۔ وہ چھوٹے بچوں کو کمر پر ٹکاکر بھائی ماؤ فیکہ۔ مائیں نیند سے بیدار ہوں کاموں سے فارغ۔

بہت بڑے شاپنگ مالز کے سیل اسٹینڈ سے کپڑے۔ شاز اس کا بھی مشہور برانڈ کا ہوتا۔ وہ جوتے بہت جلد توڑتی ہے۔ باقی تو چلاتے ہیں۔

اس کی زندگی قطعاً۔ فلمی یا افسانوی نہیں تھی کہ کوئی ملازم چپکے سے ہمدردیاں جتا کر چوریاں بناتا۔ بوا اس کی روٹی ڈالنا اکثر بھول جاتی۔ اسے بوٹیوں کے نام میں معلوم تھے۔ چیسٹ پیس، ٹیگ پیس یا وگنر۔ وہ بچے کچھ شور بے سے چھوچھو کر کھاتی۔ دلی پتلی مائیں اس پر آن آکھوں والی پائوس بچی۔ سال کے ۱۵۰۰ واں دن اس کا ہوتا جب وہ کلاس میں اسکول میں لول آجاتی۔ بس۔ اور اپنے بچوں کو جھاڑنی مائی چاچی اپنے کمروں میں بند ہو جاتیں۔ وہ رپورٹ کارڈ اور ڈرائیو لیے سنائے کے عالم میں اکیلی کھڑی رہ جاتی۔

”مسلمان صاحب کی وصیت کا دوسرا اہم ترین نقطہ یہ ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں داخلہ لیں گی اور ہر قیمت پر اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی مکمل کریں گی۔“ وکیل کہہ رہا تھا۔

وہ سر ہلائی۔ وصیت کے پہلے حصے نے گھر کے گیارہ افراد کو جلتے تو بے پلا کھا کیا تھا۔ بڑے تایا اپنی زندگی میں اپنی کل اولاد میں سب تقسیم کر گئے تھے۔ مسلمان بچانے بھی سب کہہ رکھا تھا، صرف اس کا کٹھا اسٹور کی نامزدگی نہ ہوئی تھی۔ اولاد کا خیال تھا بعد میں برابر بانٹ لیں گے۔

مگر اتنا بڑا اسٹور۔ اتنے اہم ترین علاقے کا سب سے چلتا مال اور سونے کی چڑیا جیسا اسٹور جہاں مروانہ بچکانہ زمانہ تمام دوائی تھی۔

کتنی خاموشی سے اس اتباع فاطمہ کے نام کر دیا گیا۔ دونوں بہنوں کا حال برا تھا۔ آپس میں رشتے طے تھے۔ مسلمان چچا کی بیٹی کو اسٹور ملتا تو عیش تایا کی بیٹی نے کرنا تھا ناں۔

ہائے۔ ہائے۔ اور تب بڑی عیار، بھری محبت سے تایا کے بے اولاد بیٹے کا رشتہ اسے دے دیا گیا۔

”تم پڑھائی جاری رکھنا۔ ہمیں تو خیر ہے، تم اتنی لائق۔ ہماری ہوؤا کر۔“

اور ماں باپ کی تری اتباع کو ان سب سے محبت اور لگاؤ تھا۔ وہاں ہی جاتی۔ مگر چرا۔

اور اگر وہ تائی کا سمجھاؤ نہیں مانتی تو گھر چھوڑ دے (اب اسے کیا کی) اور درجے بڑھ کر سالوں بعد آنے والے ماموں۔ وہ اپنی ماں کا عکس پاتے ہوئے لاہور چلی آئی۔

”اب اس گھر میں دوبارہ کبھی نہ آنا۔ ساری زندگی ہم نے کھلایا پلایا اور اب ملا دیا گیا۔“ وہ کتنا چاہتی تھی کہ وہ بس ملے۔ یونہی۔ مگر جا کی ائی کا سمجھنا۔ وہ کیوں بچے پیدا کرنے کی مشین کا روپ دھار کر مقام حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جوان ملاقات فائق ذہین اور صاحب جائیداد۔

اس نے لاہور کے پرائیوٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ زندگی کو ایک مقصد مل گیا تھا گویا دنیا بہت اچھی بن چکی ہے۔

ماہوں کا سلا۔۔۔ اس پر حق جملے لگا۔ اس نے حق کو تسلیم نہ کیا تو دست درازی تک آگیا۔ وہ بمشکل جان بچا کر ہاسٹل آگئی۔

اور یہ کہ وہ اب اس کا گھر تھا۔ اس کا کل۔۔۔ ”پانچ سال کو انجوائے کرنا ہر بل سے خوشی کشید کرنا ابتلع۔۔۔ ہاسٹل لائف کا چارم ہی الگ ہے۔“ رجا اسے لپٹائی۔

مگر وہاں اس کی روم میٹ۔۔۔ ایک خطی دولت مند لڑکی۔

”میں اس کمرے میں پہلے سے ہوں تو زیادہ حق میرا ہے۔“

میں لائٹ بند کر کے گھپ اندھیرے میں سوئی ہوں۔ مجھے کھڑکیاں کھولنا پسند نہیں۔ گہرے رنگ کے پردے باہر کی روشنی کو اندر نہیں آنے دیتے۔ چلو اتنا دیر بلکے آملی جلی کے پردے۔۔۔

”فکس صلیٹن یوز کرتی ہو انٹرنیٹ سپیشل کیوں نہیں۔ تم نے سرسوں کا تیل سر میں ڈالا ہے آؤک او او۔۔۔“ وہ الٹیاں کرتی۔

”اپنی الماری کا نیچے والا خانہ خالی کر دو عین نے سلا اپنے جوتے رکھنے ہیں اور خبردار جو وارڈن کو بتایا۔“

”یہ میرا کمرہ ہے اور تم جانتی ہو میرا باپ کون ہے۔۔۔۔۔“

ایک مسلسل اذیت کے سال۔۔۔ وہ پہلے اور آخری سال میں اس کے ہمراہ تھی۔ شاید اسی نے اس کے ساتھ رہنا پسند کیا ہو گا۔ اتنی خاموشی سے سب سنے والی اور کوئی نہیں کی ہوگی۔

اور اب اسی ڈاکٹر ابتلع فاطمہ کو سب ملنے لگا تھا۔ ہر چیز رشتے۔۔۔ محبت دوست۔۔۔ شفقت اور قدم جملنے کو ضمن۔۔۔

”آپ نے صحیح کہا تھا چاچو۔۔۔! زندگی میں میرے لیے بھی ہر چیز ہے اور چاچو! میری زندگی میں محبت، سائینس، یقین، سچائی شامل ہوگی۔ مجھے ایسے رشتے مل گئے جنہیں صرف میرے وجود سے پیار ہے۔ نہ دولت سے نہ مجرم سے۔ کوئی زور زبردستی نہیں چاچو۔۔۔“

آپ کہاں ہیں چاچو۔
ابو آکر دیکھیں تو ذرا۔
وہ ہنستی تھی اور روئی تھی۔
دھوپ چھاؤں کا منظر۔

☆☆☆

اس نے گمان کیا تھا کہ وہ بہت بدل چکی ہے۔ با اعتماد لا پرواہ، مگن، اب اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ سب کچھ قبول گیا تھا۔ وہ اب کسی سے نہیں ڈرے گی اور کسی سے نہیں گھبرائے گی اور اب وہ کیوں روئے؟ مگر یہ دل بار بار کیوں بھر آ رہا تھا۔ وہ کرسی میں دھنسی مزدوروں کی آمدورفت کو دیکھ رہی تھی۔ پلوٹے اور پانچالی بی بی اس کی الماری سیٹ کر رہی تھیں۔ نئے فیر چمچر کی پائش کی منک اس کے سر میں درد کا باعث تھی۔

اس نے کئی بار سوچا کہ وہ پلوٹے سے بوجھے مگر ایک غیر محسوس سی تبدیلی کا احساس اب سختی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نئی خوشیوں، دوستوں، رشتوں میں بڑی طرح مگن ہو چکی تھی۔ ورنہ بدلتے رویے فوراً پکڑ لیتی۔ وہ جلد اعتبار کرتی تھی۔ چہرے بڑھتی تھی۔ خوشگوار کی تحریر سے اس کا رابطہ کم تھا مگر ناگواری کو وہ پہلی نگاہ میں بھانپ لیتی تھی۔

”کیس کچھ غلط تھا؟“ اس نے اپنی پیشانی مسلی۔ مگر کیا۔۔۔ اور کیوں؟ ہاں وہ لطف اٹھا رہی تھی۔ ڈاکٹر غازی کی مسکراتی نظروں کا۔۔۔

ڈاکٹر عثمان غنی کا مشفق و ستانہ روپ اس کی زندگی کی ساری محرومیاں ہرپ کر گیا تھا۔ اس کے مریض، اس کا پیشہ عبادت اس کی کتابیں۔۔۔ وہ اتنی مگن ہو

پکی تھی کہ گزرے وقت کی کوئی تلخی اب دل کو نہیں
نچوڑتی تھی۔ مگر۔۔۔
”میں اس کمرے میں بہت خوش تھی پلوٹے! میں
نے شروع میں الگ کمرے کی فرمائش کی تھی۔ مگر
۔۔۔ اب تو ایسا کچھ نہیں تھا۔“
”تکریہ تو طے تھا ڈاکٹر صاحبہ کہ نئے کمروں کی تعمیر
مکمل ہوتی ہی آپ کو کمرہ مل جائے گا۔“
ایک بے حد اچھے اندیشے کا بہت سیدھا منطقی
جواب۔۔۔

”مجھے بہت انیت ہو گئی تھی وہاں سے۔۔۔ میرا
دل نہیں لگ رہا پلوٹے!“ اس نے اپنی ہتھیلیاں
مسکیں۔

پلوٹے نے ابرو چڑھائے۔ ”اگر آپ کہیں تو ڈاکٹر
شہان کو یہاں منتقل کر دیتے ہیں۔ آپ وہاں رہیں۔
آپ کا دل لگ جائے گا تب تو۔“ اتباع کو اس کے کچھ
سے آج کلکی محسوس ہوئی۔

”کوئی بات ہے پلوٹے۔۔۔؟ وہ چونکی۔ میں بہت
دنوں سے دیکھ رہی ہوں وہ بہت چپ چاپ رہتی ہیں۔
اور تنہا بھی۔ بس کام مکمل اور کمرے میں۔۔۔ بلکہ
کمرے میں بھی یا تو موبائل پر ہوتی ہیں یا پھر سر تک
چادر تان لیتی ہیں۔ کیا ہوا ہے؟“
پلوٹے کے چلتے ہاتھ بل بھر کر رکے اس کی
آنکھوں میں ہلکا سا غم آیا اور معدوم ہو گیا۔
”غلط فہمی ہے آپ کی۔۔۔“

پانوانے مقامی زبان میں پلوٹے سے پوچھا کہ ڈاکٹر
کیا گھر رہی ہے۔ پلوٹے نے جواب میں انتہائی
ناگوار سے تیز تیز لہجے میں کچھ کہا۔ اتباع سمجھ تو نہ
سکی مگر ایک فوری فیصلے کے تحت کمرے سے نکلی۔ وہ
خود معلوم کرے گی کہ کیا بات ہے۔

ڈاکٹر شہان کا کمرہ بکھرا ہوا تھا اتباع کا سلمان شفٹ
کیا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا ڈاکٹر شہان چائے پنانے
کے لیے سلپ کے سامنے کھڑی تھیں اور نگاہیں
اپنے قوے پر تھیں۔ مگر وہاں کہیں اور ہی تھا۔
اس نے دھیرے سے شانہ چھو کر متوجہ کیا۔ وہ

چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ نیلی آنکھیں ملتھلی
کئے کھیرے میں تھیں۔ ناامیدی، ہار، پچھتاوا، دکھ کی
خرمیر۔۔۔
”اگر کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دور کر لیتے ہیں اور اگر
غلطی تو میں معذرت طلب ہوں گی، کچھ دن دوسرے
ہم ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے
سے بہت دور ہو گئیں۔“
”ایسا کچھ نہیں ہے۔ غلط فہمی ہے تمہاری۔۔۔“
چائے کپ میں اندیلے لگیں۔

”میں نے بہت کم عمری میں لوگوں کے بدلے
روپے پچانا شروع کر دیا تھا ڈاکٹر شہان! یہاں اس بار
۔۔۔ دھیان زور ادرے آیا مگر سرحال، کوئی بات ہے اور
بہت بڑی بات۔ میں اب یادداشت پر زور دوں تو۔۔۔
آپ بہت خاموش ہو گئی ہیں۔ مگر میرے ساتھ تو
باقاعدہ خفا لگتی ہیں۔ باقی سب سے تو کم ہی سہی گمکات
کرتی ہیں بلکہ۔“ اسے یکدم کلک ہوا ”مجھے تو آپ
نے کئی دن سے مخاطب بھی نہیں کیا۔ ہاں ناں۔۔۔“
اس کو جیسے سب یاد آگئے لگتا تھا۔ ”اسی ہی ہے اس نے
زور دیا۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اس کمرے سے۔۔۔
بھلے آپ جتنا مرضی کریں۔“

اس نے منہ بسور کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے
جتائے ناں ڈاکٹر! کیا بات ہے؟“
”کوئی بات نہیں ہے۔“ شہان نے بہت آہستگی
سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ ”میں نہیں
جاؤں گی جب تک آپ مجھے بتائیں گی نہیں۔“

وہ بچکانہ لاڈ سے اچھل کر بیڑ پر بیٹھ گئی۔
”ہاں تو آپ کو اب جانے کو کہہ بھی کون سکتا ہے۔
اب تو آپ ہر شے کی بائین ہونے والی ہیں۔“
پلوٹے کچھ لینے آئی تھی۔ اتباع جو بھی رہ گئی۔ کیا
ہو گیا تھا۔

”تو کیا ڈاکٹر عثمان غنی نے۔۔۔“ لیکن وہ ٹو کہہ رہے
تھے اس کے جواب سے پہلے وہ کسی کو۔۔۔
”تو آپ کیا سمجھتی ہیں ایسی باتیں چھپ جاتی
ہیں۔“ پلوٹے کے لہجے میں آگ سی تھی۔

ایک کاسرا اور خود جھنجھٹا اٹھا۔

”میں نے تو بازی ماری ہے بھئی۔“
اس کے چہرے پر رنگ ٹھہر گئے۔ ”میں بتانے ہی
تھی مگر پھر سرنے کہا کہ وہ باضابطہ اعلان کریں
۔۔۔ خود ہی۔ تو بس اس لیے۔“ اس کے چہرے کا
رنگین جسم بدل موہ لینے والا تھا۔
”اور۔۔۔ اور غازی سرنے کیا کہا؟“ پلوٹے کو پوری
مہلکات درکار تھیں۔ ڈاکٹر شہان کا چہرہ سوالیہ تھا مگر وہ
پس ظاہر کر رہی تھیں کہ جیسے دھیان نہ ہو۔
”وہ۔۔۔ وہ بھی۔ پہلے تو۔۔۔“ اس کا جملہ اودھورا رہ
گیا۔ ”خالی بی بیاتی کا پتی آئیں۔“
”آپ آہ ٹھک گیا۔ کاٹا مانا نہیں بنا سکتا۔“ پانوا
لے گئے تھیں انہیں ڈرایا۔

”کوئی بات نہیں بی بی۔ آج میں کچھ بتاؤں۔۔۔
میرا بہت دل ہے بریالی کا۔ اب تو سب راز سن بھی آگیا
ہے۔“
اسے یاد آیا وہ یہاں آکر کراچی جیسی چٹ پٹی بریانی
کوڑی گئی تھی یہاں سب پلاؤ کے شائق تھے۔
”سر تیز مسالے نہیں کھاتے پھر ان کے لیے کیا
بنے گا؟“ شہان نے پہلا بار دلچسپی لی۔

”میں نے پوچھ لیا ہے، وہ مان گئے ہیں۔ میں بند
کو بھی کارائے بتاؤں گی پھیکا سا۔“
”ناہنی ٹولی واکور واک اختیار واغستو۔“ پانوانے
بہت برا منہ بنا کر وہابی کے قدم بڑھائے اتباع سمجھ
نہ سکی۔ پلوٹے کے انداز میں طنز اٹھ گیا تھا۔ اور ڈاکٹر
شہان کا سر جھک گیا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا اختیار؟“ وہ ایک آدھ ہی لفظ
کی پکڑ پائی۔
”کچھ نہیں۔۔۔ وہ کتنی ہی رہتی ہیں۔ تم یہ بتاؤ
بہت نہیں اب ڈاکٹر صاحب کے گھر ہی شفٹ ہو جانا
ہے تو۔۔۔ اتنا مال کس لیے۔ تب بھی تو یہ کہہ چھوٹا
ہی ناں؟“ ڈاکٹر شہان نے پہلی بار اتنا بوجملہ کہا۔
”وہ۔۔۔ تو اور بات ہوتی ناں۔۔۔“ اس کا چہرہ رنگا
گیا۔

☆☆☆

”یار! تم کہہ تو رہی تھیں پلوٹے بہت پیاری ہے۔
ہو سکتا ہے وہ سوچتی ہو۔ ڈاکٹر غازی کے ساتھ شاید
۔۔۔ رات اس کی پتا کے جواب میں رجانے فوری
قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔

”نہیں یار۔۔۔ اس کا منگیا ہے فوج میں۔ لیکن
پتا نہیں ڈاکٹر شہان کو کیا ہو گیا ہے۔ بہت ہی
خاموش! فہرہ ہو گئی ہیں۔ مجھے تو ترس آنے لگا ہے۔
پہلے تو اتنی اچھی سی تھیں۔ گلے سیتی تھیں اور
گنگناکتی بھی تھیں۔ ساتھ کپڑے پہنتی تھیں مگر کپڑے
بناتی بہت تھیں مگر سب نیلے رنگ کے۔ نیلے رنگ
کے سارے شید۔ مجھے پتا نہیں کیوں لگتا ہے۔ وہ مجھ
سے کتراتی ہیں۔ پہلے کی طرح۔۔۔“

”کیس وہ خود تو ڈاکٹر غازی میں انٹر سٹڈ نہیں تھیں؟“
رجانے منہ بھاڑ کے کہا۔
”ہیں! اس کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔“

”باجل ہو تم۔ وہ بڑی ہیں ان سے۔۔۔“ اس کا دل و
دماغ مل گیا تھا مگر ڈپٹ کر جواب دیا۔ رجا کو بھی اور خود کو
بھی۔۔۔

”برے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔“ رجا مہر تھی۔
”احتم! خود سوچو! ایک بے حد حسین، قابل ڈاکٹر ایسے
سخت موسموں سے لڑتی اس بیباں میں کیوں بڑی ہے
تم کو پہلے ہی دن سہیلی بنالیا۔ مگر ساتھ ہی وارننگ کر
دی۔ بی بی اپنا حد نہ لانا۔۔۔ تیس سال بھر ہونے کو آ
رہا ہے اتباع۔۔۔ تمہاری عقل آخر ہے کہاں۔ کیا
کرتی ہو تم۔۔۔؟“ رجانے گویا سر پیت لیا۔

”ارے! احتمال! دماغ پر زور ڈالو۔۔۔ اور کوئی ایسا پل
ڈھونڈو جو ان کا بھید دے گیا دونوں ساتھ دیکھے بھی
۔۔۔؟“

اتباع کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔
”وہ۔۔۔ وہ تو اکثر ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ مل۔۔۔ مل
کر کچن میں کبھی کھانا بھی پکاتے ہیں۔ وہ اس بار ان
کے لیے شاپنگ کر کے آئیں۔ وہ بھی نیلے رنگ کی

سر۔۔۔ ساکھ واٹ پر کسی جاگے ہیں۔۔۔ کیو پر
گئے تھے وہ تو بہت اچھے دوست کی طرح حرجا۔
اس کی آواز خوف سے بھٹ رہی تھی۔

ب۔۔۔ بلکہ دو۔۔۔ دونوں کی برتھ ڈے کی ڈیٹ
ایک ہے ڈاکٹر شاہان نے خود کیک بیک کیا اور۔۔۔ اس
پر G اور S بھی لکھا تھا ہائے۔۔۔ اس کے بدم ہاتھ
نیچے گر گئے۔

”اتحق اعظم۔۔۔!“ رجانے دانت پیسے ”تم ہر بار
لوگوں پر اعتبار کرتی ہو۔ محبت کے نام پر سب لٹا دینے
کو تیار ہو جاتی ہو۔ تالی کو پوتا دینے کے لیے ہمو بننے
چلی تھیں۔ اسٹور کے لالچ میں ہوتا رہے تھے وہ
مہیں۔ اتنی سامنے کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں
آئی۔

ماموں کے کالے منہ والے سالے کو ماموں جان
ماموں جان کہتی رہیں اور وہ عیار لو مٹر صرف جان جان
سنٹا رہا۔۔۔ مہیں لوگوں کے چرے اور آنکھیں بڑھنے
کیوں نہیں آتیں۔“ رجا اپنے بال نوچ لینے والی تھی۔
”کیا دنیا میں کہیں سچ نہیں۔ غلوں ایمان داری۔“

”تو۔۔۔ تو انہیں کس نے روک رکھا تھا۔ وہ۔۔۔
انہیں اپنا تے نال۔ میں تو ابھی کل۔“ اس کی آواز
ہکلاہٹ کا شکار تھی۔

”بیچھے بڑی ہوگی مگر ڈاکٹر عثمان غنی کو کیا پڑی ہے کہ
وہ اتنی بڑی عمر کی عورت کو سوہنا تیں۔ پس بولو۔“
”یعنی اس دھوکا دہی میں سربھی شامل ہیں۔“ اس
کا دل چور چور ہو گیا۔

ڈاکٹر عثمان غنی جن پر وہ اتنا اعتبار کرتی تھی کہ وہ
کہتے تو وہ آنکھیں بند کر کے بس ان کے ہاتھ کو تھام کر
اس خطرناک ندی کے سرے پر پہنچ جاتی جس پر ایک
نگاہ ڈالنے کے لیے دل گردہ چاہیے تھا۔
”مگر وہ روز کے پھول۔“

”ہاں لیکن دیا! ایک بار۔۔۔ ایک بار بھی ڈاکٹر
غازی نے اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے تو اقرار کیا تھا۔
اثبت میں سر ملایا تھا اپنے بابا کی گفتگو پر۔“ ہاں وہ

سب پالنے کے مکان میں۔۔۔ لکھی باتوں کو فراموش کر
گئی۔
لیکن یہ سب رجا کا تلخ ترین حقیقت پسند ہونا بھی تو
ہو سکتا ہے۔ رجا جیسے حقیقت پسند لوگ جو ہر چلو کو
جاچتے ہیں۔
اور اس جیسے خوش فہم جو سب اچھا اچھا دیکھنا پسند
کرتے ہیں۔

”چرے پردہ آنکھیں ہی جیتی ہیں۔ تیری آنکھ اگر
ماتھے پر نمودار ہو جائے تو بد صورتی اور خوف کا باعث
بنتی ہے اور یہی تیری آنکھ اگر نہ ہو تو دنیا ٹھو کر لوں پر
رکھ لیں۔ یہ سائل کہتی ہے آوازے کستی ہے۔
اللہ نے یہ تیری آنکھ سب کو دی ہے۔ مگر پوشیدہ
رکھ کے۔ مگر جو لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی
کسی مقام پر نہیں ہارتے۔ نامور بیدار ڈے دار لوگ۔“

بہت پہلے پڑھی گئی بات اس کے دماغ سے ٹکرانی
رجا کب کی آف ہو چکی تھی۔ وہ دیوار سے لگی تھی
پھسلنے پھسلنے زمین پر بیٹھ گئی۔ سر گھٹنوں میں دے کر
وہ بہت عرصے بعد تنہائی اور کماہنگی کے احساس کو لے
کر روئی تھی۔

سوچوں نے اس کے اعصاب پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔
وہ شدید سر درد اور سرخ آنکھوں کے ساتھ اپنے بستر
میں دھنسی رہی۔ اس نے طبیعت خرابی کا کہہ کر
دیروازہ بند کر دیا۔ وہ تکیے پر گال ٹکائے اونڈھی پڑی
تھی۔ روئی کی کوجذب کرتی جا رہی تھی۔

وہ کڑیاں جوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہان اور ڈاکٹر غازی
۔۔۔ کڑی در کڑی۔ ایک لمبی زنجیر تیار۔ ایسی زنجیر جو
اس کی گردن کے گرد گھنچہ کستی جالی تھی۔ اس کا
سانس گھٹتا جاتا تھا۔

ہاں وہ بے خبری میں ماری گئی۔ ڈاکٹر عثمان غنی تو
جانے تھے ناں کہ وہ ایک مخلص رشتے کی متلاشی ہے۔

صرف غلوں کی ناپائیدار چاہ۔ کیا دنیا میں کوئی چیز پوری
اس کے لیے نہیں تھی اور کیا ضرورت تھی
ڈاکٹر غنی کو اسے اس سب معاملے میں گھٹنے کی
اس نے کب خواب دیکھا۔ فرمائش کی۔ وہ تو اپنے
موجودہ سیٹ اپ سے بہت خوش تھی۔ اسے لوگ
باجل جگہ موم سب راس آگیا تھا۔ وہ ڈاکٹر غنی
سے دوستی محبت مشقت سہیہ وار اعتبار کا رشتہ بنا کر
نام عمر یہاں گزار دیتی تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ پچھتاوا
بچ کے نہ لگتا۔ اس نے بدریسا بننے کا بھی نہیں
سوچا تھا مگر کیا ساری زندگی خدمت خلق کے ساتھ
گزارنا مشکل ہوتا۔ اسے جوڑی دار کی ہر لحاظ سے
طلب تھی۔

مگر کیا دولت اور نام پانے کے لیے نہیں نہیں۔۔۔
وہ ہمیشہ رشتوں کے پیچھے لپکی تھی۔

اس نے بے اولاد تیا زاد کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا
تھا بدلے میں وہ اسی خاندان گھر عشر کا حصہ رہتی اور
کیا چاہیے۔ وہ ماں کے چرے کا عکس کھونچنے کے
لیے اس کالے منہ والے سالے پر بھی بان لیتی۔ اسے
مرگ کی چاہ بھی نہیں تھی۔ وہ اسے خدا کے فضل
سے حاصل تھی۔ دولت وہ دونوں ہاتھوں سے کما سکتی
تھی۔ دولت اس کے بینک میں ہر ماہ جمع ہوتی رہتی
تھی۔ وہ تو بس پر غلوں رشتوں اور اعتبار کی متلاشی
تھی۔ ہاں۔۔۔

”کیا ڈاکٹر عثمان غنی جیسے شخص نے اسے ٹریپ
کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بیک ڈاکٹر بیک بلڈ
ان کے اسپتال کے لیے۔“ شک اس کے اندر بار بار
مر اٹھتا اور وہ اس کا سر چل چل ہار گئی۔

سب ہی تو واقف تھے۔ پلوٹے میں شاید کچھ موت
لحظ تھا مگر اپنا بی جیسی منہ پھٹ کر ڈی عورت۔۔۔
اس نے سوچا کہ وہ ہر بار اسے دیکھ کر یا قاعدہ ہر بر طاتی
تھیں۔ ان کے لمبے کی کاٹ اور تفحیک۔۔۔ وہ کچھ
تسلے تو اتارے ہو تیں۔ کبھی دیکھے کبھی ہانک ڈال۔۔۔

زمانی ٹول دا کرو دا اختیار و احستو

اور

رستورالانزا دا کور مشر اشوہا
اس نے منہ ڈھونڈ لیا تھا۔
”بعد میں آئی اور گھر والی بن بیٹھی۔“ ہا۔۔۔ وہ حق
دق رہ گئی۔

ڈاکٹر غنی نے اپنی پسند کو بیٹے پر ٹھونسا۔ وہ کرتے
کرتے نہ کرتے بیٹے کی مرضی مگر اسے کیوں گھینا؟ کیا
وہ اب کبھی بھی کسی کا اعتبار کرے گی۔ کسی بھی رشتے
کا۔

اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے والے لوگ

۔۔۔

وہ آج پھر وہیں کھڑی تھی جہاں سے چل تھی۔ امی کا
انتقال۔ نہیں ابو کا۔۔۔ چاچو۔۔۔ گھر والوں کا منفقہ۔
رویہ۔۔۔ ماموں کے گھر اس کی آؤ بھگت اور پھر اس کے
انکار پر سالے صاحب کی جارحانہ حرکتیں۔

اس کی نفسیاتی روم میٹ۔۔۔ لیکن نہیں۔ سب
سے زیادہ تکلیف اس کی بار ہوئی تھی۔

کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ۔ شاہان کا رویہ۔ انہوں
نے پہلے دن تادیب کر دی تھی۔ وہ دوست بن کر رہتی
تھیں۔ مگر شاید دوست بناتی نہیں تھیں۔ ڈاکٹر غنی
سے اس نے بہت خوب صورت رشتہ بنایا تھا۔ کاش
ڈاکٹر شاہان اسے کچھ بتا دیتیں۔ کوئی اشارہ دیتیں تو وہ ہی
ڈاکٹر غنی کو قائل کر لیتی۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر غازی ڈاکٹر
شاہان سے عمر میں کچھ چھوٹے تھے مگر اس سے کیا
فرق پڑتا ہے۔

ڈاکٹر شاہان کو تھوڑی سی گرومنگ کی ضرورت
ہوتی۔ وہ خود کو ذرا سا فریش لک دیتیں۔ ڈھیلے بال
شعر رنگ تو بالکل ہی انڈونیشیہ معلوم ہوتیں۔ مگر وہ تو
ایک آؤہ بار ٹوٹنے پر بھی اپنے گیٹ اپ پر مصر رہیں۔
لیکن وہ یہ سب کیوں سوچ رہی ہے۔ اسے کیا
حاصل۔۔۔ بلکہ اس نے تو سب کھو دیا۔

رجا کہتی ہے وہ لکھو جوں جو عید دے سکے۔
”ہا۔۔۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔“ کھونچنے کی کیا
ضرورت سب سامنے ہی تو تھا۔ بس اسے پتا نہیں چلا
۔۔۔ اسے کبھی پتا نہیں چلتا تھا کسی بھی چیز کا۔

وہ دونوں بہت اچھے دوست معلوم ہوتے تھے۔
وہ اکثر انہیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دور دور تک
واک کرتے دیکھا کرتی تھی۔ نجانے کون کون سی باتیں

اور

اور ایک روز وہ رو رہی تھیں اور ڈاکٹر غازی نجانے
تسلیوں کے کون کون سے جملے ان کے کانوں میں
اندھیل رہے تھے پانی کا گلاس پلارے تھے۔
ہاں اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ایسے ہی ایک
موقع پر ڈاکٹر غنی کے چہرے پر شدید ناگواری، بے بسی،
غصہ سا تھا۔

ڈاکٹر غازی کے انداز میں ناگاہی۔

اور ڈاکٹر شیلان کی شکوہ کنال نگاہیں۔ ڈاکٹر غنی
کے چہرے پر تھیں اور وہ جیسے پیر پختے کمرے سے نکلے
تھے۔

وہ اس منظر کو دیکھ کر ٹھنک گئی تھی مگر نہیں۔ انسان
ہنستے ہیں۔ روتے ہیں۔ وہ دکھی ہوتے ہیں۔ فغا ہوتے
ہیں تو منایا جاتا ہے۔ روتوں کو چپ بھی کرواتے ہیں اور
پانی کا گلاس بڑھانا آنسو پوچھنا ممنوع ہے۔ اس میں
گلاب کی کھونج۔ ہا۔

انسان کسی بھی بات پر کبھی بھی دکھی ہو سکتا ہے۔
ہائے۔ اسے مشتق کیوں بنایا گیا؟

اس نے شاید پہلی ملاقات کے پہلے پل میں ڈاکٹر
عثمان غنی سے اعتبار کا رشتہ جوڑا تھا۔ اور پھر یہ اعتبار
دن بدن مضبوط ترین ہو گیا۔ ایمان کی طرح۔ اور

”تم لڑو۔ گربان پکڑ لو اس غازی کا۔ شہید کرو
اسے۔“ رجاست دور بیٹھی چلا رہی تھی۔
”شیلان کو آئینہ دکھاؤ۔ احق!“

”اور ڈاکٹر غنی۔ خود غرض آدمی مان ہی جاتے
زندگی تو بیٹے کے گزارنا ہے ناں۔ ہٹ دھرمی کیوں
بھلا۔۔۔؟“

”اور وہ کرپٹ پلان میک غازی۔ باپ کو خوش کر
دیا۔ پسندیدہ بھولا دی دونوں واک کرتے جاتے سر“

بہو۔ کتابوں میں جھک سارتے۔

وہ محبوبہ کے آنسو پوچھتے۔ دو آنکھوں کا درست
استعمال۔۔۔ دونوں پہلو آباد ہونہ۔! رجا کے آگ مجھے
گرم جملے اس کاتن من پھونک رہے تھے۔

”ہاں وہ ہمیشہ فالٹو ہی کی تھی۔ اس کے پاس کوئی
جگہ نہیں۔ اس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ وہ دوسرے
ادھر ادھر لھکتی رہے گی۔ بعض لوگوں کے لیے زندگی کیند
کی طرح ہوتی ہے لٹنا نصیب نہیں ہوتا۔ نہیں رہے
گی وہ اب یہاں۔

رشتوں سے بے اعتباری اور ٹھوکریں اس کے دل
میں سوئیوں کی طرح گزری تھیں۔ مگر اس بار اس کے
دل میں بھلا اتار دیا گیا تھا۔ خون ہی خون۔ محبت بھرا
دل سالوں پھیلتا ہے اور اس کا دل اس شخص کی محبت
سے بھرا تھا جس نے بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ فقط
تالبداری میں سر ملادیا تھا۔

محبت کی سحر ہوتی ہے جسم میں گھس جاتی ہے
دھیرے دھیرے بے خبری میں جگہ بناتی ہے۔ پتا تب
چلتا ہے جب پورا وجود کیسے زندہ ہو جاتا ہے۔ لاعلان۔
اسے بھی پتا نہیں چلا تھا وہ کب ڈاکٹر غازی کی اسیر
ہوئی۔ کاش۔۔۔ بھاڑ میں گئی ڈاکٹری جو اپنے اندر پتے
نا سورے بے خبر تھی۔

وہ روشنی سے اندھیرے میں داخل ہوئی تھی۔ سو
مانوس ہونے میں کچھ پل گزرے ایک میٹھے سے وہ
ساری دنیا سے گویا منہ پھپھائے نیم تاریک کمرے میں
پڑی تھی اور ابھی اتنی بہت زیادہ آوازوں پر بادل غمازہ
باہر آئی تھی۔ ہائیں۔۔۔

وہ سب۔۔۔ سب کے سب جھٹکا کر اس کے پیچھے
کیوں آگئے تھے؟ وہ کیا ان کا کچھ بے آئی تھی؟ غلطی
نہیں۔ اس نے جلد بازی میں بس ایک بڑے بیگ میں
کچھ بے حد ذاتی سامان کاغذ کاغذ چند کپڑے خوبنے
تھے۔ وہ خانو کی گاڑی میں خاموشی سے آکر بیٹھ گئی تھی

کوئی سوال نہیں خانو! بس چلو مجھے لاری اڑے
اور میں اور جہیں اللہ کا واسطہ کسی سے نہ کہنا۔ تم نے
مجھے جھوٹا بلکہ کہاں چھوڑا۔“ اس کی حرکت اور لاتی

”میں کچھ لے کر نہیں بھاگ رہی۔ تم میرا بیگ
لیک کر لو مگر بس یہاں سے نکلو۔ نکلو! خانو۔“ وہ رو
نے کو تھی۔ پتہ ہی آواز میں چلائی۔

وہ اپنی تمام کتابیں چھوڑ آئی تھی۔ اپنے سارے
کرم کپڑے۔ اس نے دوبارہ ان برنوں میں نہیں جانا
تھا۔

اور ان کتابوں میں سب جھوٹ ہوتا ہے۔ ان میں
لکھے گئے لوگ دکھائے گئے خواب۔۔۔ حقیقت میں
کسی وقوع پذیر نہیں ہوتے۔

وہ کبھی ان بھونڈے سہاروں پر اعتماد نہیں کرے
گی۔

وہ رجا کے ماموں کے گھر آئی تھی۔ وہ آگے کہاں
جلنے والی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔
اس نے بہت خوب صورتی سے سچ بڑے سے
زر انگ روم کے صوفے پر بیٹھ لوگوں کو دیکھا۔ وہ
سب اسے ہی دیکھ رہے تھے اور وہ۔۔۔ اس کی نگاہیں
ڈاکٹر شیلان پر ٹکیں۔ آسمان جیسے نیلے اور سیاہ امتزاج
کے سوٹ میں بے حد فریش اور خوب صورت نظر
آ رہی تھیں ان کے ہونٹوں پر بہت دنوں بعد اس نے
بر غلوس مسکراہٹ دیکھی اور نیلی آنکھوں میں چمک
خوشی اور شرارت سی۔

وہ خود سے آگے بڑھ کر یوں گلے ملیں جیسے صدیوں
کی بچھڑی ہوں اور اسے پا کر نال۔۔۔

ڈاکٹر غنی کریم کلر پینٹ پر گہری نیلی شرٹ میں تھے
اور اس کا۔۔۔ غازی کا نیلا سرمئی نمچیک۔۔۔ یہ نیلا
۔۔۔ زہر کا رنگ اس کی خوشیوں کو زندگی کو نیلا کر
گیا تھا۔۔۔ کڑواہٹ نیل و نیل۔

وہ اب کیا کرنے آئے ہیں۔ صفائی دینے، سچ سنانے
بھٹ کھڑنے۔

مگر وہ کسی کا اعتبار نہیں کرے گی۔ وہ تسلیم کر چکی

ہے حقیقت جان چکی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ بے وقوف
ہے مگر مومن ہے۔ ایک ہی سوراخ سے بار بار۔۔۔
نہیں قطعی نہیں۔

وہ ممائی بیگم کی ایکسانٹمنٹ دیکھ کر حیران تھی۔ وہ
کچن کیبنٹ دھڑو دھڑو کھول بند کر رہی تھیں۔

”تم زرا کرٹل صاحب کو جا کر دیکھو۔ کتنے خوش ہیں
کہہ رہے ہیں۔ تین بیٹے پیارے۔ ہر بار جا کر
درخواست پیش کرنا پڑی کہ جی اپنی بیٹی ہماری بنادیں۔
یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی ان کے در پر مانگنے آیا ہے۔
کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر غنی کے جوئے گھسوا کر ہی
”ہاں“ کریں گے۔“

”ہائیں!“ اس کے سر سے سب گزر گیا۔ ”رجا کی
بھی یہی بدایت ہے۔“ وہ پچن سے ٹرائی کھینچی نکلیں۔

”رجا کی بھی۔۔۔“ اس نے دہرایا۔ کیا اسے سننے
میں غلطی ہوئی۔ وہ بس چند منٹ گھر کر ممائی کے پیچھے
کچن میں آگئی تھی۔

”اور یہ سب یہاں تک کیسے۔۔۔ اور۔۔۔ رجا؟“
اس نے اپنی پیشانی مسلی۔

غازی نے کچن کے دروازے پر ٹھک کر اس کی
جانب دیکھا۔ نیلے اگوری جارحیت کے سوٹ میں
بہت کمزور ابھی دکھائی دے رہی تھی وہ ڈانٹنگ ٹیبل
کے پاس اونچی اسٹول نما کرسی پر بیٹھی تھی۔ ٹراؤزر کے
کٹ سے دو جھپٹا بیڈی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا
مسلل ہلتا پیر اندرونی خلفشار کا مظہر تھا۔ سفید انگوٹھے
والی چپل اس کے پیروں میں بے پناہ جج رہی تھی۔

”سچائی کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کا۔۔۔؟“ وہ
اطمینان سے کرسی گھٹٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کے دل و دماغ میں
جھگڑتے۔

”غلط فہمی کی گھڑی بد اعمالوں کی گھڑی کی طرح
وہ زنی ہوتی ہے اتباع!“ وہ بری طرح چونکی۔ اس نے
پہلی بار۔۔۔ پہلی بار اسے ڈاکٹر اور صاحبہ کے سامنے
لاحقہ بغیر کا تھا۔

”یہ سچ ہے کہ تم۔۔۔ بقول بابا۔۔۔ انہیں پہلی نگاہ ہی میں پسند آگئی تھیں۔ بھولی بھالی معصوم تھیں۔ بیٹی بیٹی سی۔ پھر بہت جلد بوسہ بوسہ بھی۔ ہاں میں نے فیصلہ دیر سے کیا۔ یہ تو میں نے سالوں پہلے سوچ لیا تھا کہ میں اب بابا کی بات سے انکار نہیں کروں گا کہ انہوں نے میری اتنی بڑی بات مان لی۔ شہر چھوڑ کر دوست احباب بھلا کر وہ میرے خواب کے لیے یہاں آگئے۔ میں نے تب ہی قسم کھالی تھی کہ انہوں نے میری ایک مانی ہے اور میں ان کی سوسے مانوں گا۔“

(جب ہی شاہان کو چھوڑ دیا)
”اچھی بری بھلی جیسی بھی۔۔۔ وہ قصداً رکاوٹ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا مگر اندر برہا ہوئے طوفان سے قطع نظر وہ بہت خالی پن سے اجنبی کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

”بابا کا تجربہ عمر مقام وہ پہلی نگاہ میں تمہیں بھانپ گئے جبکہ میں ان سے عمر میں کم اور عقل میں تو لازمی تم ایک دھیمے نرم احساس کی طرح مجھ پر حاوی ہو گئی۔

ارد گرد سے بے خبر۔۔۔ فون پر ہنسی لڑی۔۔۔ دوست کو دریاں سمجھ کر بل بگاڑتی لڑی۔۔۔ ہمدرد۔۔۔ مگر اصول پسند۔۔۔ باہت۔۔۔ مگر بہت بزدل۔۔۔ بھی۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوشی سے اچھلنے والی۔۔۔ لپٹا پیروں میں دل گیا تو تکلیف شرمندگی کے احساس سے روئے والی۔

بہت سادہ۔۔۔ بہت گہری باتیں بھی کرتی اور جس کی خواہشیں تم ایک کتاب تھیں اتباع! اور ہر صبح ایک نیا ورق پلٹ جاتیں گویا۔۔۔

اس نے اسے اتنی گہرائی سے دیکھا تھا اور سوچا۔۔۔ لیکن اب وہ کیا کرنے آیا ہے باپ کی فرماں برداری کی

قسم پوری کرنے کے لیے۔۔۔ لیکن وہ نیلی آنکھوں کا اداس چہچھا زندگی بھر کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ میری غلطی ہے کہ میں نے اظہار نہیں کیا۔ اس نے پہلی بار چونک کر نگاہیں اٹھائیں۔

”رجانے بتایا تم کوست گلے ہیں مجھ سے۔“
”رجانے وہ بھونچتی رہ گئی۔“
”میں سب کتا اور کرنا مگر تم بھاگ نکلیں۔“
اتباع کی آنکھوں میں حیرت شرمندگی اور خوف آ رہا۔ کیا وہ رہا تھا اس کے ساتھ۔ اس نے اپنا سر پکڑا۔ غازی کو اس پر ترس آگیا۔ اس کی آنکھوں کا غلغلہ بن۔ ہونٹوں کی پٹری اور تحیف وجود۔ وہ اسے اس آنکھوں سے تو نکالے ورنہ اتنے خوب صورت الفاظ گویا ضائع ہی جا رہے تھے۔

”نیلا رنگ میرا پسندیدہ ہے۔ ڈاکٹر شاہان کا پسندیدہ رنگ گلابی اور سفید ہے۔ لیکن اتباع! نیلا رنگ بابا کا بھی تو پسندیدہ تر بن ہے ناں۔ مجھے اس لیے پسند ہے کہ شاید باپ بیٹی کی چوائس ایک ہے مگر ڈاکٹر۔ شاہان کو یوں پسند ہے کہ وہ ڈاکٹر غنی کا پسندیدہ رنگ ہے۔

”ڈاکٹر صاحبہ کی غلط فہمی تو دور ہوئی۔ اب تم بھی دل صاف کرو اور یہ آنسو بھی۔ منظور واضح نظر آئے گا۔ غازی نے اپنی انگلیوں سے اس کا سر ہلایا۔

اتباع کی کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر اس نے دوبارہ بارہ غازی کے الفاظ دہرائے تو جیسے اچھل پڑی۔

کیا۔۔۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

”ڈاکٹر عثمان غنی اور ڈاکٹر شاہان!“ وہ ایک دم کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ کا مطلب ہے۔۔۔ کہ سر اور۔۔۔ ڈاکٹر شاہان۔۔۔ اللہ؟“ اس کے ارد گرد ہمارے ہوئے تھے۔

”جی ہاں!“ غازی نے مزے سے کہا۔ ”آپ غلط فہمی کا شکار ہو کر بھاگ نکلیں اور وہ رورو کر جان بھگائی رہیں۔“ اس نے دونوں خواتین کا مذاق اڑایا۔

وہ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔ اس نے سر ہاتھ پر مگر الیا۔

”تو وہ سب؟“
کھڑکی کے کھلے پٹ سے ٹھنڈی ہوا میں چپکی ٹپٹپٹ۔ تو کیا وہ ڈاکٹر غنی کو دیکھ رہی تھیں اتنی دل

”میں۔۔۔ مم میں نے تو بھی نہیں دیکھا۔ انہیں اسے۔۔۔ وہ تو آپ ہی کے ساتھ۔“ وہ دوبارہ اپنی بات پر کی ہوئے لگی۔

”کیا نہیں دیکھا۔ بابا ایسا کوئی پل آنے ہی کب بے تھے۔ جان چمڑا کر بھاگتے تھے گویا۔ میرے ساتھ اس لیے تھیں کہ میں تو جیسے سہیلی تھان۔ بابا کی بے اعتباری۔ کج ادائیگی۔ بے رخی اور بہت کچھ کے گلے وہ میرے سامنے ہی کرتی تھیں ناں۔۔۔ شکایتیں لگاتیں اور بدلے میں مجھے متوقع امی کے آنسو پوچھنے ہی پڑتے۔“ وہ بہت ہی شریر انداز میں کہہ رہا تھا۔

اتباع قطعاً نہ مسکرائی۔ ”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”تو آپ اتنی رحمت کیا بھی نہ کریں۔ رجابی کی کتنی

ہیں۔ آپ کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا سب بتانا پڑتا ہے۔“

”رجانے کیا کہا۔۔۔ کب؟“
”ان ہی نے سب کہا۔ بھئی آپ بہت خوش قسمت خاتون ہیں جو ان جیسی دوست ہیں آپ کے پاس۔ اتنی دور سے مقدمہ لڑ کے جیتیں۔ وہ لڑتے لیے اچھا ہے دور ہیں ورنہ۔“ غازی نے ہاتھ اٹھائے۔ پھر اسے اس کے حال پر جیسے رحم سنا گیا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ میں ڈاکٹر شاہان کے لیے سہیلی جیسا ہوں۔ ان کا واحد ہمدرد اور کامیابی کے لیے کب

اب کرنے والا واحد تماشا بنی۔ مگر مجھے آغاز کی بالکل خبر نہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ کا کالج لائف کا کرش تھا شاید۔۔۔ نو عمری میں لڑکیاں اپنے استاد سے متاثر ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ پھولی دیتی ہیں کارڈز، کفٹنس۔۔۔ وہ عمر کا ایک انتہائی جذباتی دور ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی وہ سب بھول بھال جاتی ہیں۔

مگر کچھ ڈاکٹر شاہان جیسی بھی ہوتی ہیں۔ بابا نے آغاز کو بہت سرسری لیا۔ وہ زبردست پرسنالٹی کے مالک تھے۔ خیر و دراز قد، ہنسنے کے شہنشاہ۔ پھر میری امی کے انتقال کے بعد۔۔۔ رجسٹرڈ نوآرے ان کی بہت ڈیمانڈ تھی۔ ایک نرسز ڈاکٹر بھی ہو کے بھرتی تھیں۔

بابا بہت باوقار طریقے سے ہینڈل کیا کرتے تھے۔ یہ سارا شور و غوغا س مسکراہٹ ٹینسیدگی کی نگاہ تک محدود رہتا۔ کوئی بد مزگی نہیں۔ مگر شاہان کی پسندیدگی جنون بن گئی۔ پتا نہیں کب اور کیسے وہ اتنا آگے بڑھ آئیں کہ واپسی کے راستے بند ہو گئے۔

بابا کا پہلا ریمویشن صرف اور صرف حیرت تھی۔ پھر اس پر شرمندگی۔۔۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کے کردار پر حرف آتا۔ وہ اتنی چھوٹی تھیں۔ ان سے اور بابا کیسے خیر مقدم کرتے اگر انہیں دوبارہ کھڑا سانا ہوتا تو میری امی کے فوراً بعد بسا لیتے۔ مگر وہ میری پرورش کا مشکل دور گزار چکے تھے۔ ان کے دوست احباب کتابیں، ڈیسیاں انہیں گنجائش نہیں تھیں۔

ڈاکٹر شاہان کو بے وقوف کہہ کر جان چمڑانے کی کوشش کی۔ تاوان کہا۔ زمانے کی اونچ نیچ۔ تماشا مگر وہ نجانے عشق کی کس منزل پر پہنچ چکی تھیں۔ ہر مثال ان کے تلوے کے نیچے ہوتی۔ انہیں کسی بھی طرح قائل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

عمر کافرق۔ فضول بات۔

آیا تو سب سے نمایاں کر کے بال بٹائے اپنی عمر سے
بڑا نظر آنے کے لیے سو سو جتن کرتی ہیں اب بھی مگر بایا
.....
میں ان سے لڑ کر آیا ہوں۔ ایک لڑکی ان کے لیے
ہر شے کو چھوڑ چھاڑ موسم کی سختیاں جھیل رہی ہے۔

ڈاکٹر غازی مسلسل بول کر چپ ہوئے۔
”یہاں آتے ہوئے بابا خوش ہو گئے۔ بھول بھال
جائیں گی شاہان انہیں۔ مگر مزہ آگیا جب وہ یہاں
تک آ گئیں۔

بابا خوب بھنائے۔ ”سے کیوں رکھا۔“ میں نے
کہا میں اپنی قابل ڈاکٹر کو واپس نہیں کر سکتا۔ بابا کے
پسندیدہ رنگ بنتی ہیں ویسا ہی رفدوم ان کے گھر میں
سب بسن بھائی اپنی زندگیوں میں مگن۔ شاید ہی کوئی
جانتا ہو وہ کس پتھر سے سر پھوڑ رہی ہیں۔
آپ نے بھی نوٹ نہیں کیا۔ بابا بھی غلطی سے
یہی پوچھ لیں۔ ”شاہان ہینشٹ نمبر 2 کا کیا حال ہے؟“
تو وہ چار دن تک فقط مخاطب کیے جانے پر جھوم سکتی
ہیں؟“

اس نے اس سے تو یوں سوال کیا جیسے بڑی فاطمہ
فاضلہ ہو۔ جس کے چہرے پر رنگ آ رہا تھا جا رہا تھا۔
”سر۔۔۔ سرمانے کیوں نہیں۔ اپنی تو پیاری ہیں
وہ۔۔۔ ہائے!“ سے دکھ نے گویا نہ حال کر دیا۔
”میں نے دیکھا ہے کئی بار انہیں۔ او اس خاموش
بے چین روتے ہوئے مائی گاڑ۔“ وہ حق دق تھی۔
اکشفا فاف!

”سر کتنے ضدی ہیں۔ لگتے تو نہیں۔“ اسے اب
اور کچھ یاد نہیں رہا تھا۔
”ضدی ڈاکٹر صاحبہ بھی کم نہیں۔“ غازی گویا
لطف اٹھا رہا تھا۔ ”کہتی ہیں۔ محبت میں ضد نہ ہو تو
محبت تھوڑی ہوئی۔ آج تو مکمل کوئی اور کیوں۔“
اتباع کے سر پر دھماکے ہو رہے تھے۔

(کلیک پر لکھا اور G۔۔۔ G فار غازی۔۔۔ اونہوں
G فار غنی۔ ہاں)

”اندر ہی اندر سوال جواب نہیں کرتے۔ بعض
اوقات پوچھ لینا چاہیے قافہ شناسی ہنر ہے مگر ہر ایک
اس میں طاق ہو ممکن نہیں۔ اور تم سو رہی ٹوٹے۔
بالکل بے وقوف ہو۔ میں بابا کے دیے دکھوں کا دوا
کرنے کے لیے بس انہیں کندھا دیا کرتا تھا۔“

”ارے!“ اتباع کے چہرے پر حیرت اور شرمندگی
کے بعد خفگی آرکی۔

”میں نہیں کہہ رہا پکی رپورٹ دی ہے آپ کی بل
بی رجانے۔“ وہ ہنسا۔

”واپس چلو اتباع! تم سمجھانا بابا کو۔ تم ان کی پیاری
بٹیا ہو۔ وہ تمہاری بات نہیں ٹالیں گے۔“ غازی نے
بہت جذب اور مان سے کہا۔

”وہ بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے محبت۔ میں بالکل۔ بابا
کو شاید فرق نہ پڑے مگر وہ ختم ہو رہی ہیں۔ کھل رہی
ہیں۔ اس سے پہلے کہ گزر تا وقت شادابی اور محبت کو
ڈھانسا شروع کر دے۔“

”میں بھی ناں۔۔۔ بس۔“ یہاں یقیناً ”اب اس کا
روا بننا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیں۔

”ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ آخر تم اتنا روئی کیوں ہو۔
ارے؟ مجھے کوئی ججزہ نہیں۔“ وہ بوکھلا کر کھڑا ہوا پھر
بیٹھ گیا۔

”یار! ابھی تو میں نے اظہار محبت بھی نہیں کیا اور
سچ مجھے اس کا تجربہ بھی نہیں۔ بڑی پریشانی ہے۔
میرے بھوٹے انداز پر کہیں تم سوسائٹیڈی نہ کر لو
۔۔۔ منہ سے تو کچھ کہتی ہو نہیں بس جو سودا سر میں
سمائے۔“

وہ اس کے چہرے کو دیکھنے کی سعی کرنے لگا۔ کیا
ہاتھ ہٹائے۔

مگر اتباع شرمندگی رخالت کے بعد اب شرم سے
چہرہ چھپانے ہوئے تھی اچھائیوں ہے۔ تو پھر یوں ہی
سی۔

کھلے ہیں دل کے کواڑ، آجاؤ
بہت بے چین، بے قرار، آجاؤ
کیوں ہے شکوہ میری خوشی سے

میں کروں گا اظہار آجاؤ
کچھ نئے پھول ڈھونڈ لایا ہوں
کر لو ان کو گلے کا ہار آجاؤ
آنے والا ہے برف کا موسم
اس کے پیچھے بہار، آجاؤ

”یار کب تک منہ چھپا کر رکھو گی۔ اب بس بھی
کر۔ مانا میں شاعر نہیں ہوں۔ ہوں گے شعر بے وزن
مگر میں تو میرے دل کی بچی آواز۔“

پوری غزل اس کے جھکے سر اور چہرے پر جے
ہاتھوں کو دیکھ کر سنائی تھی اب گویا وہ عاجز ہو گیا۔
”اچھا چلو! اٹھو واپس چلے ہیں۔ برف کا زمانہ لوٹنے

کو ہے۔ اس بار سنو میں بنانا۔ میں تمہاری بھر پور مدد
کروں گا۔ بابا سے کہیں گے۔ وہ ڈاکٹر شاہان کے مددگار
نہیں۔ تم انہیں قائل کر لو گی ناں؟“

وہ عامی سے لہجے میں بولا۔ موصوفہ چہرہ دکھانے کو
تیار ہی نہ تھیں۔

”اچھا پھر تمہاری مرضی۔۔۔ مگر یوں ہے کہ بنو میں
اچھا بن گیا۔ تو اس بار خوشی میں مجھ سے لپٹ جانا اور
میرا تین رکھنا۔ میں ڈھسے جانے والوں میں سے نہیں۔“

وہ شاید واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔
اصولاً ”اتباع کو اب شرم سے چہرہ ہاتھوں سے
ڈھانپنا چاہیے تھا مگر وہ ہاتھ دھبے کر کے کھلی آنکھوں

نہا ہوا ہونٹوں سے۔۔۔ اسے دیکھتے کھڑی ہو گئی۔
اتنے خوب صورت الفاظ اور ایسا عزم۔

باہر نکلتے ہوئے غازی کا اور پلٹنا۔ اس کی آنکھوں
میں محبت اعتبار لگاؤ، یقین، اعتماد، خوشی اور اظہار

کے اتنے گہرے رنگ تھے کہ وہ جیسے رنگوں میں نہا گئی۔
”بے وقوف ہو تم۔ یہ وقت دراصل چہرہ چھپانے

کا تھا۔“ اس نے بہت غیر محسوس دباؤ سے شہادت کی
انگلی سے اس کی ناک کی نوک کو چھوا۔

اتباع کا سر گردن سے جا لگا۔

”زندگی میں ہمارا حصہ محفوظ ہوتا ہے اور رجا صبح
کہتی ہے۔ تم نوازی جانے والی مخلوق ہو۔ اللہ نے کچھ
لے لیا۔ مگر میرے خیال میں۔ بہت زیادہ دے دیا اب
جیسے بابا۔ رجا جیسی، ہر دم غم کسار دوست جو ہزاروں
میل دور بیٹھے معاملات حل کر سکتی ہے اور سب سے
بڑھ کر میں۔۔۔ اللہ نے میرے جیسا شخص تمہارے
حوالے کر دیا کہ جو مرضی کرو۔ اک نگاہ بھی مت ڈالو۔
اس بے چارے نے اب کہیں نہیں جانا۔“
وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اتباع ایک لفظ نہ بولی۔
خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے دل کی پکار
دوسروں کی زبان سے ادا ہونے لگتی ہے۔



خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میرے ندیم



رضیہ جمیل

مکمل کا پتہ:

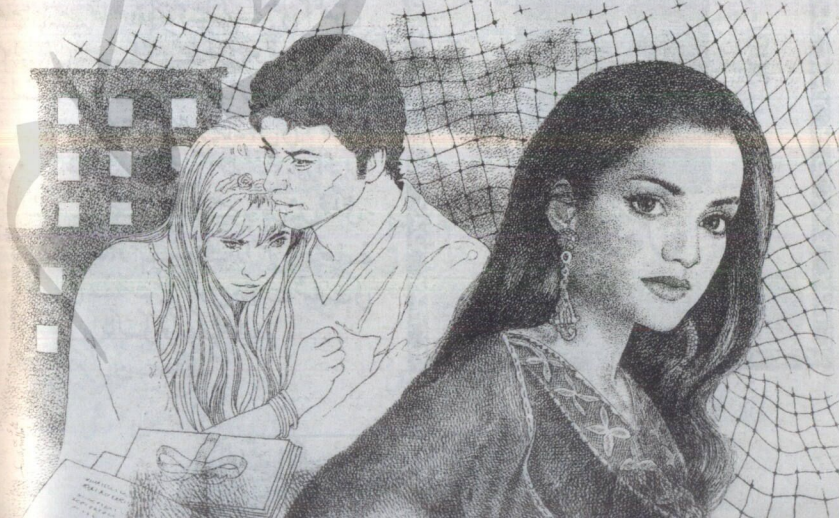
مکتبہ دہران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

قصیدہ گلشن

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشی آکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام ”خوریین“ دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔
”الریان“ کے سربراہ عبدالرحمن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

”مراد بیس“ کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (موی) ”الریان“ آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کاغذ میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ ذریں جانیاد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جانیاد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



عبدالرحمن شاہ کی ہنس مروہ کی سراسرانی رشتے دار مارہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمن فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کر دیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ ”الریان“ والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلیق کرنے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایک کی ”الریان“ میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مارہ اور بیٹی رائیل کے علاوہ سب ایک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ عمر احسان ایک کا قین ہے۔ ”الریان“ میں رہنے والی ترب فاطمہ جو کہ مروہ پچھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے ایک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ ”الریان“ آنے کے لیے بہت ترپتے ہیں۔ عمارہ کو انجانا انیک ہوتا ہے تو عبدالرحمن شاہ بھی بیکار ہو جاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا، حسن رضا اور زبیرہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور پند سم ہے۔ وہ خوب ترقی، کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملوانا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایک انیس عبدالرحمن شاہ کی بیماری کا پتا تا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی بابا جان سے ملنے کے لیے بے چین ہو جاتی ہیں۔

احسان شاہ، فلک شاہ کو مارہ سے اپنی محبت کا احوال سناتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مارہ — ان سے کھل کر اظہار محبت کر چکی ہوتی ہے جبکہ ان کا رشتہ عمارہ سے طے ہو چکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہوتا ہے کہ وہ اسماعیل خان سے جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے لوگوں کو بھڑکا رہا ہے، ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد گھر لے آتے ہیں۔

الوینا جو اسماعیل کے باپ احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کر کے بلاتی ہے۔ اسماعیل، احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت، عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا مسرور ہو جاتا ہے۔ ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی، لیکن گھروالوں کے شدید رد عمل نے اسے مایوس کر دیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

اریب فاطمہ مروہ پھوپھو کی سراسرانی رشتہ دار ہے جسے مروہ پھوپھو بڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں، یہ بات مارہ بھابھی کو پسند نہیں ہے۔ ایک عمارہ کو لے کر بابا جان کے پاس آیا تو اتنے عرصے بعد انہیں دیکھ کر بابا جان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ بابا جان کی طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اسپتال میز، عمارہ کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوتے ہیں مگر مارہ اور رائیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مارہ عمارہ سے کافی بدتمذہبی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ، مروہ پچھو سے مارہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ فلک اور عمارہ کے فوری نکاح کا مشورہ دیتی ہیں۔ پول مصطفیٰ اور عثمان کے ولیمہ میں ان دونوں کا نکاح ہو جاتا ہے۔ مارہ رحیم یار خان سے مصطفیٰ کو فون کر کے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر فلک شاہ کے خلاف بھڑکاتی ہے مگر مصطفیٰ مروہ پچھو سے بات کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں تاہم ان کو یہ فون کال آج بھی یاد ہے۔

فلک شاہ نے حق نوازی کی باری باقاعدہ طور پر اختیار کر لی۔ مارہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ بھی بھی ”الریان“ میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہوگی جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ ”الریان“ سے اگر کوئی ”مراہ پیل“ گیا تو وہ خود کو گولی مار لیں گے۔

سمیرا کو شک ہو جاتا ہے کہ احمد رضا، اسماعیل خان کے پاس اب بھی جاتا ہے تاہم احمد رضا اسے ہلا لیتا ہے اور یوں ہی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسماعیل خان اسے ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یوٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے الٹے سیدھے بیان دلوادیتا ہے۔ حسن رضایہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

عبدالرحمن شاہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو ایک انہیں کرل شیردل کی انیکس میں لے آتا ہے۔ وہاں سے وہ فلک شاہ سے ملنے بہاول پور جاتے کا ارادہ کرتے ہیں۔ احسان شاہ، مارہ اور رائیل کے ساتھ رحیم یار خان چلے جاتے ہیں اور عمارہ سے نہیں ملتے۔ ایک کی پیدائش کے بعد مارہ نے احسان شاہ کے ساتھ منگنی کرتے ہوئے فلک شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی نہیں بھولی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ ضرور لے گی۔

ایک ارب فاطمہ سے اظہار محبت کرتا ہے۔ حسن رضا، احمد کو گھر سے نکال کر کدھی ہو جاتے ہیں۔ تاہم انہیں احمد کی حرکت پر ملال بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے معافی مانگتے ہیں اور اس کے دوست ابراہیم کے ساتھ اسے دھوئیں دے کر طیب خان کی کوٹھی میں جاتے ہیں مگر وہ لاپرواہی کا اظہار کرتا ہے۔ احمد رضا، الوینا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ وہ اکثر گھر جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر الوینا مختلف چلے بہانوں سے اسے روک لیتی ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں طیب خان اور باب حیدر مد ہوشی کی کیفیت میں احمد رضا سے اسماعیل خان کی نبوت کا بیان دلوادیتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس بیان کی تردید کرتا ہے مگر پری اسے سخت سے جھٹلاتا ہے۔

پانچویں قسط

نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لینے لگے۔ ”یہ والا بیڈ روم بابا جان کے لیے صحیح رہے گا۔ واش روم بھی ادھر ہی ہے اور عمو۔ وہ بھلا کہاں الگ روم میں سوئے گی۔ اتنے عرصے بعد تو اپنے بابا جان سے ملی ہے۔ ایک بتا رہا تھا عمو اور بابا جان رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پچھیس سالوں کے دکھ سکھ بھلا ایک رات میں کیسے کہے ہوں گے انہوں نے۔ اس بیڈ پر تمہاری ماما سوئیں گی۔ میں اور آئی۔ ہم بھلا اس کیلئے اپنے اپنے بیڈ روم میں کیا کریں گے۔ ایسا کرو، گیسٹ روم میں وہ جو ایک سنگل بیڈ ہے نا۔ وہ ادھر لگوا دو۔ آئی تو نیچے میٹرز پر سو جائے گا۔“

”جی بابا! ہم مسکرائی۔“ ”اور ہاں سنو! اسٹور سے سنبل والے تکیے نکلاؤ دیے ہیں نا۔ بابا جان تو صرف سنبل کا تکیہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہاں ”الریان“ میں تو صرف سنبل کے تکیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔“ ”جی بابا جان! میں نے تکیے دھوپ میں رکھوا دیے ہیں۔“

”اچھا!“ وہ پھر سے کمرے کو دیکھنے لگے تھے۔ ”بابا جان کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ بے چینی نہ ہو وہ

”سب ٹھیک ہے نا؟“ وہیل چیر کی پشت پر ہاتھ رکھے تھوڑا سا جھکتے ہوئے انجی نے پوچھا تو انہوں نے مڑ کر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور پھر تنقیدی نظروں سے اس ماسٹر بیڈ روم کا جائزہ لینے لگے۔ جس کے عین وسط میں انجی ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

عبدالرحمن شاہ جب بھی بہاول پور آتے ”اسی ماسٹر بیڈ روم میں ٹھہرا کرتے تھے۔ داوا جان نے کبھی انہیں گیسٹ روم میں نہیں ٹھہرایا تھا۔

”جی! انجی!“ انہوں نے پھر زور سے ماسٹر انجی کی طرف دیکھا۔ ”بابا جان جب بھی یہاں آتے داوا جان بھی یہیں منتقل ہو جاتے تھے۔“

”تو عبدالرحمن اتنی دور سے آیا ہے تو میں اسے اکیلے کمرے میں اجنبیوں کی طرح چھوڑ دوں؟“

ان کی اپنی منطق تھی۔ وہ ادھر سوئے تو میں بھی ادھر ہی آ جاؤں اور مزے سے نیچے میٹرز چھا کر سو جاتا۔

پہلے جب سلجوق بابا تھے تو یہاں صرف ایک ڈبل بیڈ ہوتا تھا پھر داوا جان نے ادھر سنگل بیڈ ڈلوایا۔ چھپیں جاتے انجی! یہ سلجوق بابا کا بیڈ روم تھا۔“

ایک گہری سانس لے کر وہ ایک بار پھر تنقیدی

اجنبیت محسوس نہ کریں۔ چھبیس سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ وہ چھبیس سالوں بعد بابا جان سے ملیں گے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بابا جان کے لیے کیا کریں۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ پورے ”مراد پلس“ کو پھولوں سے سجا دیتے۔ صبح سے وہ پورے گھر میں اپنی وہیل چیئر بٹھکاتے پھر رہے تھے اور ہدایات دے رہے تھے۔

فی وی لاؤنج اور سنگ کی ترتیب بدلی تھی۔ مالی کو لان کی صفائی کے لیے کہا تھا، لیکن پھر بھی جیسے دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

رات جو ایک نے بتایا کہ وہ اما اور بابا جان کے ساتھ کل بھاول پور آ رہا ہے تو کتنی ہی دیر تک انہیں یقین نہ آیا۔ وہ فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھے تھے۔ ”بابا! بابا!“ ایک نے بے چین ہو کر بلایا تو وہ چونکے۔ ”ایک! ابھی تم نے کیا کہا تھا، بابا جان بھاول پور آ رہے ہیں؟ کہیں میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا۔ کبھی بھی ہوتا ہے نایاب کہ آدمی وہی دیکھنے اور سننے لگتا ہے جو اس کے دل کی چاہ ہوتی ہے۔“ وہ ہولے سے ہنستے تھے۔

”جی بابا! کل ہمارے ساتھ بابا جان بھی آ رہے ہیں۔“

”اچھا۔ بابا جان آ رہے ہیں۔ وہ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں۔ ناراض تو نہیں ہیں نا؟“ وہ بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔

”نہیں بابا! وہ آپ سے ناراض نہیں ہیں بالکل بھی نہیں۔ ابھی سو رہے ہیں جاگیں گے تو میں آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔“

”نہیں آئی۔ نہیں میں کیا بات کروں گا۔ مجھ سے کوئی بات نہیں ہوئے گی۔ وہ آئیں گے تو میں ہاتھ جوڑ لوں گا۔ پاؤں پکڑ لوں گا۔“ ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”بابا پلیرز ریلیکس!“ دوسری طرف ایک پریشان ہو گیا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔

”تم پریشان مت ہونا ایک۔! اس خیال سے رونا آ گیا کہ اتنے سالوں بعد بابا جان سے ملوں گی۔ انہیں ایک کی آواز سے محسوس ہوا تھا کہ وہ بہت پریشان ہو گیا ہے۔“

”تمہاری ماما کیسی ہیں۔ بات کرواؤ نا۔“

”ماما تو انکل شیر دل کی یکم کے پاس ہیں۔ ابھی آجاتی ہیں تو۔“

اور ایک کو خدا حافظ کہہ کر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے اپنی کرسی کا ہیڈل گھماتے باہر آئے تھے۔

”انجی۔ انجی سنو بیٹا۔“

وہ بچن میں ملازمہ کے ساتھ تھی۔ یکدم باہر نکل آئی۔

”انجی! بابا جان آ رہے ہیں عمو کے ساتھ۔“ انجیم بھی یکدم خوش ہو گئی تھی۔ وہ پہلی بار بابا جان کو دیکھے گی۔ یہ احساس ہی خوش کر دینے والا تھا۔

”کل صبح کسی وقت کی فلائٹ ہے۔ سوا انجی! ذرا ایک کو فون تو کرو۔ کل ہی کہا تھا نا اس نے۔“ وہ پھر سے بے یقین سے ہونے لگے تھے۔

”جی۔ جی جی میں ابھی فون کر کے ساری تفصیل پوچھ لیتی ہوں۔“ وہ بھی رجوش ہو رہی تھی۔

اور جب ایک سے بات کر کے وہ انہیں فلائٹ کا ٹائم بتا رہی تھی تو ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انہوں نے انجی کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا انجی! کہ بابا جان آ رہے ہیں۔ جب میں ان سے ملوں گا انہیں دیکھوں گا تو میں یہی۔“

”گیا تھا، لیکن پوری رات وہ بے چین ہی رہے تھے۔ ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ بیٹے ہوئے ماہو سال واپس لے آئیں اور ان سالوں میں سے اس ظالم دن کو مینوں اور سالوں کے اس گوشوارے سے نکال دیں۔“

رات یونہی بے چینی سے سوتے جاگتے گزری تھی اور صبح فجر کی نماز کے بعد ہی وہ باہر آگئے تھے اور نوکروں کو ہدایات دینے لگے تھے۔

”بابا! آپ کی چائے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ بنا لاؤں؟“ انجی نے پوچھا۔

”ہاں۔! ان کی نظریں سامنے دو بار پر لگے کلاک کی طرف اٹھیں۔ دس بج رہے تھے۔ آج وقت کتنی اچانکی سے گزر رہا تھا۔

”آپ اپنے بیڈ روم میں جائیں گے یا ابھی ادھر لاؤنج میں ہی بیٹھیں گے۔“

”میں ابھی ادھر ہی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی تو انہوں نے اسے آواز دی۔

”سنو بیٹا! بابا جان کے لیے پرہیزی کھانا بنے گا۔ ایک سے پوچھ لو نا ڈاکٹر نے کیا کہا ہے کھانے کو۔“ وہ

مرچیں کم کھاتے ہیں۔ ”کریان“ میں سب ہی زیادہ مرچیں نہیں کھاتے تھے لیکن جب میں اور شالی باہر جاتے تو خوب کرارے کھانے کھاتے ضرور دست مرچ

مسالے والے۔ شالی کتنا تھا کہ کچھ ڈشز ایسی ہوتی ہیں جب تک تیکھی نہ ہوں، مرزا نہیں آتا اور گھر میں بھی جب کرنا ہی وغیرہ ہوتی تو وہ خاص طور پر بچن میں جا کر یاد

دہائی کروانا کہ مرچ ذرا تیز ہی ہونا چاہیے۔“ وہ ذرا سا مسکرائے تھے۔ انجی بچن کی طرف بڑھ گئی تھی اور انہوں نے کرسی کے ہیڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔

تب ہی ان کی نظر باسٹریڈ روم کی کھلی کھڑکی پر پڑی گی۔ شاید انجی نے کمرائٹ کرتے ہوئے کھولی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک بے دھیانی سے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ بیڈ روم کے اندر کا کچھ حصہ کھلی کھڑکی سے نظر آ رہا تھا اور جو حصہ نظر آ رہا تھا وہاں ایک آرام

کر سی پڑی تھی۔ کئی بار انہوں نے کھلی کھڑکی سے سلجوق بابا کو کرسی پر بیٹھے موٹی موٹی کتابیں پڑھتے دیکھا تھا۔

سلجوق بابا بہت کم بات کرتے تھے۔ بہت کم بولتے تھے اور جب کبھی یہ کھڑکی کھلی ہوتی تو وہ جیکے جیکے کھڑکی سے انہیں دیکھتے تھے۔ وہ انہیں بہت اچھے لگتے تھے۔

بہت مہربان بہت شفیق۔ کمانیوں کے رحم دل شہزادوں جیسے۔

اس روز وہ آنکھیں موندے آرام کر سی کی پشت پر سر رکھے لیٹے تھے جب وہ کھڑکی کے بالکل قریب چلے گئے تھے اور بہت غور سے انہیں دیکھ رہے تھے جب

اچانک انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے تھے۔ دادا جان نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ سلجوق بابا کو بالکل تنگ نہیں کرنا ہے۔ تنگ کرو گے تو وہ

زیادہ بیمار ہو جائیں گے۔ اور انہیں یاد تھا سال ڈیڑھ سال پہلے کی ہی تو بات تھی جب وہ ان کے پاس سوئے کی ضد کرنے لگے

تھے تب سلجوق بابا ان کے ضد کرنے پر انہیں پاس سلائے لگے تھے اور سوئے سے پہلے وہ اسے ضرور کوئی

چھوٹی سی کمانی سناتے تھے۔ کمانیاں تو دادی جان بھی سناتی تھیں، لیکن انہیں اپنے بابا سے کمانی سننا زیادہ اچھا لگتا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یا کبھی

اپنے اوپر رکھ کر سونا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ اور ایک روز بابا سے کمانی سننے سننے انہوں نے پوچھ لیا تھا۔

”بابا! میری ماما کہاں ہیں۔ کیا وہ اسد کی ماما کی طرح فوت ہو گئی ہیں؟“

اور سلجوق حیرت سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔ انہیں خاموش دیکھ کر انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی ماموت ہو گئی ہیں۔ تب انہوں نے بابا کا ہاتھ پکڑ کر کہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”تو آپ ایک اور ممالے آئیں نامیرے لیے۔ پتا ہے اسد کے پپا اس کے لیے نی ممالے آئے ہیں۔ بہت پیاری سی۔ جب میری ماما آجائیں گی نا تو میں

بیوقوفی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



﴿ اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم ﴾

﴿ گر تے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ﴾

﴿ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے ﴾

قیمت - 75/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر ادائیگی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں - 200/- روپے

تین بوتلیں - 275/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

یونی کس 53، اورنگزیب مارکٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دفتر خریدنے کے لیے:

مکتبہ عراق ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32216361

تھے تو ان کے دل سے ہزاروں دوسوے لپٹے ہوئے
تھے ماہ کی وہ گفتگو اس کالب و لوجہ اس کا اندازہ
آخر وہ کیا کر سکتی ہے رحیم یار خان سے لاہور تک وہ
صرف یہی سوچتے رہے تھے اور کچھ سمجھ نہیں پائے
تھے جب وہ شیردل کے پاس آگئے تھے۔

شیردل کے علاوہ الریان میں انہیں کوئی ایسا شخص
دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتے۔
شمالی ان کے بہت قریب تھا، لیکن وہ شامی سے یہ
بات نہیں کہہ سکتے تھے، وہ ہرٹ ہو سکتا تھا۔ وہ ماہ
سے اتنی محبت کرتا تھا کہ شاید وہ ان کی بات کا یقین ہی
نہ کرتا، پھر مصطفیٰ بھائی تھے، لیکن مصطفیٰ سے کچھ بھی
کہنے میں انہیں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ کیا پتا، وہ
سوچیں کہ ضرور ان کی طرف سے ہی کچھ حوصلہ افزائی
ہوئی ہوگی تب ہی ماہ اس طرح کر رہی ہے۔

حق تو اوستھا ان کا دوست، لیکن وہ بہت جذباتی تھا۔
وہ ساری بات سن کر یقیناً "ماہ" کے گھر جا پہنچا اور اس
کے والدین سے کہتا کہ بیٹی کو سنبھال کر رہیں۔ لے
دے کہ ان کی نظر شیردل پر ہی ٹھہری تھی۔ وہ بہت
سمجھ دار، بہت بردبار تھے ان بیٹے دنوں میں شیردل کے
ساتھ ان کی دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ سوانہوں
نے شیردل سے ہر بات کہہ دی۔ پہلی ملاقات سے لے
کر اس آخری رحیم یار خان والی ملاقات تک۔
اور شیردل ہنس دیا تھا۔

"تم یونسی ڈر رہے ہو یا راپہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی
ہیں۔ فضول ڈانٹنا لگ بازی۔ وہ بھلا تمہارا کیا لگاؤ
سکتی ہے۔ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ چند ماہ بعد رخصتی
ہو جائے گی اور پھر سب محبت و محبت ختم۔"
شیردل نے اس ساری بات کو بہت معمولی سمجھا تھا اور
وہ جو ساری رات جاگتے رہے تھے مطمئن سے ہو گئے
تھے اور پھر واقعی کچھ نہیں ہوا تھا وہ عمارہ کو رخصت
کروا کے گھر لے آئے تھے۔ اس روز کے بعد ان کی
ماہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں احسان شاہ
سے وہ اس کے متعلق سنتے رہتے تھے۔

"ماہ ایسی ہے۔ ماہ وہی ہے۔ یار! مجھے لگتا ہے

خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔

"بابا! چائے!" انجی نے اندر آکر کہا تو انہوں نے
چونک کر انجی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ
تھا۔ وہ بھی عمارہ کی طرح بھی نہیں بھولتی تھی کہ وہ
اس وقت چائے پیتے ہیں۔

"تھینک یو پیٹا!" چائے کا کپ تھامتے ہوئے وہ
مسکرا دیے۔
"بابا! میں کچن میں ہوں۔ بلا لیجیے گا جب کمرے میں
جانا ہو۔"

انہوں نے سر ہلادیا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ اور سنو،
انجی نگرانی میں سب تیار کروانا۔ اور ہاں جواد کو تم نے
فلائٹ کا ٹائم نوٹ کر لیا تھا۔"

"جی بابا!"
"اسے ایک بار پھر یاد کروانا کہیں کام کی مصروفیت
میں بھول ہی نہ جائے۔" انہوں نے ایک بار پھر تاکید کی
انجی سر ہل کر ہر حال میں گئی۔ چائے پیتے ہوئے وہ ایک بار
پھر ماضی میں کھو گئے تھے۔

☆☆☆

زندگی ان پر بہت مہربان تھی۔ دادا جان اور دادی
جان کی شفقتیں، بابا جان اور "الریان" کے بایسوں کی
مختص چاہتیں اور پھر عمارہ کی ہمراہی میں کلکتا زندگی کا
سفر۔

اس سے زیادہ بھلا آدمی کیا چاہ کر سکتا ہے۔ اور
انہیں اس سے زیادہ کی چاہ تھی بھی نہیں۔ وہ بہت
خوش بہت مطمئن تھے۔

ہاں کبھی کبھی انہیں ماہ کا خیال آتا تو وہ لمحہ بھر کے
لیے الجھ ضرور جاتے تھے۔ اس نے کہا تھا وہ انجی تو بچپن
نہیں بھولتی۔ کبھی بھی نہیں۔ تو وہ کیا کرے گی کہا انجی
تو بچپن کا بدلہ لے گی، لیکن کس طرح۔ یہ وہ سمجھ نہیں
پارے تھے اور عمارہ کی خوش کن رفاقت زیادہ دیر کے
لیے انہیں کچھ سوچنے بھی نہیں دیتی تھی۔

اس رات جب وہ رحیم یار خان سے واپس آئے

ان سے کہانیاں سنوں گا اور وہ مجھ سے بہت پیار کریں
گی۔

"کیا دادی جان کہانی نہیں سناتیں؟" سلجوق بہت
سنجیدہ تھے۔

"سناتی ہیں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"اور وہ آپ سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آپ کی ماما
سے بہت زیادہ۔ اگر آپ کی ماما ہوئیں تو وہ آپ سے
انتا پیار نہیں کرتیں جتنا دادی جان کرتی ہیں۔"
"ہاں دادی جان پیار تو بہت کرتی ہیں۔" وہ الجھ کر
انہیں دیکھنے لگے تھے، لیکن وہ تو دادی جان ہیں نا اور ماما
تو ماما ہوتی ہیں۔

اور تب سلجوق بالکل چپ ہو گئے تھے اور وہ ان کے
بولنے کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ صبح سلجوق بابا
کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ دادا جان انہیں اسپتال
لے گئے تھے۔ پھر کئی دن اسپتال رہنے کے بعد دادا جان
انہیں انگلینڈ لے گئے تھے اور کتنے ٹھوڑے دن وہ ان
کے پاس سوئے تھے۔

دادا جان کی بات یاد کر کے وہ کھڑکی کے قریب سے
بہٹ گئے تھے، لیکن سلجوق بابا نے انہیں بلالیا تھا۔ وہ
انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے پھر اس روز سلجوق بابا نے
ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ انہوں نے کہا
تھا۔

"شاید میں بہت سارے دن آپ کے ساتھ نہ
رہوں آپ میری باتوں کو یاد رکھنا بیٹا! ابھی شاید آپ
میری باتوں کو نہ سمجھ سکیں، لیکن ایک وقت آئے گا
جب آپ ان کو سمجھ سکیں گے۔ انی ماما کو معاف
کر دینا بیٹا! ہو سکتا ہے کبھی آپ کو لگے کہ انہوں نے
آپ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تب بھی۔۔۔ وہ آپ
کی مال ہیں۔ انہوں نے آپ کو جنم دیا۔ تکلیف
اٹھائی۔ اس تکلیف کا حق تو آپ بھی ادا نہیں
کر سکتے۔"

اور وہ یونسی نا سمجھی سے انہیں دیکھتے رہے تھے جو
بات وہ سمجھ سکے تھے وہ یہ تھی کہ بابا کہیں جارہے ہیں وہ

جس روز میری ماہ سے بات نہیں ہوگی۔ وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

اور وہ حیرت سے احسان شاہ کو دیکھتے رہ جاتے تھے۔
”مثالی! تم اتنا زیادہ چاہتے ہو ماہ کو؟“

”اس سے بھی زیادہ جتنا تم سوچ سکتے ہو۔“
”اللہ کرے“ وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہے جتنا تم

چاہتے ہو اسے۔“ بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

”وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے یا! تم خواہ مخواہ اس کے متعلق مشکوک نہ ہو اکر۔“

”نہیں میں مشکوک تو نہیں ہوا بس تمہیں دعا دے رہا تھا۔“

”ہاں بس دعائیں دیتے رہا کرو۔“ احسان نے تھوڑا سا سرخم کیا تھا۔

ان دنوں وہ بے حد شوخ ہو رہا تھا۔ اس نے رحیم یار خان کے بھی دو تین چکر لگائے تھے، لیکن ہر بار ہی

انہوں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وہاں نہیں جانا چاہتے تھے اور نہ ہی ماہ کا سامنا کرنا

چاہتے تھے۔ سو ہمان بنادیتے اور پھر احسان شاہ اور ماہ کی کشتی کے بعد وہ اور بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ اور

احسان شاہ جو دو سال کے لیے باہر جا رہا تھا، کشتی کے بعد اس نے باہر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ باباجان کو

قائل کرنے کے لیے اس کے پاس بہت سے دلائل تھے۔

”مرتنضی بھائی اور عثمان بھائی باہر ہی میٹھل ہو گئے ہیں۔ مصطفیٰ بھائی باہر جانے کے لیے پرتل رہے

ہیں۔ عمارہ کی شادی ہو گئی ہے۔ کچھ دنوں تک زارا بھی رخصت ہو جائے گی۔ میں بھی چلا گیا تو ”الریان“

توہیران ہو جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے احسان شاہ! ایسی باتیں کرتے ہو۔“

اماں جان لرز گئی تھیں۔
”اللہ ہمارے ”الریان“ کو آباد رکھے۔ تم سب ہنستے رہو۔“

چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ مجھے یہاں بہت اچھی جا رہی ہے۔ آپ باباجان سے کہہ کر میرا جانا منسوخ کر دیں۔ میں بڑھائی سے نہیں بھاگ رہا املا جان۔ بس مصطفیٰ بھائی یا عثمان بھائی یہاں آکر رہیں گے جب تو میں چلا جاؤں گا پڑھنے، لیکن فی الحال نہیں۔“

احسان بھائیوں میں سے سب سے چھوٹا تھا اور اماں جان کا لاڈلا بھی۔ اماں جان نے باباجان کو قائل کر لیا کہ فی الحال وہ احسان کو باہر نہ بھیجیں۔ انہیں بتا چلا تو حیرت ہوئی۔

”یار! تمہیں اس کا رشب مل رہا تھا۔ ایم ایس سی کی ڈگری کی تو اور سی بات ہوئی ہے۔ زیادہ اچھی جا رہی جاتی۔“

”ہاں وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں دو سال کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ دو سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ دو سالوں میں جانے کیا ہو جائے گا۔“

”کیوں کیا تمہیں ماہ پر اعتبار نہیں ہے؟ کیا وہ تمہارا انتظار نہیں کرے گی؟“

”ماہ پر تو مجھے خود سے زیادہ اعتبار ہے ایک! لیکن اس کے والدین انہیں بہت جلدی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اس کی عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر کے اسے ساتھ ہی لے جاؤں۔ اول تو ایسا اتنی جلدی ممکن نہیں ہے اور پھر باباجان بھی اس کے حق

میں نہیں ہیں۔ اور نہ ہی باباجان یہ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر کے اسے چھوڑ جاؤں۔ تمہیں نے یہیں جا کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

اور وہ جو باباجان کے کہنے پر اسے سمجھانا چاہتے تھے خاموش ہو گئے تھے۔ عمارہ کو بھی اس کا اس کا رشب

چھوڑ دینے کا افسوس تھا۔ مصطفیٰ نے بھی اپنے طور پر سمجھایا تھا، لیکن احسان نے باب شروع کر دی تھی۔

یوں وہ پہلے جیسی ملاقات تو نہیں رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ہر شام الریان باقاعدگی سے جاتے تھے اور پھر عمارہ کو لے کر کھڑے آ جاتے تھے۔

انہوں نے باباجان کے کہنے پر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کیا تھا، لیکن وہ خود کم ہی۔ آفس جاتے تھے ان کا زیادہ وقت تو پارٹی کے دفتر میں گزرتا تھا۔ بیٹے

سلاوں میں انہوں نے اپنی پارٹی میں جگہ بنالی تھی اور وہ کافی مقبول اسٹوڈنٹ لیڈر کے نام سے پہچانے جاتے تھے، لیکن ”الریان“ میں کوئی بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ یو ای پی میں تھے تو

احسان انہیں روکتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں آئے تو احسان سے انہوں نے سب کچھ چھپایا۔ اس لیے کہ باباجان کو یہ پسند نہ تھا، لیکن وہ سمجھتے تھے کہ نوجوانوں کو ملک کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ملک جو سیاست دانوں کی وجہ سے دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔

”اقتدار کے لالچ نے ملک کو دو ٹکڑت کیا تھا۔“ یہ بات سرالطاف نے سیلوں پر کہی تھی۔

جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، لیکن اب بھی کسی نے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والے سارے وعدہ بھول گئے تھے۔ ملک میں تعجب افزا تقرری مچی تھی۔

حق نواز ان دنوں بہت چڑچڑا ہو رہا تھا اور اس کی وجہ اس کی ایک صحافی دوست کا اغوا تھا۔ الفلاح بلڈنگ کے سامنے وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی کہ ایک سفید کروڑا دہاں آکر رکی۔ اس میں سے دو تین بندے نکلے اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔ اس پاس کھڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اسے چھڑانے کے لیے نہیں

بڑھا تھا۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوئی ہے۔ حق نواز نے بتایا تھا کہ اہم شخصیت نے اسے شادی کی پیش کش کی تھی۔ انکار کا یہ نتیجہ نکلا تھا۔ لاہور میں عجیب صورت حال تھی۔ بھٹیڑے

گڑبڑ کا لباس پہنے تھے اور زندگیاں اور عزتیں محفوظ نہ تھیں۔

حق نواز اپنی پارٹی کے ایک ایک کارکن کے پاس گیا تھا۔ پارٹی لیڈر سے بات کی تھی۔ وہ اس اغوا کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ پارٹی لیڈر ساتھ

دیں۔ ربلی نکالیں اور اسے اس صاحب اقتدار شخص کے بچے سے چھڑالیں، لیکن پارٹی لیڈروں نے انکار کر دیا تھا۔

”اس وقت اور بہت سے مسائل ہیں جن پر ہمیں توجہ دینی ہے۔ ایک معمولی بات کے لیے ہم ہنگامے نہیں کر سکتے تھے۔“

”وہ ایک معمولی لڑکی تھی۔ تین یتیم بہنوں اور یہ وہ ماں کا واحد سارا۔“

حق نواز بہت مایوس اور اپ سیٹ تھا اور اسے پارٹی سے بہت سی شکایتیں تھیں۔

”ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہمارے ساتھی سڑکوں پر لوہا بن ہوئے۔ اپنے سینے پر گولیاں کھائیں، لیکن یہ ہمیں اتنا سا تحفظ بھی نہیں دے سکتے۔ ہم تو اپنے وطن کے لیے اپنی قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ لے کر آئے تھے فلک! لیکن لگتا ہے کہ یہ سب صرف

اپنے فائدے کے لیے ہمیں چارہ بنارہے ہیں۔“

”ہم کچھ نہ کچھ تو کر رہے ہیں حق نواز! جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے۔“

”ہم کچھ بھی نہیں کر رہے فلک شاہ! ہم صرف اٹو بن رہے ہیں۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ جگہ دیش نے تناؤ وقت گزر گیا، لیکن ہم نے سوائے لکیر سینے کے کچھ نہیں کیا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری پارٹی کوئی مثبت کام نہیں کر رہی؟“

”پتا نہیں یا! اس روز حق نواز کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ پارٹی چھوڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ایک پارٹی ممبر سے تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی۔ اپنی صحافی دوست کا وہ اس کے دل میں گڑ گیا تھا۔

”اس سے تو اچھا تھا، ہم ہر سراقہ پارٹی میں ہوتے تو کم از کم عمارہ کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے اس کی چھوٹی بہنوں اور ماں کی کیا حالت ہے۔ اس پر رشتہ داروں کا رویہ انہیں مار رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی زندہ درگور ہو گئے ہیں۔ کاش! میں ان کے لیے کچھ کر سکتا۔“

وہ اسے بہت ساری تسلیاں دے کر آگے تھے کہ انہیں عمارہ کو لے کر بہاول پور جانا تھا۔ داوی جان کی خواہش تھی کہ عمارہ کا کچھ بہاول پور میں ہی جمنے لے۔ وہاں جاتے ہی عمارہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہیں اسپتال میں فوری طور پر ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ وہ بہت سارے دن حق نواز سے رابطہ نہیں کر سکے تھے۔ پہلے عمارہ کی پریشانی پھر ایک کی آمد۔ ”اگر یان“ سے سب ہی ”مراویس“ آئے تھے۔

اور ان بے پناہ مصروف دنوں میں انہیں حق نواز کا فون ملا تھا۔ ”میں نے پارٹی کی رکنیت چھوڑ دی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ٹھیک ہے، جیسے تم کہو گے حق نواز میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے تو ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا ہے۔ پارٹی کوئی سی بھی ہو۔“

”سوچ لو یار! لوگ ایسے بندوں کو ”لوٹا“ کہتے ہیں۔“

اور وہ ہنس دیے تھے۔ انہوں نے حق نواز سے زیادہ بات نہیں کی تھی کہ مصروفیت ہی بے پناہ تھی۔ ”اگر یان“ والوں کی آمد نے ”مراویس“ میں رونقیں بکھرا دی تھیں۔ دادا جان اڑے اڑے پھرتے تھے۔ داوی جان ہر وقت ایک کونڈوں میں لیے بیٹھی رہتی تھیں۔

”ارے یہ تو پورا کابورا سلجوق ہے۔ شاہ صاحب دیکھیں ٹاس کی آنکھیں ٹاس کے ہونٹ ٹانگ۔ ہے تابنا بنایا سلجوق سیاد ہے ناجب سلجوق اتنا تھا تو۔“

داوی جان دن میں نہ جانے کتنی بار اس بات کو دہراتی تھیں۔

سب کو ہی ایک بہت پراچا تھا۔ زارا تو اس کے پاس سے ہٹنے کو تیار ہی نہ ہوتی تھی۔ اس نے تو واپس لاہور جانے سے انکار ہی کر دیا تھا۔

”تمہاری پڑھائی کا حرج ہو گا یا؟“ بیا جان نے اسے سمجھا یا تھا۔

”کوئی حرج وجہ نہیں ہوتا۔ میں کور کر لوں گی۔ اور

جب تک اماں جان ہیں۔ میں بھی یہاں ہی رہوں گی۔“

اور یوں زارا کو چھوڑ کر سب واپس لاہور چلے گئے تھے۔ داوی جان نے انہیں بھی روک لیا تھا۔ حق نواز سے پھر ان کی بات نہ ہو سکی تھی۔ البتہ اخبار میں انہوں نے اپنی اور حق نواز کی پارٹی چھوڑنے کی چھوٹی سی خبر دیکھی تھی۔

زارا اور اماں جان کو وہ لاہور چھوڑنے آئے تو ان کا ارادہ حق نواز کی طرف جانے کا تھا لیکن بہاول پور سے دادا جان کا فون آگیا تھا۔ داوی جان کی طبیعت خراب تھی اور وہ انہیں واپس بلا رہے تھے اور پھر دادی جان پندرہ دن بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئیں۔

یہ ایسا حادثہ تھا کہ وہ سب کچھ بھول بیٹھے تھے۔ داوی جان صرف داوی جان تو نہ تھیں۔ وہ ان کے لیے ماما سے بڑھ کر تھیں۔ ابھی ایک ایک ماہ کا بھی نہ ہوا تھا اور وہ چل دی تھیں۔ لاہور سے شالی بہت دن آکر ان کے پاس رہا تھا۔ انہیں سنبھلنے میں وقت لگا تھا، لیکن وہ سنبھل گئے تھے۔ دادا جان تھے انہیں تسلی دینے اور سنبھالنے کو۔

”سب کو ایک دن جانا ہے۔ ہمارا وقت تو پورا ہو چکا فلک! کون جانے کب میرا بھی بلاوا آجائے۔ تمہیں سمجھ داری سے کام لینا ہے۔“

”لیکن کچھ دن تو دادا جان! کچھ دن تو دادی جان زندہ رہیں۔ ایک کے لیے۔“ وہ کتنی خوش تھیں نا ایک کی پیدائش پر۔

وہ ان کی گود میں سر رکھ لیٹے تھے اور ان کے آنسو دادا جان کے گھٹنوں پر گر رہے تھے۔

”وقت پورا ہو گیا تھا یا! جانا تو تھا ہی۔“

دادا جان نے اس روز ان سے بہت باتیں کی تھیں اور بہاول پور میں ان کے قیام کے دوران بہت سارے معاملات سے باخبر کیا تھا۔ جن سے وہ پہلے بے خبر تھے۔ زمینوں کے معاملات، بینک کے معاملات وہ سب کچھ ان کے نام کر رہے تھے۔

”آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں دادا جان!“

وہ الجھتے تھے، لیکن بہاول پور ٹھہر کر انہوں نے وہ سب جانا سمجھا اور کیا جو دادا جان چاہتے تھے۔ ایک جب جین ماہ کا ہوا تب وہ لاہور آئے تھے۔ نئی پارٹی میں ان کا بیرونی خیر مقدم ہوا تھا۔ حق نواز انہیں کچھ خاموش اور کمزور سا لگتا تھا۔

”حق نواز! تم ٹھیک تو ہونا۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں۔“

”ہاں سب ٹھیک ہیں۔ سوری یار! شیر دل نے تمہاری داوی جان کا بتایا تھا انہیں۔ کلا۔ اس روز بہن کی بات تھی۔“

”کوئی بات نہیں یار! تم بہت اعلیٰ کا کچھ پتا چلا؟“

”ہوں۔“

”چلو پارٹی چھوڑنے کا کچھ فائدہ تو ہوا۔“

”پتا نہیں فائدہ ہوا یا نقصان لیکن جس روز میں نے پارٹی، جوان کی اس سے اگلے روز صبح اس کی لاش مل گئی۔ اس کے گھر کی عقبی گلی سے۔“

اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ حق نواز سے کیا کہیں۔ حق نواز نے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں کی تھی اور خود بھی خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن رات جب وہ سر الطاف کے پاس گئے تھے تو وہ خود کو اس موضوع پر بات کرنے سے نہ روک سکے تھے۔ انہیں عابدہ کی موت کا زبرد کھ ہوا تھا۔

عابدہ اور حق نواز کے درمیان کوئی محبت کا رشتہ نہ تھا، لیکن حق نواز نے اس کے اغوا اور پھر اس کی موت کا بہت اثر لیا تھا۔ اس نے کتنی ہی بار ایک سے کہا تھا کہ اگر عابدہ مل جاتی ہے تو وہ فوراً اس سے شادی کر لے گا۔

ایک عورت کو ہرپ کرنے کے لیے بہت سے بھیڑیے منہ پھاڑے منتظر ہوتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ کب اسے اپنے خونی پنجوں میں دالیں۔ اگر عابدہ کی پشت پر کوئی مرد ہوتا تو اسے اتنی آسانی سے اغوا نہ کیا جاسکتا اور اب اس واقعہ کے بعد تو اسے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ ہمارا معاشرہ ایسا ہی تو ہے۔ عورت کو ہم اکثر بغیر قصور کے ہی مجرم گردان لیتے ہیں

اور پھر ساری زندگی اسے سزا دیتے رہتے ہیں۔ ان کے دل پر بہت بوجھ تھا اور انہوں نے سر الطاف سے دل کی ہر بات کہہ دی تھی۔ انہیں پارٹی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ وہ اپوزیشن میں رہ کر ہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔

”حکمران پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد ان کی کمزوریوں اور خامیوں پر انگلی اٹھانا مشکل ہو جائے گا اور پھر لوگ بھی انہیں ان کی غلطیوں اور کمزوریوں میں شریک سمجھیں گے۔“

”تم کس بات سے ڈرتے ہو فلک شاہ!“ سر الطاف مسکرائے تھے۔ ”ان پر انگلی اٹھانے سے یا خود پر انگلی اٹھنے سے؟“

”شاید دونوں باتوں سے۔“ ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

اور سر الطاف کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ جلسوں اور جلسوں میں وہ جس گھن گرج کے ساتھ ان کی کمزوریوں اور کرپشن پر بولتے تھے۔ کیا اب ان میں شامل ہو کر وہ اس طرح اتنے ہی جوش و جذبے کے ساتھ بول سکیں گے؟

انہوں نے سوچتے ہوئے سر الطاف کی طرف دیکھا تھا۔

”انسان کو نڈر اور بے باک ہونا چاہیے فلک شاہ! میں سمجھتا ہوں اگر تمہاری نیت نیک ہے تو تم مخلص ہو تو تمہاری کے اندر رہ کر زیادہ قریب سے انہیں جان سکو گے۔ اگر تمہیں کچھ غلط لگتا ہے تو روک سکو گے۔ سمجھا سکو گے۔ اس طرح تمہارا کردار زیادہ مؤثر ہو جائے گا۔“ سر الطاف نے سمجھا یا تھا۔

”شاید آپ صحیح کہتے ہیں سر! لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہم نے کچھ غلط کیا ہے۔ مجھے پارٹی کی کئی باتوں سے اختلاف ہے۔ لازمی بات ہے حق نواز کو بھی ہو گا۔ حق نواز نے صرف عابدہ کے لیے۔“

”جانتا ہوں، لیکن اب اپنی بات نبھاؤ۔ روز روز پارٹیاں بدلتی جا رہی ہیں۔“

سر الطاف خود کسی پارٹی کے رکن نہ تھے لیکن

نوجوان طلباء میں بے حد مقبول تھے۔ حق بات کہتے ہوئے ذرآنہ جھجکتے تھے۔ کئی احتجاجی جلوسوں میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ وہ سرافطاف کے پاس سے اٹھے تو کچھ مطمئن تھے، لیکن لاہور میں اس بار ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ عمارہ کو وہ ہماول پور ہی چھوڑ آئے تھے۔ واوا جان ان کے ساتھ آنے کو تیار نہ تھے اور واوی جان کے بعد وہ انہیں اکیلا چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ سو عمارہ ہماول پور میں ہی تھیں۔ ان کا کچھ وقت تو ”الریان“ میں اور کچھ اپنے دفتر میں گزر جاتا تھا۔ ان دنوں انہوں نے بہت سارے پھوڑے ہوئے کام بنائے تھے۔

کبھی کبھار وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی کے دفتری سر الطاف کی طرف چلے جاتے تھے۔ حق نواز ایسا ہی تھا خاموش اور افسردہ۔ جانے کن سوچوں میں گم رہتا تھا۔ ”الریان“ کی خاموشی سے گھبرا کر اہل جان نے احسان شاہ کی شادی کا پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا۔ وہ عمارہ کو ہماول پور سے لے آئے تھے۔ واوا جان کو بھی زبردستی ساتھ لے آئے تھے۔ نا بھابھی اور راحت بھابھی بھی انکی تھیں۔ احسان شاہ رجم بار خان جا کر مروہ پھو کو بھی لے آئے تھے۔ الریان میں ایک بار پھر روٹنیں اتر آئی تھیں۔ رات گئے تک ڈھولک بجائی جاتی۔ مصطفیٰ، مرضی اور عثمان کو شادی سے چند دن پہلے آنا تھا اور بے حد مطمئن تھے وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن حق نواز کو حکمرانوں کے بہت سے کاموں پر اعتراض ہوئے لگا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ قوم سے جو وعدے کیے گئے تھے وہ پورے کیے جائیں نہ کہ خود بھی کرپشن اور عیش و عشرت میں مصروف ہو جائیں۔ اس نے جاب بھی چھوڑ دی تھی۔ ”یہ جاب مجھے کسی اور کا حق مار کر دی گئی تھی۔ ایسی جاب سے بہتر ہے کہ میں بھوکا مر جاؤں۔“ پارٹی کے جن افراد سے ان کا واسطہ پڑتا تھا۔ وہ اس پر ہنستے تھے اور اس کے خیالات کا مذاق اڑاتے تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ کسی روز میرے دل کی رگیں پھٹ جائیں گی۔“ وہ اکثر کہتا تھا۔ ”انسان جب بے بس ہو اور کچھ نہ کر سکے تو اسے کیا کرنا چاہیے فلک شاہ!“ ”سمجھو گا!“ انہوں نے کہا تھا۔ ”نہیں۔ اسے مر جانا چاہیے۔“ ”فضول باتیں مت کرو حق نواز!“ اس کی باتوں سے آپ سیٹ ہو کر وہ گھر آئے تھے۔ احسان رجم بار خان جانے کے لیے تیار نہ تھا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ ”خیریت؟“ ڈاراکا کی گود سے ایک کو لیتے ہوئے انہوں نے ایک کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تھے۔ ”رجم بار خان جانے کے لیے۔“ ”کیا میرا جانا ضروری ہے احسان؟“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوئے تھے۔

”ہاں۔“ احسان شاہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”یار! اب ایک بار ہی جانا دو واپس آئے۔“ ”خیال تو میرا بھی یہی تھا، لیکن اب بیلا جان کا حکم ہے کہ مروہ پھو کے ساتھ جاؤں۔“ ”کیوں مروہ پھو واپس جا رہی ہیں؟“ ”ہاں۔ انکل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے تو بیلا جان نے مناسب سمجھا کہ انہیں بھجوا دیں۔ ابھی شادی میں تو دن ہیں پھر آجائیں گی۔“ ”اور تمہارے دل میں لٹو پھوٹ پڑے ہوں گے کہ اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔“ ایک کو ڈاراکا کے حوالے کرتے ہوئے وہ مسکرائے تھے۔

”ہاں یار۔! جب سے شادی کی ڈیٹ طے ہوئی ہے۔ محترمہ بات بھی نہیں کر رہی ہیں۔ بقول ان کے وہ ان دنوں اپنی امی جان کے کمرے میں ہوتی ہیں اس لیے فون نہیں کر سکتیں۔ سو تم ساتھ ہو گے تو کسی بہانے ملاقات ہو جائے۔“ ”یہ کام تو مروہ پھو بھی کر سکتی ہیں۔“ وہ جھک کر جوتوں کے کسے کھولنے لگے تھے۔

”ارے مروہ پھو نے تو وہاں جاتے ہی آنکھیں پھیر لیتی ہیں۔ کئی سرالہ بن گئی ہیں۔ کیا تو تھا مفتی کے بعد ایک بار ڈراؤ جھلک بھی دیکھنے دی ہو مانہ کی۔ اور تم فوراً اٹھ جاؤ۔ لیسز بند کرو۔ عمارہ کو بتاؤ اور چلو۔ پھو تیار ہوں گی۔ ایک روز تم نے حق نواز اور خوارپوں کے درشن نہ کیے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

انہوں نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو ایک کہ مجھے تمہاری سرگرمیوں کا علم نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم سے بھی ڈسکس نہیں کیا ورنہ سب جانتا ہوں۔ حالانکہ مجھے اب بھی پسند نہیں ہے تمہارا ان سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور حق نواز جیسے لوگوں سے دوستی رکھنا۔“

”حق نواز بہت پارا بندہ ہے شانی! اس جیسے لوگ ٹاپا ہیں۔ اس کا دل اتنا خوبصورت ہے اتنا شفاف کا کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں وہ اس اتنی ظالم دنیا میں اب تک زندہ کیسے ہے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ احسان شاہ کو انکار نہیں کر سکتے تھے حالانکہ ان کا رجم بار خان جانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ماڑہ کا ہرگز سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آج بہت سارے دنوں بعد مانہ کے خیال سے وہ مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔ لیکن پھر شیر دل کی بات یاد کر کے وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے احسان شاہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

”اب تک تو مانہ کے دل سے ان کا خیال نکل بھی چکا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہو تا تو وہ احسان شاہ کو اپنی محبتوں کا تین نہ دلاتی۔“ ”پھو انہیں دیکھ کر مطمئن ہوئی تھیں۔“ ”یہ اچھا ہوا کہ تم بھی ساتھ چل رہے ہو۔ میں بہت پریشان تھی۔“ ”آپ پریشان نہ ہوں پھو! ان شاء اللہ انکل

ٹھیک ہو جائیں گے۔“ احسان شاہ نے انہیں تسلی دی تھی۔ وہ پھو کی بات پر حیران تو ہوئے تھے کہ آخر ان کے ساتھ جانے سے پھو کی پریشانی کیسے دور ہو گئی! لیکن پھر انہوں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا، لیکن جب راستے میں ایک جگہ احسان شاہ گاڑی روک کر کچھ کھانے پینے کے لیے لینے ایک ہوٹل میں گئے تو پھو کی بات سن کر وہ ششدر رہ گئے تھے۔

”میں بہت پریشان ہوں مروی! اس لڑکی نے تو مصیبت کھڑی کر دی ہے میرے لیے۔ اس لیے میں احسان اور مانہ کی شادی کی مخالفت کر رہی تھی۔“ ”کیا ہوا پھو؟“ وہ بے حد گھبرا گئے تھے۔ ”مانہ نے شادی سے انکار کر دیا۔“

”لیکن اس وقت جب شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے تو کیوں؟“ انہی عادت کے مطابق وہ غصے میں آ گئے تھے۔ ”پہلے ہی انکار کر دیتی تو احسان روپیٹ کراپ تک سنبھل چکا ہوتا۔“

”پتا نہیں کیوں فلک! عامر کافون آیا تھا۔ میں نے تو بھائی جان سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ عامر کو بھی منع کر دیا کہ ابھی کسی سے بات نہ کرے اور ان کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا۔“

”لیکن آپ کیا کریں گی وہاں جا کر۔ فتنیں کریں گی اس کی۔ اچھا ہے جان پھو! شادی کے لیے احسان کی۔ وہ لڑکی احسان کے قابل ہرگز نہیں ہے۔“

”اس وقت جب سب شادی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔“ وہ روپائی ہو رہی تھیں۔

”تم جانے ہونا فلک! میں نے بھائی جان کو مجبور کیا تھا مانہ کے لیے ورنہ تو راضی ہی نہیں تھے۔“ ”وہ تو ٹھیک ہے پھو! احسان شاہ کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے کیا۔ مانہ سے ہزار درجے اچھی لڑکیاں ہیں۔ ہم اسی تاریخ پر شادی کی شادی کر دیں گے۔“

”اور احسان۔۔۔ وہ کرے گا کسی اور لڑکی سے

شادی؟ وہ بہت محبت کرتا ہے مائے سے۔۔۔ اس کی محبت میں جھونٹی ہے وہ۔“

اور یہاں اس بات پر وہ ہار مان گئے تھے۔
”تو آپ مثالیں کی اسے؟“

”کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے موی۔“

شانی جو سزاور سینڈوچ لے آیا تھا لیکن وہ اتنے اب سیٹ ہو گئے تھے کہ نہ تو انہوں نے سینڈوچ ہی کھایا تھا اور نہ جوس پیا تھا۔ سارا راستہ خاموش سے کٹا تھا۔ احسان شاہ نے دو تین بار پوچھا بھی تھا۔

”کیا بات ہے فلک! آٹم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو۔“

”نہیں اپ سیٹ نہیں ہوں۔ سر میں کچھ درد ہے اور بس۔“

”سوری یار! میں تمہیں زبردستی لے آیا۔ تم وہیں بتا دیتے سر درد کاتو میں۔۔۔“ وہ شرمندہ ہوا تھا۔

”ارے یار چھوڑو۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”اب ایسا بھی درد نہیں ہے۔“

لیکن رحیم یار خان پہنچتے پہنچتے ان کا سر درد شدت اختیار کر گیا تھا۔ بچپن میں انہیں اکثر میگکین کا درد ہو جاتا تھا، لیکن اب تو بہت عرصہ سے انہیں اتنا شدید درد نہیں ہوا تھا۔ پھپھو نے فوراً ہی گیسٹ روم کھلوا کر انہیں آرام کرنے کو کہا تھا۔

”تم لیٹ جاؤ فلک! میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ بھجاتی ہوں۔“

وہ احسان شاہ کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی تھیں۔ اور ان کے جانے کے بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ”کیا ہوگا اگر مائے نے پھپھو کی بات نہ مانی تو شانی تو۔۔۔ پھپھو سچ ہی تو کہتی ہیں کہ وہ تو مائے سے بہت شدید محبت کرتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے جب احسان شاہ پھپھو کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اندر آیا تھا۔

”مان لیں پھپھو! انکل نے آپ کو بلانے کے لیے بیماری کا ٹانک کیا ہے۔ ورنہ اچھے بھلے تو ہیں۔“

”جو موت۔۔۔ ان کی طبیعت خراب تھی میں خود ہی

چلی آئی۔ انہوں نے تو نہیں بلوایا تھا۔“

”نیوں کہیں، آپ خود بھی اداس ہو رہی تھیں ان کے بغیر۔“ کس قدر شوخ ہو رہا تھا وہ۔

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹی نظر آتی تھی۔

”بھی کچھ دیر کی بات ہے اوس۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”فلک! احسان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ ”میرا خیال ہے تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔ میں انکل سے پتہ کرنا ہوں ڈاکٹر کا۔“

انہوں نے سر اٹھا کر احسان شاہ کی طرف دیکھا اور ان کے لبوں پر پھپکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”نہیں! ابھی یہ ٹیبلٹ لے کر چائے پوں گا اور کچھ دیر آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا تم پریشان نہ ہو۔“

”ہاں! تم چائے پی کر کچھ دیر سو جانا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں تم جب سو کر اٹھتے تھے تو تمہارا درد ٹھیک ہو جاتا تھا۔“

پھپھو نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور سر درد کی گولی ان کی طرف بڑھائی۔

”تھینک یو پھپھو۔“ انہوں نے گولی لے لی تھی۔ تب پھپھو نے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

”اور تم احسان اندر اپنے انکل کے پاس جا کر بیٹھو۔ بلکہ تم بھی آرام کرو کچھ دیر۔ میں ذرا آپا کی طرف جا رہی ہوں پھر آکر کھانا کلو انی ہوں۔“

ان کی نظریں پھپھو سے ملی تھیں اور پھر مضطرب سے ہو کر وہ سر جھکا کر گھونٹ گھونٹ چائے بنے لگے۔

پھپھو احسان شاہ کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی تھیں اور جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ وہ چائے پی کر لیٹ گئے تھے۔ بہت دیر آنکھیں موندے بڑے رہے لیکن نیند نہیں آئی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی جب دروازہ ہولے سے کھلا تھا اور پھر کسی نے کمرے کی لائٹ جلائی تھی۔

انہوں نے جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹے تھے ہاتھ ہٹا کر

دیکھا تو دروازے کے پاس مائہ کھڑی تھی۔
 ”آپ!“ ان کے لبوں سے حیرت سے نکلا تھا اور
 یکدم اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔
 ”مائی کہہ رہی تھیں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں
 ہے تو میں۔“
 ”پچھو کہاں ہیں؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹ
 دی تھی۔
 ”یہاں میں ہیں شاید۔“
 ”اور احسان؟“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جھک کر
 بیڈ کے پاس بڑے اپنے جوتے پہننے لگے تھے۔
 ”مجھے علم نہیں ہے۔ میں اندر نہیں گئی۔ مائی کہہ
 رہی تھیں۔ ہمیں مجھ سے کوئی بات کرنا ہے۔“ اس
 نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔
 ”مجھے۔“ وہ چونکے تھے۔ اور پھر اس سے پہلے کہ
 ان کے لبوں سے نہیں نکلتا؟ انہیں خیال آیا کہ شاید
 پچھو نے اس خیال سے یہ کہا ہو کہ میں اسے
 سمجھاؤں۔

”ہاں۔ وہ آپ نے شادی سے انکار کیوں کیا؟“
 ”اس لیے کہ میرا دل نہیں مانتا کہ دل میں کوئی اور
 ہو۔ شادی کسی اور سے کروں۔“
 ”تو کیا پہلے آپ کے دل نے آپ کو منع نہیں کیا؟
 اب جبکہ شادی سر پہ ہے۔ کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔
 اب آپ کا دل کہہ رہا ہے کہ شادی سے انکار
 کریں۔“
 ”پہلے میں نے سوچا تھا کہ احسان شاہ سے شادی
 کر کے میں تمہیں دیکھ سکوں گی۔ زیادہ قریب ہو جاؤں
 گی لیکن جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے ہیں
 مجھے لگ رہا ہے کہ یہ زیادہ اذیت ناک ہو گا تمہیں کسی
 اور کے ساتھ دیکھنا ہے۔“
 وہ بمشکل ضبط کیے بیٹھے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ
 تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔
 ”مائہ حسین۔!“ ضبط کی کوشش میں ان کا چہرہ
 سرخ ہو رہا تھا۔ ”آپ نے زندگی کو ایک کھیل سمجھا
 ہوا ہے۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو ایک شخص کے

جذبات اور دل سے کھیلنے کا؟ آپ نے تو شانی کو اپنی
 محبتوں کا یقین دلایا ہے۔ جھوٹ بولا ہے اس کے
 ساتھ۔ آپ کے نزدیک خاندان اور افراد کا وقار کوئی
 معنی نہیں رکھتا؟ نہ آپ کو اپنے والدین کا خیال ہے نہ
 دوسروں کا۔“
 ان کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔
 ”قار گاڑیک مائہ! آپ ایک سمجھ دار لڑکی ہیں۔
 اگر آپ کو شادی نہیں کرنا تھی تو پہلے ہی نہ کرتیں۔
 لیکن اب اس مرحلے پر۔“ وہ کھڑے ہو گئے تھے۔
 ”مائہ بلیز! اس طرح مت کریں۔“
 وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”خاندان کی عزت
 اور وقار کے لیے اگر میں اس وقت شادی کر لوں تو تم
 وعدہ کرتے ہو کہ میں اگر اپنے دل کو احسان شاہ کے
 ساتھ رہنے پر راضی نہ کر پاؤں اور طلاق لے لوں تو
 اس صورت میں تم عمارہ کو طلاق دے کر مجھ سے شادی
 کر لو گے؟“
 ”اور وہ یکدم ہنر کا اٹھے تھے۔

”میں اس طرح کا بے ہودہ وعدہ ہرگز نہیں کروں
 گا۔ میری طرف سے تم جنم میں جاؤ اور میں نے
 تمہیں ہرگز نہیں بلوایا تھا۔ میں تو تمہاری شکل تک
 دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔“
 اس کی آنکھوں میں یکدم غصہ برپا ہوا تھا اور چہرے پر
 سرخی چھا گئی تھی اور جب وہ بولی تھی تو انہیں اس کی
 آواز کسی سانس کی پھنکار کی طرح لگی تھی۔
 ”زندگی تو تمہاری میں جنم بناؤں گی فلک شاہ! تم ہو
 کس زعم میں۔“
 وہ یکدم تیزی سے پلٹ کر دروازہ زور سے بند کرتی
 چلی گئی تھی سوہ بے دم سے ہو کر ریڈ پر گرنے کے سے
 انداز میں بیٹھ گئے۔ وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ مائہ
 نے کیا کہا تھا۔ وہ صرف احسان شاہ کے متعلق سوچ
 رہے تھے۔
 اس پر کیا گزرے گی۔ وہ کیسے سے گاس غم کو کتنا
 چاہتا ہے وہ اس بے وفاء اور فریبی لڑکی کو۔
 پتا نہیں کتنی ہی دیر وہ یوں ہی سر ہاتھوں میں تھا

بٹھے رہے تھے۔ درد شدت اختیار کر گیا تھا، لیکن
 بچوں پر انہیں اختیار نہ تھا۔
 ”الریان“ میں خوشی کے شادیاں بچ رہے تھے۔
 دارا، عمارہ، شامی، راحت بھابی رات گئے تک
 ڈولک لے بیٹھی رہیں۔ ایسے میں جب ”الریان“
 میں جریپ بچے کی کہ۔۔۔
 ”نہیں۔ یا اللہ! اس لڑکی کا دل پھیر دے تو چاہے تو
 کیا نہیں ہو سکتا۔“
 انہوں نے غم آنکھوں کے ساتھ سچے دل سے دعا
 کی تھی۔ اور پتا نہیں وہ کوئی لمحہ قبولیت تھا کہ پچھو
 دروازہ کھول کر اندر آئیں اور انہیں بیٹھے دیکھ کر
 پوچھا۔
 ”تم جاگ گئے ہو فلک! کیسی طبیعت ہے اب؟“
 ان کے لمبے میں وہی نرمی اور شفقت تھی جو ”الریان“
 کے لوگوں کا خاصا تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر انہیں
 دیکھا۔

”میں سویا ہی کب تھا۔“
 انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
 ”تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی فلک!
 احسان اور تمہارے اٹکل آتے ہیں تو تم ڈاکٹری طرف
 چلے جاؤ۔“
 ”وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟“
 انہوں نے پچھو کے چہرے سے اس پریشانی کو
 کھوجنا چاہا جو وہ راستے بھر ان کے چہرے پر دیکھتے آئے
 تھے۔
 ”میرے سرانی عزیزوں میں شادی کے کارڈ دینے
 گئے ہیں دونوں۔“
 ”کس کی شادی کے؟“ ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
 ”میں نے احسان کی شادی کے۔“ پچھو کے لبوں پر
 مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
 ”لیکن وہ مائہ۔“ وہ متذبذب سے ہو کر انہیں دیکھ
 رہے تھے۔
 ”یہ بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ
 وہ ان جائے گی۔ آپا اور بھائی جان بہت پریشان تھے۔

میں عامر کو پتا کر سیدھی اوھر ہی گئی تھی۔ یہ ساتھ والا
 ہی تو کھر ہے۔ وہ تو کسی صورت میں ہی نہیں رہی تھی۔
 صاف انکار۔ میرے ساتھ ہی اوھر آئی تھی کہ آپ
 میں ہمت نہیں ہے تو میں خود احسان شاہ کو تباہی ہوں
 کہ اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میں بچن میں چلی
 گئی۔

بڑی دیر بعد میں ہمت کر کے بچن سے باہر آئی تو وہ
 لوگ روم میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو
 کھڑی ہو گئی کہنے لگی سائی! میں گھر جا رہی ہوں۔ اور
 میں نے احسان شاہ سے بات نہیں کی۔ میں آپ کی
 اور اماں ابائی خاطر شادی کے لیے تیار ہوں۔ شکر ہے
 اللہ نے اس کا دل پلٹ دیا۔“
 انہوں نے یکدم اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ تاہم
 انہوں نے تشویش سے پچھو کو دیکھا تھا۔
 ”پچھو! وہ احسان سے محبت نہیں کرتی۔ بعد میں
 آگے۔“ پچھو مسکرا دی تھیں۔
 ”بعد میں کچھ نہیں ہو گا۔ میاں بوی جب نکاح
 کے بندھن میں بندھتے ہیں ساتھ رہتے ہیں تو خود بخود
 محبت ہو جاتی ہے۔“
 پچھو مطمئن تھیں، لیکن ان کے دل پر ابھی بھی
 بوجھ سا تھا۔
 اور پھر نیند کی گولی کھا کر وہ جلد ہی سو گئے تھے۔ ان
 کی آنکھ نچر کے وقت ہی کھلی تھی۔ طبیعت کافی بہتر تھی۔
 سر ہلکا سا بو بھل تھا، لیکن درد نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی
 اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور پھر نماز پڑھ کر انہوں نے
 احسان شاہ کو بھی اٹھا دیا تھا۔
 ”ٹھوہار! ناشا کر کے نکل جائیں گے۔“
 ”تھوڑی دیر سے نہیں جاسکتے؟“ احسان شاہ نے
 مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔
 ”نہیں۔ پورے چھ گھنٹے کا سفر ہے، یہاں سے
 لاہور تک کا۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم ٹائم سے لاہور پہنچ
 جائیں۔“
 ”لیکن مائہ تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتی۔“
 احسان شاہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”کیوں کیا رات ملاقات نہیں ہوئی تھی۔“

”ہوئی تھی، لیکن مختصر سی تشنہ تھی۔ پتا ہے پچھو کہہ رہی تھیں۔ رات وہ آئی تھی اور ہم لوگ نیوی لائونج میں تھے وہ پچھو کے پاس بچن میں ہی بیٹھ کر چلی گئی۔“

”دیری سیڈ! فلک شاہ نے اظہار افسوس کیا۔ دے لیے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی۔؟“

”نکل کے ساتھ جب ان کی طرف ملنے گیا تھا تب۔“ احسان شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”نی الحال مختصر ملاقات پر ہی اکتفا کرو۔ تفصیلی ملاقات اب ایک بار ہی کرنا۔“

”ظالم انسان! تم چند گھنٹے رک جاؤ تو۔ ہم سات آٹھ بجے تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔“

”ہاں لیکن سات آٹھ بجے مجھے میرا ڈاکٹر نہیں ملے گا۔“ فلک شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ ہاں۔۔۔ اب تمہارے سرور کا کیا حال ہے۔“

”کچھ بہتر ہے، لیکن آنکھوں کے سامنے روشنی کے جھماکے سے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ عام درد میگزین میں ڈھل جائے، ہم لاہور پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔“

اور پھر احسان شاہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور وہ ناشتا کر کے گھر سے نکل پڑے تھے۔ پچھو ان کے ساتھ واپس نہیں جا رہی تھیں۔ ان کا ارادہ دو روز بعد انکل عامر کے ساتھ آنے کا تھا۔

”یہ پچھو کا سسرال بھی یہاں ہوتا تھا اتنی دور پنجاب کی سرحد پر۔“ روڈ پر آکر احسان شاہ نے تبصرہ کیا تھا۔

”اب تو تمہارا سسرال بھی یہیں ہی ہے میری جان۔“

”مجبوری ہے۔“ احسان شاہ نے کندھے اچکائے تھے اور انہوں نے سرایت کی پشت پر ٹیکے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

”تھینک گاڈ! ماہانہ گئی، لیکن کیسے۔۔۔ دو منٹ پہلے میرے سامنے انکار کرنے کے بعد۔ پتا نہیں اس لڑکی

کے ذہن میں کیا ہے۔ پچھو کتنی ہیں شادی کے بعد میاں بیوی کے درمیان خود بخود محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ شہر دل کھتا ہے کہ یہ لڑکیاں یوں ہی ڈانٹا لگ مارتی ہیں اور ماہرہ کتنی ہے وہ ان کی زندگی جنم بنا دے گی۔؟“ وہ سارا راستہ یہی ایک بات سوچتے آئے تھے۔ احسان شاہ نے کوئی بات بھی کی تو انہوں نے مختصر جواب ہی دیا تھا۔

گھر آکر ان کا دل چاہا تھا کہ وہ دادا جان سے یہ ساری بات کہہ دالیں، لیکن پھر ان کی پریشانی کے خیال سے وہ ان سے کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ تاہم انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ ”الریان“ کم کم ہی جایا کریں گے مبادا کوئی بات ہو جائے، لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ ماہرہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ ان کے یا عمار کے ساتھ کچھ غلط کرے۔ وہ جذباتی ضرور ہے اور اس نے شاید پہلی نظر میں انہیں پسند کر لیا تھا اور ابھی تک دل سے نہیں نکال نہیں سکی۔ زندگی میں ہمیشہ ہی اسے سراہا گیا ہو گا۔ وہ بھی اتنی خوبصورت۔ پہلی بار انہوں نے اسے نظر انداز کیا تو وہ ناراضی اور غصے کا اظہار کر رہی ہے۔

انہوں نے خود کو تسلی دی تھی اور کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئے تھے، لیکن پھر اسٹیج پر جس طرز اس نے عمار کا ہاتھ جھٹکا تھا اور جن نظروں سے اس نے عمارہ کو دیکھا تھا۔ انہیں لگتا جیسے اس کی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں ایسے بھسم کر دیں گی۔

اسی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں کہ وہ ہاتھ کے عمارہ کا ہاتھ تھامے اسٹیج سے اتر آئے تھے۔ عمارہ کی آنکھوں میں حیرت تھی وہ شاید کچھ کہنا بھی چاہتی تھیں، لیکن انہوں نے جان بوجھ کر کوئی اور بات پیچڑ دی تھی۔ تاہم انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی بہاول پور جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ احسان شاہ کی شادی کے بعد دادا جان بھی بہاول پور جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

”دادا جان! آپ وہاں اکیلے کیا کریں گے۔ یہاں رہیں نا ہمارے پاس۔ ایک تو آپ کے بغیر بہت

نے گل۔“ احسان نے کہا تھا۔

”میں پھر آ جاؤں گا لیکن میرا دل گھبرا گیا ہے۔ جہاں ہماری زندگی گزاری ہو وہاں سے دور رہنا بہت مشکل ہے۔ خاص طور پر اس عمر میں بندے کا دل اپنے گھر پر ہی لگتا ہے۔“

”دادا جان! آپ کچھ دن رک جائیں تو۔ ہم آپ کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ میں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے، لیکن برس وراثت آپ کرنے میں کچھ دن تو رہیں گے۔“ اور دادا جان بے حد خوش ہوئے تھے۔

”یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے فلک شاہ! میں بھی چاہتا تھا کہ زندگی کے جو باقی ماندہ دن بچے ہیں۔ تم میری آنکھوں کے سامنے رہو میرے پاس۔“

”آپ کو کچھ نہیں ہو گا دادا جان! ان شاء اللہ آپ اپنے ہاتھوں سے میرے ایک کی شادی کریں گے۔“ اور وہ ان کی بات پر مسکرا دیے تھے۔

مگر بہاول پور جانے کے تین دن بعد ہی انہوں نے ایک سے آنکھیں موند لی تھیں۔ رات کو سوئے تو صبح اٹھے ہی نہیں۔

مراد پیلے سے گلزار کا فون آیا تو کتنی ہی دیر تک انہیں یقین نہیں آیا۔ ”الریان“ سے سب ہی ان کے ساتھ ”مراد پیلے“ گئے تھے۔ سوائے ماہرہ کے۔ دادا جان کو دفتار آئے تو وہ کتنی ہی دیر تک عبد الرحمن شاہ کے گلے لگ کر روتے رہے۔

بابا جان بہت دیر تک انہیں تسلیاں دیتے رہے تھے۔

”ہم سب ہیں نا تمہارے اسنے۔ تم تنہا نہیں ہو۔“

”چچا جان کی جگہ تو کوئی بھی نہیں آ سکتا، لیکن ”الریان“ کے ہر فرد کے دل میں غم دھڑکتے ہو۔ تمہیں کبھی پریشانی آئی تو تم تک تو وہ بعد میں پہنچے گی پہلے ”الریان“ کا ہر فرد اس پریشانی کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جائے گا۔“

احسان شاہ تھا جو بابا جان کے بالکل پاس کھڑا تھا، لیکن کتنے دکھ کی بات تھی کہ پھر جب ان پر مصیبت اور پریشانی آئی تو وہ بالکل تنہا کھڑے تھے۔

”الریان“ کا ایک فرد بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ مہینہ بھر بہاول پور رہ کر واپس لاہور آ گئے تھے۔ ”مراد پیلے“ دادا جان اور دادی جان کے بغیر کتنا ویران لگتا تھا، ان کا دل گھبرا جاتا تھا۔ گلزار کو سارے معاملات سمجھا کر وہ لاہور آ گئے تھے۔

بابا جان نے ایک بار پھر انہیں ”الریان“ میں آنے کا کہا تھا۔

”تاہم برا گھر ہے مولی! کیا تمہارے اور عمو کے لیے جگہ نہیں ہے۔“

ایک لمحہ کے لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ بابا جان کی بات مان لیں، لیکن پھر انہوں نے سوچا تھا کہ اگر دادا جان ہوتے تو وہ انہیں بھی ”الریان“ میں رہنے کا مشورہ نہ دیتے اس صورت میں جبکہ ماہرہ بھی وہاں تھیں اور یہ کہ وہ ان سے اور عمارہ سے نفرت کرتی تھیں۔ تب انہوں نے بڑے رساں سے کہا تھا۔

”بابا جان! یہ مناسب نہیں ہے۔“

”اب تمہیں مجھے سمجھاؤ گے فلک شاہ کہ کیا مناسب ہے کیا نہیں۔“ وہ بڑبڑاتے تھے۔

”میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔ بابا جان! لیکن دادا جان کہتے تھے۔ بیانی بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ میکے جا بیٹھیں تو ہلکی ہو جاتی ہیں۔“

انہوں نے بابا جان کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے آنکھوں سے لگایا تھا اور انہوں نے پھر مزید کچھ نہ کہا تھا۔

ان دنوں وہ بہت مصروف ہو گئے تھے۔ اور اس روز بھی رات وہ بہت دیر سے گھر آئے تھے اور عمارہ نے انہیں بتایا تھا کہ بابا جان ان کا دیر تک انتظار کرتے رہے اور وہ اس پر بہت ناراض ہو رہے تھے کہ آپ کسی سی یا سی پائی کے رکن ہیں۔

”اچھا!۔“ وہ پریشان ہوئے تھے۔ ”میں کس نے بتایا۔ شاید احسان شاہ نے۔“

”تیا نہیں۔“ عمارہ ایک کے رونے پر اٹھ کر چلی گئی تھیں اور انہوں نے سوچا تھا وہ کل ”الریان“ جا کر بابا جان کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کریں گے اور

جنگ جب ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر پر تھے تو مصطفیٰ آگئے۔ انہوں نے اور بیٹا بھی نے آج واپس جانا تھا۔
”مصطفیٰ بھائی! آپ کیوں جا رہے ہیں۔ مرتضیٰ بھائی اور عثمان بھائی تو وہاں سیٹ ہو گئے ہیں۔ آپ تو نہ جائیں پلینے۔ انجینیئروں میں آپ لوگ کیسے دل لگاتے ہیں؟“
”سال ڈیڑھ سال کی بات ہے یار! پھر ہمیشہ کے لیے آجاؤں گا۔“

”یہ اچھی بات ہے۔“ وہ خوش ہو گئے تھے۔
”فلک! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔ دیکھو میں نے پہلے بھی تمہیں سمجھا یا تھا یہ سب سے دیرینہ کے چکر میں مت پڑو۔ وقت بڑے پر یہ لوگ تمہاری طرف دیکھیں گے بھی نہیں جن کے لیے آج تم جائیں دینے کو تیار رہتے ہو۔ کل بابا جان کو شاید کسی نے بھڑکایا تھا۔ وہ تو میں نے انہیں کہا کہ تم کسی ویلفیئر تنظیم کے لیے کام کرتے ہو۔ کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں ہو۔“

وہ سر جھکائے سنتے رہے اور انہوں نے مصطفیٰ سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اب وہ کوشش کریں گے کہ وہ ان سیاسی سرگرمیوں میں زیادہ ملوث نہ ہوں۔ لیکن وہ حق نواز کو انکار نہیں کر سکتے تھے۔ جب بھی حق نواز انہیں کسی میٹنگ کے لیے بلاتا تو انہیں جانا پڑا تھا۔ پھر وہ کون سا پوزیشن میں تھے ان کی پارٹی تو برسرِ اقتدار تھی۔ سو وہ لاپرواہ تھے کہ بھلا ڈر اور خوف والی کیا بات ہے بابا جان اور مصطفیٰ بھائی تو یوں ہی ڈرتے ہیں۔
مصطفیٰ چلے گئے تھے اور وہ اپنی زندگی میں بے حد مصروف ہو گئے تھے۔ اس دوران انکیشن ہوئے ان کی پارٹی کامیاب رہی تھی۔

یہ جنوری 1977ء کی بات تھی۔ حق نواز نے پارٹی کے لیے بہت کام کیا تھا۔ وہ بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ حق نواز کو ایک فائدہ ہوا تھا کہ اسے اس کی اہلیت کے مطابق جل مل گئی تھی۔
وہ جب بھی ”لریان“ جاتے تو شعوری طور پر کوشش کرتے کہ ماہ سے ان کا سامنا نہ ہو، اگر سامنا

ہو جاتا تو وہ راساً حال چال پوچھ لیا کرتے تھے اور کبھی دھیان سے انہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انہیں کئی مرتبہ ماہ کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس ہوتی تھیں اور وہ دانستہ نظریں چڑھا جاتے تھے ان دنوں اپوزیشن کی طرف سے الزام لگائے جا رہے تھے کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے۔ وہ حق نواز کی طرف گئے تو وہ کچھ پریشان سا بیٹھا تھا۔
”یار! ایسا تو ہوتا ہے ہر الیکشن میں پارٹیاں ایک دوسرے پر الزام لگاتی ہیں کہ دھاندلی ہوئی ہے۔“
”لیکن اگر میں کون اس میں بہت حد تک متوجہ ہوں تو۔“ حق نواز نے نظریں چرائی تھیں۔
”ایسا تو ہوتا ہے فلک شاہ! جب اختیار آپ کے پاس ہو تو مرضی کے نتائج حاصل کرنا کون سا مشکل کام ہے۔“

”یہ انصاف تو نہ ہوا حق نواز! ہم تو انصاف کے اور حق کے داعی ہیں۔“ حق نواز نے کوئی تبصرو نہیں کیا تھا۔ نام چلے پڑے ہوئے اس نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ وہ چونک پڑے تھے۔
”دن گئے جا چکے فلک شاہ! میں نے کئی لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ عجیب عجیب خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ کچھ صحافی دوست تو صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ وقت پورا ہو چکا ہے دیکھو کیا ہوتا ہے فلک شاہ! اس تم پر دعا گو کہ ملک و قوم کے حق میں بہتر ہو۔ سرالطاف کہتے ہیں تاکہ ملک و قوم کے لیے کام کرنے والے ہر حالت میں اور ہر جگہ کام کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے اقتدار کی کرسی ضروری نہیں ہے۔“
وہ حق نواز کے پاس سے اٹھے تو بہت افسردہ سے تھے۔ ہم لوگ اس طرح کیوں ہیں۔ کیوں نہیں مل جل کر اتحاد سے ملک کی ترقی کے لیے کام کرتے ہر ایک دوسرے کو دھکا دینے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔
وہ گھر آئے تو عمارہ نے بتایا کہ زارا کی شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔
”اے وہ تو بہت چھوٹی سی ہے۔“ انہیں حیرت

ہوتی تھی۔
”بس اچانک ہی رشتہ آیا اور بابا جان نے فیصلہ کر لیا۔“ عمارہ نے انہیں بتایا۔ سوہ ”لریان“ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ اس روز بڑے دونوں بعد وہ اتنی دیر تک ”لریان“ میں رہے تھے۔ زارا کو چھیننے بابا جان سے سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے وہ یکدم ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔

احسان شاہ اور وہ بہت دیر تک بابا جان کے پاس بیٹھے تفصیلات طے کرتے رہے اور جب وہ اور عمارہ واپس آ رہے تھے تو انہوں نے ماہ کو دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ عمارہ نے اسے غرا حافظ لکھا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”تمہارا حوصلہ ہے بھی! جو تم ہر روز میکے چلی آتی ہو میاں اور بچے سمیت، ورنہ شادی کے بعد تو گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے عورت کے لیے۔ شاید تمہارا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا۔“

وہ جو ایک کواٹھائے ہوئے ووقدم آگے نکل گئے تھے، ٹھٹھک کر رک گئے۔ عمارہ حیرت سے ماہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اور ماہ کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی اور نظریں جو عمارہ کے چہرے پر جمی تھیں ان میں اتنی نفرت تھی کہ غیر ارادی طور پر وہ ووقدم آگے ہو کر عمارہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوئے تھے کہ عمارہ ان کے پیچھے چھب گئی تھی۔ شاید وہ اسے ماہ کی نظروں میں چھپی نفرت سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کی نظریں ماہ کی نظروں سے ملی تھیں۔ ماہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی جیسے وہ ان کی کیفیت سے محفوظ ہو رہی ہو اور پھر فوراً ہی وہ رخ موڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور وہ نا کچھ کہے ضبط کی حدوں سے گزرتے عمارہ کا ہاتھ تھامے لاؤنج سے باہر نکل آئے تھے۔ اس روز انہوں نے سوچا تھا کہ بابا جان کے اصرار پر بھی انہوں نے ”لریان“ نہ رہنے کا بالکل صحیح فیصلہ کر لیا تھا اور اسی روز انہوں نے بھاول پور جانے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ داوا جان کے بعد وہ کچھ متذبذب سے ہو گئے تھے اور انہوں نے

لاہور ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن اب ایک بار پھر وہ عمارہ سے کہہ رہے تھے ”عموماً ہم زارا کی شادی کے بعد بھاول پور چلے جائیں گے۔ داوا جان اور داوی جان کی خواہش تھی تاکہ ہم وہاں رہیں ”مراد پیل“ میں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں بھاول پور میں ہی رہنا چاہیے۔“ آنسو ان کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

”آپ نے سنا نہیں تھا، ماہ بھابھی کیا کہہ رہی تھیں شاید انہیں ہمارا ”لریان“ میں جانا پسند نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے ذرا دیر ہو جائے تو بابا جان خود فون کر لیتے ہیں۔“

انہوں نے عمارہ کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے ہوئے کہا تھا۔

”یار! یہ مند بھابھی کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم دل پر مت لو۔“

عمارہ کو تو انہوں نے سمجھا لیا تھا، لیکن خود وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ماہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اب جبکہ وہ احسان شاہ کے ساتھ ایک بہت خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔

یہ زارا کی شادی کے تین دن بعد کی بات تھی۔ زارا رخصت ہو کر جا چکی تھی۔ اور یہ جولائی 1977ء تھا۔ جب حق نواز کا فون آیا تھا۔ فوجی حکومت آگئی۔ وزیر اعظم گرفتار ہو گئے۔

”نہیں۔“ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔
”تم نے ٹی وی نہیں لگایا اور خبریں نہیں سنی۔“
”زارا کا کالعدم ایجنڈا کر کے رات دیر سے آئے تھے۔ میں ابھی تک سو رہا تھا۔ تم کہاں ہو اور عوامی رد عمل کیا ہے؟“

”میں گھر پر ہوں۔ اور فی الحال تو کوئی رد عمل دیکھنے میں نہیں آ رہا۔ شاید شام تک ہم لوگ اٹھتے ہوں۔“
”میں آ رہا ہوں تم گھر پر ہی رہنا۔“

”میں نے تم سے کہا تھا تاکہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ کاش ہم یہ کچھ برا ہونے سے پہلے خود کو سنبھال

لیتے، لیکن جب آدمی اختیار ہوتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ حق نواز جذباتی ہو رہا تھا۔

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جب وہ تیار ہو کر باہر نکلے تو لوگ گلیوں میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بات کر کے خوف زدہ نظروں سے اودھ اودھ دیکھتے تھے۔ وہ میڈیکل اسٹور سے ایک کی دوالے کر گھر آئے تو انہوں نے عمارہ کو بتایا کہ وہ کچھ دیر کے لیے حق نوازی کی طرف جارہے ہیں اس لیے اگر وہ چاہیں تو انہیں ”الریان“ چھوڑ جاتے ہیں لیکن عمارہ نے متفق کر دیا۔

”زارا آجائے سسرال سے تو پھر ہم بہاول پور چلے جائیں گے۔“ وہ چونکے تھے۔

”کیا مارہ بھالی نے پھر کچھ کہا؟“

”نہیں۔“ عمارہ نے نظریں چرائی تھیں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ ہم چند روز تک چلے جائیں گے۔“ اور پھر وہ حق نوازی کی طرف آگئے تھے۔ حق نواز بہت افسردہ سا تھا۔

کل کیا ہوگا؟ اس کے متعلق وہ کچھ اندازہ نہیں کر پا رہے تھے۔

”کیا مارشل لا ہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ کیا ہمارے پاس ان مسائل کو نبھنے کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ کوئی متصفانہ حل۔۔۔ یہ تو جبر ہے یا رازبادتی ہے۔“

وہ چپ چاپ حق نوازی کی باتیں سنتے رہے تھے۔ اس دوران حق نواز کے پاس دو تین فون بھی آئے تھے۔ آخر طے یہ پایا تھا کہ کل کسی وقت وہ سب پارٹی کے دفتر میں اکٹھے ہو کر صورت حال پر غور کریں گے۔ پارٹی لیڈر تو جیل میں تھے۔

وہ کل ملنے کا وعدہ کر کے جلد ہی اٹھ آئے تھے۔ گھر آئے تو عمارہ بے حد پریشان بیٹھی تھیں۔ ایک کا بخار تیز ہو گیا تھا۔ وہ اسی وقت ایک کو اسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے داخل کر لیا تھا۔ میریج بہت ہائی تھا۔ دو دن بعد وہ ایک کو لے کر گھر آئے تو شیردل کا

فون آیا تھا۔

”کہاں تھے فلک تم۔۔۔ میں نے کتنے ہی فون کیے۔“ شیردل بے حد پریشان تھا۔

”کیا ہو آخریت ہے۔“

”خیریت نہیں ہے۔۔۔ حق نواز دو دن سے غائب ہے۔ وہ کھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ پارٹی کے دفتر چلا گیا ہے۔ کچھ دیر تک آجائے گا لیکن واپس نہیں آتا۔ ماموں کارات کو فون آیا تھا۔ تب سے سارے سوسائز استعمال کر رہا ہوں کچھ بتا نہیں چل رہا۔“

وہ خود بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ شکر ہے شیردل کی پوشنگ ان دنوں لاہور میں ہی تھی ورنہ حق نواز کے والد بے چارے کیا کرتے

”تم کہاں ہو شیردل؟“ انہوں نے پوچھا تھا۔

”میں اس وقت ماموں کی طرف ہی ہوں۔“

”اوکے میں آتا ہوں ابھی۔“

”لیکن تمہارا بیٹا پار ہے۔“

”اب تو ٹھیک ہے۔ ایک دو دوستوں کو جانتا ہوں جو حق نواز کے بہت قریب تھے۔ ان سے پتا کرتے ہیں۔“

وہ عمارہ کو بتا کر حق نواز کے گھر آگئے تھے۔ اس کے والد اور والدہ کی حالت بہت خراب تھی۔ رورو کر سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ شیردل کے ساتھ ان سب جگہوں پر گئے تھے جہاں سے کچھ معلوم ہونے کی توقع تھی لیکن کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ حق نواز پارٹی کے دفتر گیا تھا لیکن وہاں سوائے محسن اور افضل کے اور کوئی نہیں آیا تھا اور وہ بھی جلدی چلے گئے تھے۔ سب سے آخر میں حق نوازی گیا تھا۔

مزید ایک دن گزر گیا تھا حق نواز کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ وہ بے حد افسردہ سے بیڈ پر لیٹے تھے۔ عمارہ نے بتایا تھا۔ ”بابا جان صبح سے کئی بار فون کر چکے ہیں۔ ایک چکر بھی لگایا ہے اودھر کا۔۔۔ اہاں جان بھی بہت ادا اس ہو رہی ہیں زارا کے لیے۔ کچھ دیر کے لیے چلیں اودھر؟“

”تم جلی جاؤ عمو۔۔۔ میں تھوڑی دیر تک شیردل کی جانوں گا۔ شاید حق نواز کا کچھ پتا چلا ہو۔“

ہر عمارہ کے جانے کے بعد وہ شیردل کی طرف چلے گئے تھے۔ اس کے ساتھ وہ مختلف جگہ انہیں ڈھونڈتے رہے تھے۔ کئی تھاؤں سے بھی پتا کیا۔ شیردل وردی تھا۔ اس لیے ہر جگہ اچھی طرح لوگوں نے گائیڈ کیا۔ آخر کہاں چلا گیا وہ؟ انہوں نے شیردل سے پوچھا تھا۔

”مجھے ڈر ہے کہ گرفتار کر لیا گیا ہے اسی دن سے ڈرتے تھے۔“

”اگر گرفتار کر لیا گیا ہے تبھی بتا تو چلے کہاں ہے۔“

”سبیل میں رکھا گیا ہے اسے۔ ملاقات تو ہو کسی صورت۔“ انہوں نے شیردل سے کہا۔

”یہی تو پتا نہیں چل رہا فلک شاہ۔۔۔ اور سنو! تم بھی ڈاکٹر رہنا۔ اودھر اودھر بصرہ مت کرتے رہنا۔“

شیردل کے ساتھ کافی دیر تک اودھر اودھر گھومنے کے بعد وہ بہت دیر تک حق نواز کے گھر بیٹھے رہے تھے۔

وہ رجب وہ وہاں سے نکلے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ انہیں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ ”الریان“

بچے بچے پارہ بج گئے تھے۔ گوکہ گرمیاں تھیں اور لاہور میں ابھی پارہ بجے لوگ جاگ رہے تھے۔ سڑکوں اور مارکیٹوں میں بھی آمد و رفت تھی پھر بھی ”الریان“

کے حساب سے بہت دیر ہو گئی تھی اور انہیں ابھی مارہ کو اودھر سے لیتا تھا اور بابا جان کا حکم تھا کہ آٹھ بجے تک سب گھر میں موجود ہوں۔ جس میں نوبے تک کی رعایت تھی اور اب تو پارہ بج رہے تھے۔ بابا جان

نمودار حاضر ہوں گے۔ گھر جا کر عمارہ کو فون کر دیتا ہوں کہ شانی کے ساتھ آجائے۔ صبح تک بابا جان کا

قسم ہے کہ تم ہو جائے گا سو وہ اپنے گھر چلے گئے تھے اور ابھی انہوں نے اپنے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ فون کی

کل سنائی دی۔

”عمارہ کا فون ہوگا۔“ وہ مسکرائے اور ریسپور اٹھایا

لیکن دوسری طرف شیردل تھا۔ گھبرایا ہوا سا۔

”فلک شاہ! فوراً! میواہ اسپتال پہنچو۔ حق نواز آئی سی یو میں ہے۔“

”کیا ہوا اسے؟“

”کچھ مت پوچھو ابھی آجاؤ۔ وہ مر رہا ہے اور اس نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“ شیردل رو پڑا تھا۔

”پتا نہیں کب۔۔۔ وقت کم ہے۔ دیر مت کرنا۔“

اور وہ ریسپور کیڈل پر ڈال کر اگلے قدموں باہر نکلے تھے۔ اور تیزی سے اپنے گیٹ سے نکل کر ”الریان“ آئے تھے۔

”عمارہ کہاں ہے؟“ دروازہ کھلتے ہی انہوں نے عنایت بی بی سے پوچھا تھا۔

وہ عمارہ کو حق نواز کے متعلق بتاتے آئے تھے اور یہ کہ آج رات وہ ”الریان“ میں ہی ٹھہر جائے۔ کیا پتا

اسپتال میں ہی رکنا پڑے انہیں۔ وہ حق نواز کو اس حالت میں چھوڑ کر آؤ نہیں سکتے تھے۔

”جی پہلے تو بڑے صاحب کے کمرے میں تھیں لیکن ابھی میں نے دیکھا تھا وہ چھوٹے شاہ جی کے کمرے میں جا رہی تھیں۔“

احسان شاہ کو سب ملازم چھوٹے شاہ جی کہتے تھے۔ وہ تیزی سے احسان شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھے تھے۔ شیردل نے کہا تھا وقت کم ہے۔

دل ہی دل میں حق نوازی کی زندگی کی دعا مانگتے ہوئے انہوں نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

سامنے ہی بیڈ پر مارہ بیٹھی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی

جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی تھی۔ عمارہ کو دیکھنے کے لیے انہوں نے کمرے میں نظر دوڑائی تھی۔

”عمارہ!“ ابھی لفظ ان کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ مارہ بیڈ سے اترتے ہوئے تیز لمحے میں بولی گئی۔

”تم یہاں۔۔۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی اس وقت میرے کمرے میں آنے کی۔“

”سوری۔۔۔ وہ بوکھلا کر چیخے پڑے تھے۔

”میں۔۔۔ وہ۔۔۔ عمارہ۔“

لیکن اس نے انہیں بات مکمل نہیں ہونے دی۔
 ”فلک شاہ! تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟ یہ تم کبھی مجھے زیر کر لو گے۔ جھکا لو گے لیکن محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ پہلے جب تم میرے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتے تو اب تو میں احسان شاہ کی بیوی ہوں۔ میں پہلے بھی اس سے محبت کرتی تھی تب بھی کرتی ہوں۔ تمہیں شرم آتا چاہیے فلک شاہ اب تو کم از کم یہ کہہ۔“
 ”یہ کیا کہہ رہی تھی ماہ۔ وہ ششدر سے ہو کر اسے دیکھنے لگے تھے۔“
 ”میں اس شخص کی بیوی ہوں جو تم پر جان چڑھتا ہے۔ اور تم اس کی بیوی پر اب بھی بڑی نظر رکھتے ہو۔“

تب ہی وادش روم کا دروازہ کھلا تھا اور احسان شاہ باہر نکلے تھے۔ ماہ تیزی سے احسان شاہ کے قریب گئی۔
 ”یہ۔۔۔ یہ فلک شاہ تمہارا دوست تمہارا بھائی۔۔۔ یہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن میں تم سے۔۔۔ اور اب۔۔۔ میں نے سمجھا تھا اب یہ تمہارا خیال کرے گا لیکن۔۔۔“

وہ رک رک کر بول رہی تھی اور احسان شاہ ساکت کھڑا شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم جیسے ٹرائس سے باہر آئے تھے۔
 ”نہیں۔۔۔ شانی۔۔۔ میں۔۔۔ خدا کے لیے مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔ یہ وہ ٹھٹھکے تھے۔“
 ”ماہ بھالی جھوٹ بول رہی ہیں۔ تم جانتے ہو۔“
 ”نہیں شانی! میں نے سچ کہا ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ احسان شاہ کے بازو پر رکھا تھا۔

”بہت بار اس نے مجھ سے اظہار محبت کیا اور۔۔۔“
 ”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ چلائے تھے۔
 ”آہستہ بولو فلک شاہ!“

ماہ کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ ایسی نظروں سے فلک شاہ کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ تم سمجھ رہے تھے کہ میں بھول چکی

ہوں اپنی توہین۔ اپنے ٹھکرائے جانے کی بے عزتی۔
 ”احسان شاہ!“ انہوں نے بے بسی سے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ ”پلیز میری بات سنو۔ ایسا کچھ نہیں ہے جو کچھ ماہ بھابی نے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے۔ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آج میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ شروع سے لے کر آخر تک اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ حق نواز مر رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف جانا ہے لیکن پلیز تم میرا یقین رکھو۔ فلک شاہ مر تو سکتا ہے لیکن۔۔۔“
 ”مجھے کچھ نہیں سننا فلک شاہ! نہ آپ نہ پھر کسی۔“ احسان شاہ کے لہجے میں اتنی ٹھنڈک تھی کہ وہ کانپ گئے۔ ”بہتر ہے کہ آج کے بعد تم اس گھر میں قدم بھی نہ رکھو۔“

احسان شاہ نے رخ موڑ لیا تھا۔ ماہ انہیں تسخیر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ باہر لاؤنج میں کھڑی عنایت بی بی بلند آواز میں انہیں بلارہی تھی۔
 ”مونی صاحب! آپ کا فون ہے کسی سیر دل کا۔“ اور وہ جو احسان کی طرف بڑھنے لگے تھے وہیں ہی رک گئے۔

”مجھ وہ احسان شاہ سے بات کر لیں گے۔ وہ احسان شاہ ہے۔ ان کا دوست ان کا یار ان کا دل۔۔۔ وہ صبح اس سے ہر بات کر لیں گے۔ ایک ایک بات بتائیں گے تو وہ ضرور ان کی بات سننے گا بھی اور مجھے گا بھی وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے اور تیزی سے لاؤنج میں رکے فون کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے سائیز پر پڑا ریسیور اٹھایا۔ اس سے ٹول ٹول کی آواز آرہی تھی۔ انہوں نے ریسیور واپس کر ڈیٹل پر رکھا اور عنایت بی بی کی طرف دیکھا۔ جو وہاں لاؤنج میں ایک طرف بیٹھی نہ جانے کیا کر رہی تھی۔
 ”کچھ کہا تھا سیر دل نے؟“

”بس آپ کا پوچھا تھا۔ آپ ادھر تو نہیں ہیں اور کہا تھا۔ وہ جارہا ہے جلدی پنچو۔“
 تب ہی ان کی نظر بابا جان پر پڑی تھی۔ غالباً جب عنایت بی بی نے بلند آواز میں انہیں بلایا تھا تو وہ آواز

کر اپنے بیدار روم سے باہر نکلے تھے اور دروازے میں کھڑے تھے اور انہوں نے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا۔
 ”یہ تم آؤ گی آؤ گی رات تک کہاں آؤ گے گریباں کرتے رہتے ہو؟“ اسے اپنی طرف دیکھا پا کر وہ الرحمن شاہ کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔
 ”یہ گھر ہے کوئی سرائے نہیں ہے اور نہ ہی اریان کی روایت ہے آؤ گی رات کو گھر میں گھسنے۔“

وہ حیران ہوئے تھے۔ بابا جان کو انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یوں غصے سے بولتے ہوئے دیکھا تھا۔
 ”بابا جان!“ وہ معذرت کرنا چاہتے تھے اور انہیں بتانا چاہتے تھے کہ حق نواز کی وجہ سے انہیں دیر ہوئی لیکن عبدالرحمن پاشا نے ان کی بات سننے بغیر پھر کہا تھا۔

”ہزار دفعہ سمجھایا ہے۔ منع کیا ہے سیاست سے باز آؤ۔ یہ کچھ نہیں دے گی تمہیں۔ لیکن آپ کل کو پولیس کھڑی ہو کر دروازے پر گرفتار کرنے۔ تمہارا دوست گرفتار ہوا ہے تو تمہاری باری بھی آئے گی۔ اگر تم نے یہی کچھ کرنا ہے تو بہتر ہے کہ الریان مت آؤ۔“
 ”بابا جان!“ ان کے پیچھے کھڑی عمارہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

”بابا جان صبح کہہ رہے ہیں۔“ احسان شاہ بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔
 ”آج کے بعد الریان میں قدم مت رکھنا فلک شاہ!“

انہوں نے مڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ اگر انہیں حق نواز کی طرف جانے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ سب کچھ واضح کر کے ہی احسان شاہ کے کمرے سے نکلے لیکن تقدیر میں ایسا ہونا نہیں لکھا تھا۔
 لاؤنج میں رکھے فون کی ٹھنڈی بجنے لگی تھی۔ عنایت بی بی کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ٹھنڈی بند ہو چکی تھی۔

”شاید سیر دل کا فون۔۔۔ حق نواز۔“ ان کا دل تیزی سے

سے دھڑکا تھا۔
 ”من لیا ہے نام نے فلک شاہ کہ آج کے بعد یہاں مت آنا۔ قدم بھی نہ رکھنا یہاں۔“
 حق نواز مر رہا تھا اور یہاں یہ سب شروع ہو گیا تھا۔ وہ یکدم بھڑکے تھے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ آج کے بعد اگر میں نے یا میری بیوی نے الریان میں قدم رکھا تو میری بیوی مجھ پر تین طلاقیں سے حرام ہے۔“

انہیں بابا جان کی بات پر غصہ نہیں آیا تھا۔ انہیں احسان شاہ کے شک نے مار دیا تھا۔

وہ تیر کی طرح بابا جان کے ساتھ کھڑی عمارہ کی طرف بڑھے تھے جو ایک کو کندھے سے لگائے کھڑی کانپ رہی تھیں اور پھر عمارہ کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھے تھے اور کھڑی کا بھاری دروازہ ایک ہاتھ سے کھولتے اور ایک ہاتھ سے عمارہ کا ہاتھ تھامتے وہ باہر نکل گئے تھے اس تمام عرصے میں انہوں نے عمارہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جو فرنٹ سیٹ پر ایک کو گود میں لیے بیٹھی مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے ایک نظر عمارہ کی طرف دیکھا تھا۔

”ہم اسپتال جا رہے ہیں۔“
 انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا اور ہونٹ بھیجنے گاڑی چلانے لگے تھے۔ ان کے ماتھے کی رگیں پھوٹی ہوئی تھیں اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ انہیں کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر آئے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عمارہ رو رہی ہے لیکن اسپتال تک انہوں نے پھر عمارہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اسپتال کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ اترے اور عمارہ کو وہیں بیٹھنے کی تاکید کر کے وہ تیزی سے اسپتال کی عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی انہیں سیر دل نظر آیا تھا۔

”سیر دل!“ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔
 ”تم نے اتنی دیر کر دی فلک۔۔۔ اور وہ چلا گیا۔“ شیر دل ان کے گلے لگ گیا تھا۔

”چلا گیا ان کا انتظار کیے بغیر۔“

”اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تھی اور دونوں بار تہیں بلانے کی استدعا کی تھی۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔“ شیردل کہہ رہا تھا اور ان کا دل غاسمیں غاسمیں کر رہا تھا۔ سارا راستہ وہ سوچتے آئے تھے کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ شاید حق نواز اور ان کے خدشے صحیح نکلے تھے۔ شیردل انہیں وہیں چھوڑ کر ایمبولینس کا پتا کرنے چلا گیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے اندر کارڈیور میں آئے تھے۔ وہاں حق نواز کے والد تھے۔ اس کی بہن اور ماں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی جیسے ایک کھرم سا اٹھا تھا۔ وہ حق نواز کے والد کے گلے لگ کر بہنوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اندر حق نواز کو دیکھنے چلے گئے تھے۔ اس کے پاس اس کا کوئی دوست تھا۔ انہوں نے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ آنکھیں موندے وہ بہت سکون سے سو رہا تھا۔

حق نواز جس نے پاکستان بننے نہیں دیکھا تھا لیکن جو کہتا تھا کہ ”یہ ملک اپنی آسانی سے نہیں بنا تھا اور یہ لوگ جو اس ملک کو لوٹ کر کھارہے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو الگ ملک چاہتے تھے۔ ورنہ یہ ہندو ذات ترک کر دیتے۔ علیحدہ ملک چاہنے والے گزر گئے۔ اللہ انہیں اپنی رحمت میں چھپائے۔ یہ لوگ ان شہیدوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ جنہوں نے اپنا آج اس قوم کے کل کے لیے قربان کر دیا تھا۔ ان شہیدوں کے مقبروں پر خاک اڑتی ہے۔ ان کے بچے بھوکے اور بے آسرا ہیں۔ ان کی بیواؤں اس معاشرے کا زہر جرعہ جرعہ بنی رہی ہیں۔ اس قوم نے بے حیا اور بے غیرت طبقے کو پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ ایسا طبقہ جس کی عفت و عصمت کو روئے کاغذ پر لکھی ہوئی ہوتی ہے جہاں جو چاہے دھتکار کر دے۔ مجھے پاکستانی قوم سے گلہ نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اوروں کی طرح ان پر بھی کوئی دوسری قوم مسلط نہ کر دی جائے۔ ان کی اجتماعی برسرِ دریافت نہ ہوتی پھر۔“

ابھی چند دن پہلے کی ہی تو بات تھی جب وہ کہہ رہا تھا۔

”فلک شاہ! میں سوچ رہا ہوں کہیں اور چلا جاؤں کسی اور ملک میں۔“
”کیوں اتنے ناپوس ہو گئے ہو۔“
”پتا نہیں۔“
”ممت جاؤ اپنے پاکستان کو چھوڑ کر۔“ انہوں نے کیا تھا۔
”یہ پاکستان میرا ہے۔ اس میں بسنے والے ان بچھوڑے اور سانپوں کا نہیں۔ میں اگر پاکستان میں رہوں تو بھی میری ملکیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں پاکستان سے بہت محبت کرتا ہوں فلک شاہ! لیکن میں یہاں رہ کر یہ اذیتیں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“
اور وہ چلا گیا تھا۔

وہ اگلے قدموں باہر نکل آئے تھے۔ ان میں اس کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔
”بیٹا! بچوں کو اور اس کی والدہ کو گھر لے جاؤ۔ ہم اسے کچھ دیر میں آتے ہیں۔“
وہ سب کو لے کر گاڑی تک آئے تھے تو عمارہ اب بھی رو رہی تھیں۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
”عمو! حق نواز چلا گیا۔“ عمارہ نے نظریں اٹھائیں۔ سرخ انگارہ آنکھیں، بھیگی پلکیں۔ وہ نظریں چرا کر پیچھے دیکھنے لگے تھے۔

حق نواز کی والدہ اور بہنوں کی آنکھیں اب بھی آنسو بہا رہی تھیں۔ انہوں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے عمارہ کی طرف دیکھا۔
”ہم حق نواز کے گھر جا رہے ہیں۔“

عمارہ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگیں۔ اور حق نواز کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ”الریان“ میں کیا ہوا تھا وہ بھول چکے تھے یا یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جگر کی اذیتوں تک ان کی ذہنی کیفیت یہی رہی تھی۔ حق نواز کے گھر کے ڈرائیونگ روم میں کابینٹ پر بیٹھے لوگوں کو آتے اور

حق نواز کے والد سے افسوس کرتے دیکھتے رہے۔ شیر بھی کبھی اندر آکر ماموں کو تسلی دیتا۔ ان کے گلے کر دیتا اور پھر چلا جاتا۔ وہ رشتہ داروں کو اطلاع دے اور دوسرے انتظامات میں مصروف تھا۔ گھر کے درمیان حصے سے کبھی کبھی آہ و بکا کی آواز آتی تو وہ روتے۔ انہیں اس وقت شیردل کے ساتھ ہونا پسند تھا لیکن وہ یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے جسم سے کسی نے جان نکال دی ہو۔ آتے جاتے شیردل نے دو بار بار انہیں دیکھا تھا پھر ایک بار وہ حق نواز کے والد کے کچھ پوچھ کر اس کے قریب آیا تھا۔
”فلک! اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے تھے۔ تم ٹھیک تو ہونا۔“

”ہاں۔“
تب شیردل نے یکدم دونوں بازو پھیلا دیے تھے اور اس کے سینے سے لگے رو رہے تھے۔ رات سے اب تک وہ اس طرح کھل کر نہیں روئے تھے۔ بہت دیر تک وہ بوٹی شیردل کے گلے سے لگے رہے تھے پھر شیردل نے ان کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے انہیں الگ کیا۔

”فلک شاہ! ابھی کچھ دیر کے لیے گھر جانا چاہتی ہیں۔ بچے کے کچھ کپڑے اور ضرورت کا کچھ دوسرا سامان لانا ہے۔“

وہ بنا کچھ کے آنسو پونچھتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد عمارہ بھی ایک کواٹھائے آگئی تھیں۔ وہ بے حد جھکی جھکی تھیں اور ہڈیوں پر لگی تھیں۔ خاموشی سے انہوں نے ایک کواٹھائے کو ان کی گود سے لیا تھا۔ گھر تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر کے وہ اترے تھے اور ان کی نظریں بے اختیار ”الریان“ کی طرف اٹھی تھیں۔

”الریان“ کے گیٹ کے دونوں اطراف لیپ جل رہے تھے۔ پینل کے یہ لیپ انہیں پچپن سے ہی بہت پسند تھے۔ یکدم انہوں نے نظریں ہٹا کر عمارہ کی طرف دیکھا تھا۔ جو نگاہیں جھکائے کھڑی تھیں۔ ان کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چھوئی تھی لیکن پھر بھی وہ

اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔
”تم اگر گھر ٹھہرنا چاہو تو رک جاؤ۔ میں جنازے کے بعد چکر لگاتا ہوں۔“ انہوں نے عمارہ سے کہا تھا۔ عمارہ خوفزدہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھیں اور انہوں نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔
”مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔“
”الریان چھوڑ دیتا ہوں۔“ وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔“
وہ ایک بار پھر حق نواز کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی باہر نکالتے ہوئے ان کی نظریں ”الریان“ کے گیٹ کی طرف اٹھی تھیں۔ اس وقت بابا جان جگر کی نماز کے لیے مسجد جاتے تھے لیکن آج گیٹ بند تھا شاید وہ چلے گئے تھے یا شاید ابھی نہیں گئے تھے۔ انہوں نے بے دھیانی سے سوچا تھا اور پھر حق نواز کے متعلق سوچنے لگے تھے اس کے جنازے کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کب اٹھایا جائے گا۔

کیونکہ اس کی جس بہن کی شادی ہوئی تھی وہ دینی میں تھی اور رات سے ہی وہ ایرپورٹ پر بیٹھی تھی اور پتا نہیں اسے کب فلائٹ ملی تھی۔ ملی بھی تھی یا نہیں

کچھ دیر بعد وہ پھر حق نواز کے گھر کے سامنے تھے۔ پچھلی گلی میں گاڑی پارک کر کے وہ عمارہ کے ساتھ اندر آئے تھے۔ عمارہ اندر چلی گئی تھیں اور وہ ایک بار پھر حق نواز کے والد کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔ محلے کے چند لڑکے وہاں موجود لوگوں میں چائے تقسیم کرنے لگے تھے۔ ان کا سر درد سے پھٹ رہا تھا لیکن انہوں نے چائے نہیں لی۔ کچھ دیر بعد اور لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ جنازہ عصر کے بعد مونا کے آنے کے بعد رکھا گیا تھا۔ حق نواز کو اپنی اس بہن سے بڑی محبت تھی جو عمر میں اس سے صرف دو سال چھوٹی تھی اور اس کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ اکثر جذباتی ہو جاتا تھا۔ آنے والوں میں کچھ اجنبی چہرے بھی تھے۔

انجانے سے لوگ ادھر ادھر متحس نظروں سے تکتے ہوئے ایک دوسرے ان سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی اور حق نوازی موت کے متعلق پوچھا تھا کہ کیسے ہوئی۔ وہ خود نہیں جانتے تھے تو کیا کہتے۔ جنازے میں بھی کچھ اجنبی چہرے تھے۔ شیردل نے بھی پوچھا تھا کہ کیا وہ انہیں جانتے ہیں اور کیا وہ حق نواز کے دوست ہیں۔ انہوں نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”حق نواز مجھے اس خازن میں اکیلا چھوڑ کر کیوں چل دیے دوست۔“

بہر پٹی والے ہوئے انہوں نے سرگوشی کی تھی اور پھر انہیں اپنے اوپر کئی جھپتی نظروں کا احساس ہوا تھا اور وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اور یہ نظریں پورے جنازے میں انہیں اپنے اوپر اٹھتی محسوس ہوتی رہی تھیں اور پھر حق نواز کے گھر سے فارغ ہوتے کیا رہنمائی گئے تھے اور جب وہ گھر آکر اپنے پیڑ پر لیٹے اور عمارہ ایک کوچہ پر کوا کے بیڑ روم میں آئیں تو باہر بج رہے تھے۔ ایک کوا اس کی کلاں میں لٹا کر عمارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ ساکت جیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”عمو! بہت تھک گئی ہوگی۔ سو جاؤ۔“ انہوں نے بوجھل پلکیں اٹھا کر عمارہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر یونہی انہیں دیکھتے رہے تھے اور وہ جو کل رات سے حق نواز کے دکھ میں سب کچھ بھولے ہوئے تھے یکدم سب کچھ پوری جزئیات کے ساتھ انہیں یاد آگیا تھا۔ احسان شاہ نے کیا کیا کہا تھا۔ ایک ایک لفظ دل کو کانٹے لگا تھا۔

”عمو! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا۔ بابا جان اور شانی نے ایسا کیوں کیا ہمارے ساتھ؟“

بہت سارے آنسوؤں نے ان کے حلق میں اکٹھے ہو کر ان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

”انہوں نے تو جو کچھ کہا۔ کہا لیکن آپ نے جو کچھ کہا وہ۔ آپ نے ایسا کیوں کہا۔ کیوں آپ نے اپنے لیے اور میرے لیے ”الریان“ کو شمر موعہ بنادیا۔“

عمارہ کے آنسو ان کے رخساروں پر پھسل رہے

تھے اور انہیں پہلی بار اپنے الفاظ کی سنگینی کا ادراک ہوا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمارہ کو دیکھنے لگے۔

اتنے غصے میں کیوں آگئے تھے۔

انہوں نے بلا سوچے سمجھے یہ کیا منہ سے نکال دیا تھا۔ دکھ بڑا تھا۔ غم بھی شدید تھا۔ جان سے زیادہ عزیز دوست نے ان پر شک کیا تھا۔ انہیں الریان میں آئندہ قدم نہ رکھنے کو کہا تھا لیکن انہوں نے ایسے الفاظ۔۔۔

بچپن میں ان کا خانہ سالانہ اکثر بیوی سے لڑتے جھگڑتے ہوئے ایسے الفاظ بولتا تھا۔ تم وہاں کیوں تو تم مجھ پر تین طلاق سے حرام۔ تم نے یہ کیا تو۔۔۔

دادا جان انہیں ایسا کہنے پر کتنا ڈانٹتے اور سمجھاتے تھے اور شاید بچپن میں سنے جانے والے یہ الفاظ ان کے دل کے کسی کونے کھد رے میں چسے ہوئے تھے جو غصے کی حالت میں منہ سے پھسل گئے تھے۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ بچوں کے سامنے گلی نہ دی جائے نہ کوئی غلط بات کہی جائے۔

”اب۔۔۔۔۔ اب کیا ہو گا عمو؟“ وہ عمارہ کا ہاتھ پکڑے بے بسی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ عمارہ کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

”کیا اب ہم کبھی ”الریان“ میں قدم نہیں رکھ سکیں گے۔“

یہ احساس اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ پتا نہیں کتنی دیر وہ دونوں روئے تھے۔ چپ ہوئے ایک دوسرے کو سلی دی پھر رونے لگے تھے۔ رات کے دو بجے وہ اٹھے تھے اور عمارہ سے کہا تھا۔ ”ایک کاسمان رکھ لو بیگ میں۔“

عمارہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ہنا کچھ پوچھے

داوی جان نہیں تھیں۔ دادا جان بھی نہیں تھے۔ کسی سے اپنا دکھ کہتے۔ کون انہیں اس دکھ سے نکلنے کی راہ دکھاتا۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تب وہ عمارہ کو لے کر رات کے دو بجے شیردل کے گھر پہنچے

تھے۔ شیردل بھی رات دیر سے ہی گھر آیا تھا اور اب تک جاگ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی حق نوازی کی ہی جی کر رہے تھے جب بیل ہوئی تھی۔ رات کے دو بجے عمارہ اور فلک شاہ کو دیکھ کر وہ حیران تو ہوا تھا لیکن ان نے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ عمارہ اور فلک کی آنکھیں سرخ و شہد تھیں گریہ سے سوجا ہوا تھا۔ ایک نظر ان پر کر وہ انہیں گیٹ روم میں لے آیا تھا۔ اگر رات کے اس پہر وہ آئے تھے تو ضرور کوئی اہم بات ہوگی یہ شیردل سمجھ سکتا تھا لیکن اس نے کچھ پوچھا نہیں تھا۔

”تم اور بھابھی آرام کرو۔ میں گرم دودھ اور سکون کی دلی بھجوانا ہوں۔ صبح بات کریں گے۔“

”نہیں شیردل!“ انہوں نے شیردل کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ پلیر۔“ وہ سکے تھے۔

”مہال رہو میرے پاس ورنہ یہ دیواریں مجھے پیس ڈالیں گی میرا دل پھٹ جائے گا۔“

”کیا ہو گیا ہے فلک شاہ؟“

شیردل نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

”میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ تم ڈسٹرب لگ رہے ہو۔ ایک برس سکون فینڈ لے کر اٹھو گے تو آرام سے بات کر لیں گے لیکن خیر۔۔۔۔۔“

انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ وہ عمارہ اور ایک کو اندر لے جائیں اور گرم دودھ کے ساتھ انہیں سکون کی کوئی ٹیبلٹ دے دیں۔

عمارہ اندر چلی گئیں تو ایک بار پھر شیردل نے ان سے کہا تھا۔

”فلک! تم آرام کرتے صبح تک کچھ سنبھل جاتے۔“

”صبح۔۔۔۔۔“ انہوں نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر شیردل کو دیکھا۔ ”میری زندگی میں اب کیا کوئی ج ہوگی۔ میں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ میرے غصے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا دادا جان کہتے تھے غصہ نہ کیا کر موی یہ

غصہ مجھے کہیں نقصان نہ پہنچا دے اور ابھی دادا جان کو اس دنیا سے گئے چند ماہ بھی نہیں ہوئے اور میں نے اپنا کتنا بڑا نقصان کر لیا۔“

شیردل خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا۔

”میں بچپن میں ایسا نہیں تھا شیردل! لیکن جب ما مجھے اپنے ساتھ زبردستی لے گئیں تو میرے اندر بہت سارا غصہ جمع ہو گیا۔ میں کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لیے فیوڈ کی طرح اس کی دیکھا دیکھی چیزیں توڑ کر اور چلا چلا کر بول کے غصہ نکالنے لگا۔ پھر جب میں واپس دادا جان کے پاس آیا تو تب بھی چھوٹی سی بات پر آپ سے باہر ہو جاتا تھا۔ تب بابا جان مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے مہال پور میں نورو سرجن تھے ڈاکٹر فرجام انہوں نے مجھے میڈیسن بھی دی تھیں۔“

شیردل نے انہیں ٹوکا نہیں تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کسی بڑے دکھ سے گزر رہے ہیں۔

”ماہ نے اپنی محبت کے ٹھکانے کا بدلہ لے لیا شیر دل! اس نے مجھ سے سب کو چھین لیا۔ الریان کو۔۔۔۔۔ اور احسان شاہ کو۔۔۔۔۔“

شیردل نے بہت تحمل سے ان کی ساری باتیں سنی تھیں۔

”میں بہت خود غرض ہوں نا شیردل۔۔۔۔۔! تم آج رات اپنے ناموں زاد بھائی کو دفنا کر آئے ہو اور میں اپنا دکھ لے کر تمہارے پاس آگیا لیکن میں بھی کہاں جاتا۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے شیردل۔۔۔۔۔ میرے تو دادا جان کے بعد سارے رشتے الریان سے ہی تھے۔“

”اس اوکے یار!“ شیردل نے ان کا ہاتھ تھپتھا کر انہیں تسلی دی تھی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ صبح دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”تم کو ابھی دو گے نا شیردل! احسان شاہ کے سامنے، میں نے تمہیں سب کچھ بتایا تھا نا ماہ کے متعلق۔ وہ مجھ سے بہت بدگمان ہو گیا ہے۔“

اور شیردل نے بمشکل انہیں نیند کی دلی تھی اور پھر اگلے تین دن تک وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے

بھابھی کی بھی خبر نہیں لی۔“

”کیسے اس کا سامنا کروں شیردل۔۔۔ کوئی حل کوئی
ترکیب بتاؤ۔۔۔ تو میں جا کر بابا جان کے پاؤں پکڑ کر ان
سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ انہیں سب بتا دوں گا۔ شانی
میری بات کا یقین نہ کرے لیکن وہ میرے بات کا یقین
کر لیں گے۔ مروہ پھپھو میری گواہی دیں گی۔ وہ تو سب
جاتی ہیں۔ میں کیوں انہیں بھول گیا تھا۔ میں ابھی فون
کر رہا ہوں انہیں۔“

”وہ مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا فلک شاہ! لیکن جو
غضب تم دھاکے ہو اس کا کیا ہو گا۔۔۔ میرے علم کے
مطابق تم اور عمارہ بھابھی اب بھی الریان میں نہیں جا
سکتے ورنہ۔۔۔“

اور وہ جیسے یکدم ڈھم گئے تھے اور شیردل کا ہاتھ
تھامے وہ کسی ننھے بچے کی طرح رو رہے تھے تب شیر
دل انہیں ساتھ لے کر کئی علاقے پاس گیا۔ ان دنوں
شاہی مسجد میں مفتی اعظم مولانا قاسم عیسیٰ آئے ہوئے
تھے۔ وہ شیردل کے ساتھ ان سے بھی ملے تھے اور
ساری صورت حال بتائی تھی۔ ہاشمی صاحب نے بہت
توجہ سے ان کی بات سنی تھی اور کہا تھا۔

”جو کچھ آپ نے کہا ہے اس صورت میں اگر آپ
دونوں ”الریان“ میں قدم رکھیں گے تو ہمارے خفی
فقہ کی رو سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ شرعی اصطلاح
میں اس مشروط طلاق کو طلاق مغضظہ کہا جاتا ہے جو کہ
واقع ہو جاتی ہے۔ نہ رجوع کر سکتے ہیں نہ نکاح دوبارہ
ہو سکتا ہے۔“

”مفتی صاحب پلہ! کسی فقہ میں کوئی گنجائش
کوئی رعایت۔۔۔ وہ گزر گئے تھے۔“

”آپ معلوم کر سکتے ہیں۔ حیرت ہے آپ نے اتنے
ایجوکیٹڈ اور سمجھ دار ہو کر اس طرح بات کی ہے۔“
”بس غصے میں پتا ہی نہیں چلا۔“

”اس لیے تو غصے کو حرام کیا گیا ہے۔ یہ جو مسئلہ
آپ لے کر آئے ہیں۔ ہمارے نچلے طبقے اور بعض
اوقات نچلے متوسط طبقے میں اس طرح کی باتیں عام

تھے۔ وہیں گیسٹ روم میں انہوں نے جیسے خود کو مقید
کر لیا تھا۔ عمارہ کیسی تھی۔ ایک کا کیا حال تھا انہوں
نے پوچھا تک نہیں تھا۔ وہ عمارہ سے نظریں نہیں ملا
سکتے تھے۔ انہوں نے عمارہ سے ”الریان“ چھین لیا
تھا۔ یہاں تک کہ وہ حق نواز کے قتل میں بھی نہیں گئے
تھے۔ شیردل نے واپس آ کر بتایا تھا۔ کئی راویں سا بھی
جنہیں حق نواز کے متعلق اب پتا چلا تھا۔ قتل والے
دن مسجد میں آئے تھے۔ ان میں کچھ ناموس اور اجنبی
چرے بھی تھے لیکن یہ وہ لوگ نہیں تھے جو جنازے
میں شامل ہوئے تھے۔ ایک نے تمہارے متعلق پوچھا
بھی تھا۔ اچھائی ہوا تم نہیں گئے۔“

شیردل کچھ الجھا ہوا تھا تب پہلی بار انہوں نے حق
نواز کے متعلق پوچھا تھا۔ کہاں تھا وہ کیسے ملا کس نے
اسے اس حال تک پہنچایا۔

”معلوم نہیں۔۔۔“ شیردل کو علم نہ تھا۔ ”کچھ
لوگ اسے اسپتال میں چھوڑ گئے تھے۔ وہاں ایک وارڈ
ہوئے اسے پہنچاتا تھا۔ اسی کے محلے کا تھا اس نے
ماموں کو فون کر کے بتایا تھا۔“

”اور حق نواز نے کچھ نہیں بتایا؟“ انہوں نے پوچھا
تھا۔

”نہیں۔۔۔ اس نے صرف تمہارا پوچھا تھا اور تم
سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مجھے لگتا ہے وہ
تمہیں کوئی خاص بات بتانا چاہتا تھا۔ یا کسی سے خبردار
کرنا چاہتا تھا۔“

اور آج تک یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ کن لوگوں نے
اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ بس کچھ شکوک تھے وہم
تھے جن کا اظہار کرنے سے سب ہی ڈرتے تھے۔

کاش! اس رات وہ سب نہ ہوتا اور وہ حق نواز سے
مل سکتے۔۔۔ پھر وہ اس کے قاتلوں کو کبھی معاف نہ
کرتے۔

”وقت بدل چکا ہے فلک! سرعام کوئی تبصرہ مت
کرنا۔ بہتر ہے کہ احتیاط کرو۔“ انہوں نے سر ہلا دیا
تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔
”اپنے آپ کو سنبھالو فلک شاہ! تم نے تین دن سے

معمول سمجھ کر کہہ دی جاتی ہیں۔ لوگ نتائج کی پروا نہیں کرتے۔ اکثر مردیہ یوں سے کہہ دیتے ہیں تم بہن کے گھر گئیں تو طلاق۔ تم نے فلاں سے بات کی تو طلاق۔ کئی گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا تو اس طرح کی باتیں سننے میں آئیں کہ میرے بھائی نے طلاقیں ڈالی ہوئی ہیں بھابھی میکے نہیں جاسکتی۔ اور پھر صلہ ہو جاتی ہے گھروں میں آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس نے تو طلاقیں ڈالی ہوئی تھیں۔ یہ سب کم علمی جمالت اور مذہب سے نا آشنائی ہے۔ بلکہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میں نے کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی بات بات پر ”رن طلاق“ کہتے سنا ہے۔

مفتی صاحب افرنگی سے کہہ رہے تھے اور وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شرمندہ اور دل گرفتہ۔ وہ بھاری دل کے ساتھ شیر دل کے گھر آئے تو تین دن کے بعد عمارہ کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے۔ ”عمو! مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت ظلم کیا تم پر خود پر۔ لیکن اگر تم جاؤ تو الریان چلی جاؤ۔ ایک کو بھی لے جاؤ۔ میں مجھوں گا یہ میری غلطی کی سزا ہے۔ میں تمہارے اور ایک کے بغیر جینے کی کوشش کروں گا۔ جی۔ نہ کا تو۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے اور ان کے آنسو ان کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ عمارہ وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ”یہ۔۔۔ یہ کیسی باتیں آپ کر رہے ہیں۔“ ”اور کیسی باتیں کروں عمو۔ میری وجہ سے ”الریان“ تم سے چھوٹ جائے یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔“

”کوئی کفارہ نہ ہوگا؟“

”نہیں کوئی کفارہ نہیں۔ کوئی رجوع نہیں۔“

عمارہ نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔ ”غلطی ہوئی ہے آپ سے مانا۔“ ”الریان“ کے

دروازے ہم پر بند ہوئے ہیں۔ ”الریان“ کیا ہے موی اینٹوں اور پتھروں کی ایک چار دیواری ہی ہے نہ۔ ہمارے گھر کے دروازے تو کھلے ہیں۔ بابا جان اہل جان سب ہمارے گھر تو آسکتے ہیں نا۔ آپ نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا نا کہ۔“

”عمو! وہ آئیں گے ہمارے گھر؟“ انہوں نے بچوں کی طرح پوچھا تھا۔

”کیوں نہیں آئیں گے۔ میں فون کروں گی بابا جان کو۔ وہ جاننے ہیں آپ کے غصے کو بھی اور۔۔۔“ ”وہ مجھ سے بہت ناراض تھے عمو۔ پتا نہیں کیوں۔“

”ہاں پتا نہیں مانہ بھابھی نے انہیں کیا کہا تھا کہ وہ پریشان ہو گئے تھے آپ کے لیے۔ وہ مجھے تھے کہ آپ کوئی جلوس وغیرہ نکال رہے ہیں۔ کہیں گرفتار نہ ہو گئے ہوں اور مانہ بھابھی نے خواہ مخواہ انہیں غصہ دلایا تھا۔ وہ پریشانی میں ناراضی کا اظہار کر گئے تھے لیکن احسان بھائی۔۔۔ مجھے ان کی سمجھ میں نہیں آئی وہ اس طرح آپ سے کیوں ناراض ہو رہے تھے۔ وہ کیوں کہہ رہے تھے کہ آپ کو کہ آپ ”الریان“ سے نکل جائیں۔“

”عمو! ان کا سر جھک گیا تھا۔ وہ عمارہ کو نہیں بتا سکتے تھے کہ احسان شاہ ان پر رشک کر رہا تھا۔ وہ یہ بتا کر پھر عمارہ سے نظرس نہیں ملا سکتے تھے۔

عمارہ نے خود ہی اندازہ لگایا تھا۔ ”ضرور مانہ بھابی نے بھڑکایا ہوگا انہیں۔۔۔ پتا نہیں انہیں مجھ سے اور آپ سے اتنی جڑ کیوں ہے۔“

”پڑ نہیں عمو! نفرت۔“ ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

”ہاں شاید۔“ عمارہ نے کہا تھا اور اس روز اتنے دنوں بعد وہ ذرا سا پرسکون ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک ”الریان“ محض اینٹوں کی چار دیواری نہیں تھا۔ عمارہ کے نزدیک بھی نہیں تھا لیکن اگر ”الریان“ کے پاسی ان سے نہ بچھڑتے تو وہ ”الریان“ کی جدائی برداشت کر لیتے لیکن ”الریان“ کے پاسیوں نے ان سے ناتہ توڑ

ایر پورٹ وہ لے چلیں گے آپ کو اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو۔“

”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ وہاں ایر پورٹ پر بابا جان کو دیکھ کر کیسے خود پر قابو پا سکیں گے کیسے ضبط کر سکیں گے۔

”انجی بیٹا! میں کچھ دیر آرام کروں گا مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔۔۔“

وہ بے حد تھکن محسوس کر رہے تھے۔ ماضی کی گلیوں میں چکراتے بہت سی تکلیف دہ یادوں نے انہیں ہلحال سا کر دیا تھا۔

”جی بابا۔۔۔! انجی نے ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا۔ ”آپ کے لیے اور چائے بناؤں بابا؟“

انہیں اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے انجمن نے پوچھا تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور اپنے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موندتے ہوئے وہ ایک بار پھر ماضی میں گھوم گئے تھے۔

حسن رضائے فخر کی نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”یا اللہ! وہ جہاں بھی ہے جس جگہ بھی ہے اسے خیریت سے رکھ اور اگر وہ مرتد ہو گیا ہے تو اسے توبہ کی توفیق عطا کر اور اس کا دل پھیر دے مولا!“

ایک آنسو ان کے پھیلے ہاتھوں پر گرا۔ ”یا اللہ! انجے تو اپنے بندے کے آنسوؤں سے پیار ہے۔ میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لے اسے مرتد ہونے سے بچالے اسے ان آنسوؤں سے آشنا کر جو تیرے ڈر اور خوف سے بہتے ہیں۔“

اب آنسوؤں سے ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ ”یا اللہ! اب تو میرے شب و روز کا گواہ ہے۔ تو جانتا ہے میں ایک دنیا دار آدمی ہوں لیکن پھر بھی میرا دل تو ہر مسلمان کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے بھرا ہے۔ سیرا کہتی ہے مجھے اسے صفائی کا موجب دینا چاہیے تھا۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا وہ نہ

لیا تھا۔ یہ دکھ انہیں اور عمارہ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ عمارہ نے شیر دل کے گھر سے دو تین بار فون کیا تھا لیکن بابا جان اہل جان کسی سے اس کی بات نہیں ہو سکی تھی۔

انہوں نے خود بھی ایک بار فون کیا تھا احسان کے آفس میں۔ احسان نے ان کی آواز سننے ہی فون بند کر دیا تھا۔ وہ اس کے آفس گئے تھے۔ اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ کاش مصطفیٰ بھائی یہاں ہوتے یا مردہ بچھو ہی ہوتیں۔ وہ ان دنوں اسے شوہر کے ساتھ سعودیہ میں تھیں۔ تب بے حد دل گرفتہ سا ہو کر انہوں نے بہاول پور جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ شیر دل کی پوسٹنگ راولپنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے دس پندرہ دن تک چلے جانا تھا۔ یوں بھی وہ اس کے گھر نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنے گھر جانا ہی تھا اور اپنے گھر جانا اور وہاں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔

”عمو! اس شہر میں رہ کر ”الریان“ سے دور رہنے کا عذاب جھیلنا بہت مشکل ہے۔ وہاں اس گھر میں آتے جاتے الریان پر نظر پڑے گی تو دل پھٹے گا۔ کیسے الریان کو اپنے لیے انجی ہوتا دیکھو کی عمارہ! چلو بہاول پور واپس جاتے ہیں۔“ اور یوں ایک رات وہ شیر دل کے ساتھ جاکر سارا مسلمان لے آئے اور ملک صاحب کو گھر کی چابی دی اور آخری بار الریان کے گیٹ پر نظر ڈال کر بہاول پور آگئے تھے۔

”بابا آپ ابھی تک یہیں ہیں۔“ انجی کی آواز پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ”آپ نے جانے بھی نہیں لی۔ ٹھنڈی بخ ہو گئی ہے۔“

”ہاں کچھ سوچنے لگا تھا۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

”ضرور بابا جان کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔“ انجی نے اندازہ لگایا تو ان کے لبوں پر چھکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جو او کا فون آیا تھا پوچھ رہے تھے آپ چلیں گے

سمجھتا پھر چاہے کرتا۔

زیدہ زبان سے کچھ نہیں کہتی لیکن اس کی آنکھیں ہی سب کہتی ہیں۔ بلکہ اس کی آنکھیں تو جگہ بھی کرتی ہیں ناراضی بھی دکھاتی ہیں لیکن میں کیا کرتا۔ مجھے لگا تھا جیسے وہ مسئلہ کذاب کا سا بھی ہے اور میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی جو مسئلہ کذاب کی سرکوبی کے لیے نکلی تھی اور اس ادنیٰ سپاہی کے سامنے صرف مسئلہ کذاب نہیں تھا اس کے سامنے بھی تھے اور وہ بھی سرخروئی کا تاج سر پر پہن کر عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اے اللہ! میں ایک کمزور انسان ہوں۔ اولاد کی محبت سے مجبور باپ۔ تو نے خود ہی تو سورۃ انفال میں فرمایا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد سب فتنہ ہیں۔

یا اللہ! مجھے اس طرح نہ آزما۔ اسے سیدھا راستہ دکھا۔ توبہ کا راستہ۔ میں کسی آزمائش کے قابل نہیں ہوں میرے اللہ!۔

وہ کچھ دیر بونی گڑگڑا کر دعا مانگتے رہے پھر چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چہرہ ابھی تک گھلا تھا۔ انہوں نے جیب سے روپاں نکال کر چہرہ صاف کیا۔ جانماز تہ کر کے تخت پوش پر رکھی اور وہاں تخت پوش والی دیوار پر بنے طاق سے قرآن مجید نکال کر وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ وہ اس وقت چند صورتیں اور ایک دو رکوع ہی پڑھا کرتے تھے کیونکہ انہیں دفتر جانا ہوا تھا۔ روزانہ کی طرح پڑھ کر انہوں نے قرآن مجید بند کیا تب ہی سمیرا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ان کے قریب آئی۔

”السلام علیکم ابو!“

”و علیکم السلام بیٹا! جیتی رہو۔“

”آپ کے لیے چائے بنا دوں۔“ اس نے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا اور قرآن مجید کو جزدان میں لینے لگے۔

سمیرا یکن کی طرف برومی۔ وہ صبح فجر کے بعد چائے پینے کے عادی تھے، لیکن جب سے احمد رضا گیا تھا وہ

اکثر چائے نہیں پیتے تھے سارے معمولات متاثر ہو گئے تھے صرف ان کے ہی نہیں۔ اس گھر کے تینوں افراد کے۔

گیٹ پر سے اخبار والے لڑکے نے اخبار اندر پھینکا تو انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا یکن میں جاتے جاتے صحن کی طرف مڑ گئی اور اخبار اٹھا کر انہیں دیا۔ انہوں نے اخبار کھولا پہلے صفحے پر بالکل وسط میں خبر چھپی تھی۔

”اسماعیل کذاب کے ساتھیوں کی پریس کانفرنس۔“

انہوں نے یکدم آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ خبر نہ پڑھنا چاہتے ہوں پھر دُرتے دُرتے آنکھیں کھولیں اور خبر پر نظر ڈالی۔

”اسماعیل کے دو ساتھیوں نے پریس کانفرنس کی۔ وہ دونوں خود کو اس کا خلیفہ کہتے ہیں۔ جن میں سے ایک طیب خان ہے جس کا تعلق افغانستان سے ہے جبکہ ریاض حیدر پاکستانی ہے۔ کانفرنس میں اس کا ایک اور ساتھی احمد رضا بھی تھا۔“

انہوں نے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جما لیے۔

”چتا چلا ہے کہ وہ اسماعیل خان کا خاص بندہ ہے اور صحافیوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ نعوذ باللہ اسماعیل اللہ کا پیامبر اور نبی ہے۔“

انہوں نے اخبار کو اپنی ٹھٹھوں میں بھینچ لیا اور دانت بردانت جمائے اسے رسی کی طرح جل دے رہے تھے پھر یکدم انہوں نے چونکے ہوئے اخباریوں پرے پھینکا جیسے وہ کوئی زہریلا سانپ ہو۔

لحم بھروہ تخت کے کنارے پر پڑے مڑے تڑے اخبار کو دیکھتے رہے پھر تیزی سے اٹھ کر یکن کی طرف آئے۔ سمیرا دروازے کی طرف پیٹھ کیے لیٹی میں اٹھتے پانی کو دیکھتے ہوئے پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی شاید اسے۔

وہ چائے بناتے ہوئے ناشتا تیار کرتے ہوئے وقفے وقفے سے یکن کے دروازے سے سر باہر نکال کر

آوازیں دیتی رہتی تھی۔

”احمد! رضی جلدی کرو۔ در ہو جائے گی۔“ اور کبھی کبھی وہ بیڑھیاں اتر کر کچھ بھر بیڑھیوں کے قریب بنے عینس کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر آئینے میں اپنا جائزہ لیتا۔ یوں ہی ملا وجہ سنورے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا ہوا یکن کے دروازے پر آکر کھڑا ہو جاتا ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھے وہ سمیرا کے ساتھ باتیں کرنے لگتا۔ پھر دونوں میں نوک جھونک ہنسی مذاق چلا کرتا۔

سمیرا کو شاید اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا کہ اس نے مڑ دیکھا۔

”ابو آپ۔“ وہ دروازے پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر پتھریوں کی سی سختی تھی اور آنکھوں میں ویرانی تھی وہ جیسے کہیں خلا میں دیکھ رہے تھے۔

”ابو! کیا ہوا؟“ سمیرا نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

”ہاں!“ وہ جیسے گہری نیند سے چونکے تھے۔ ”اخبار والے کو کھلو اور بتا آئندہ اخبار نہ لائے۔ بل کایئر کر دینا۔“

”جی!“ سمیرا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات کر کے تیزی سے مڑے تھے اور کمرے میں چلے گئے تھے۔

زیدہ کمرے میں نہیں تھیں۔ جب سے احمد رضا گیا تھا وہ اکثر مل گھبراتا تو اٹھ کر سمیرا کے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ آج بھی وہ کسی ناام اٹھ کر سمیرا کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ چپلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

”یا اللہ! میں اس آزمائش کے قابل نہیں تھا۔ یا اللہ! مجھے حوصلہ دے۔ ہمت دے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ نہ تو جسمانی قوت ہے نہ ایمانی کہ میں اس ملعون شخص کا خاتمہ کر سکوں جس نے جھوٹا دعوا کیا اور مجھ میں یہ طاقت بھی نہیں ہے کہ میں اسے بھلا سکوں۔ وہ جو میرے گھر کا چراغ تھا۔“

انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”وہ یہاں میرے سینے پر سر رکھ کر سوتا تھا۔ اس کے ننھے سے سر کا بوجھ آج بھی مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہا ہے۔“

”یہاں وہ مجھے پار دیتا تھا۔“ انہوں نے ایک انگلی سے اپنا رخسار چھوا۔ ”اس کی ہونٹوں کی نمی ابھی تک میرے رخسار پر موجود ہے۔ وہ یوں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری عینک اتار کر اپنی آنکھوں پر لگاتا تھا۔ اور پھر قل قل کر کے ہنستا تھا۔ اس کی ہنسی ابھی بھی اس کمرے میں گونج رہی ہے۔ میرے اللہ! میری مدد فرما کہ میں اسے بھول سکوں۔ اسے یاد نہ کروں۔ میں اسے اس طرح بھولنا چاہتا ہوں کہ کبھی آج کے بعد میرے لبوں پر اس کا نام نہ آئے۔ آج کے بعد میں کبھی اسے دیکھنے کی خواہش نہ کروں اور وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے۔“

سمیرا ان کے پیچھے دروازے تک آئی تھی اور پھر ذرا سا جھانک کر انہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر واپس برآمدے میں آئی تھی اور تخت پر پڑے مڑے تڑے اخبار کو ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہوئے تخت پوش پر پھیلا دیا تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اخبار پر نظر ڈالی

اس کی نظریں پریس کانفرنس کی تفصیل پر تھیں۔ ”احمد رضا تم نے ایسا کیوں کیا۔ تم تو بہت سمجھ دار تھے۔ بہت عقلمند تھے پھر کیسے یقین کر لیا۔“ اس نے اخبار کو اٹھا لیا تھا اور اب اسی طرح جل دے رہی تھی پھر اخبار کو وہیں پھینک کر آنسو روکتی ہوئی وہ ابو کے کمرے کی طرف برومی اور ذرا سے کھلے دروازے سے اس نے دیکھا۔ حسن رضا اسی طرح بیڈ پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کے لبوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر یکن میں آگئی۔

”اچھی طرح رو لیں۔ شاید رونے سے دل کا بوجھ

کم ہو جائے۔ روناتو ہے جب تھک جائیں گے تو چپ کر جائیں گے اور جب رخصی یہ تم نے کیا کر دیا۔“

وہ بچن میں آکر بیٹھ گئی۔ چائے کا پانی اہل اہل کر سوکھ گیا تھا۔ سفید ہوتا پانی اس نے سنک میں پھینک کر نیا پانی رکھا۔ اور جب اس نے چائے دم دی تو اس نے دیکھا حسن رضا اپنے کمرے سے نکل کر تخت کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے چائے کپ میں ڈالی اور بچن سے باہر قدم رکھا۔ حسن رضا ہولے ہولے اخبار کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ مڑا ترا اخبار جو تخت کے کونے پر تیل دی ہوئی رسی کی طرح پڑا تھا۔ اٹھا کر تخت پر پڑے گول ٹیکے کے نیچے چھایا۔ سیرا نگاہیں جھکائے تخت پر بیٹھے حسن رضا کے قریب آئی اور چھوٹی سی رُے تخت پر رکھی۔

”ابو! چائے۔“ اس نے ان کی طرف نہیں دیکھا تھا اسے لگا تھا وہ اگر ان کی طرف دیکھے گی تو اس کا ضبط جواب دے جائے گا۔ وہ ان کے اس شکست خوردہ اور باپس اور بے بس چہرے کو نہیں دیکھ سکے گی۔ سو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر رُے رکھ کر واپس مڑ گئی تھی۔

بہت دیر وہ یونی بچن میں بیٹھی رہی تھی پھر اسے خیال آیا کہ زیدہ کب سے جاگ رہی تھیں اس نے انہیں چائے نہیں دی اور نہ ہی ناشتہ بنایا ہے۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ لیکن رو نہیں پا رہی تھی اس نے فریج سے ڈیل روٹی اور انڈے نکالے۔ تب ہی حسن رضا نے اسے آواز دی۔

”سیرا! انا! دروازہ بند کرلو۔“

”ابو! وہ تیزی سے بچن سے باہر نکلی“ میں ابھی ناشتہ لاری ہوں۔“

”میرا جی نہیں چاہ رہا۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے قدم صحن میں رکھ دیے تھے۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی غٹ تک آئی تھی۔

”دفتر جا رہا ہوں۔“

”لیکن ابھی تو صرف سات بجے ہیں۔“

”ہاں آج کچھ جلدی جاتا ہے۔“

اس نے ان کے کوٹ کی جیب سے جھانکتے اخبار کو دیکھا۔ وہ باہر نکل گئے وہ کچھ دیر یونی گیٹ کے پاس کھڑی رہی۔ پھر سر جھٹک کر پکلی۔ تخت پوش کے پاس آکر اس نے رُے کی طرف دیکھا۔ چائے کا کپ ایسے ہی پڑا تھا۔ حسن رضا نے چائے نہیں پی تھی۔ اسے ان پر بے حد ترس آیا۔ میرا سیدھا سادہ حقیق باپ۔ رضی اتم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ بالکل اچھا نہیں کیا رضی! ہمارے ساتھ! اپنے ساتھ۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں غمی پھیل گئی اور وہ رونے لگی۔

رونے سے زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے اور اگر حل ہو سکتے تو احمد رضا اس وقت دھڑیس مارا کر رو رہا ہوتا لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھاے صوفے پر بیٹھا تھا۔ رچی جا چکا تھا مگر اس کی انگلیوں کی چیخیں اب بھی اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کی وہ سر دے مہر آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کے بالکل قریب آکر اور اپنی تخت انگلیاں تقریباً اس کے کندھوں میں چھوٹے ہوئے اس نے اپنی بات دہرائی تھی۔

”یہ سب تم نے ہی کہا تھا احمد رضا۔ پندرہ سولہ صحافیوں کی موجودگی میں اور اب تم اس سے مکر نہیں سکتے۔“

”لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ سب بکواس جو اس اخبار میں لکھی ہے میں وہ نہیں کہہ سکتا۔ میں ایک سچا مسلمان ہوں۔“

”اچھا!“ رچی یونی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے غصے سے مسکرایا تھا۔ ”کیا تم مجھے ایک سچے مسلمان کی تعریف بتاؤ گے؟“

اور اس کی نظریں جھٹک گئی تھیں۔ وہ یہاں اپنے شب و روز بغیر کسی رشتے کے الونہ کے ساتھ بسر کر رہا تھا اس نے ان سارے دنوں میں ایک بار بھی خدا کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔

”ہاں بولنا۔“

اس نے اپنی انگلیاں اس کے کندھوں میں چھوئیں۔

”میں اس تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔ میں جانتا ہوں۔“

وہ بولنا تو اس کی آواز کمزور تھی۔

”لیکن میں نے کلمہ طیب پڑھا ہے اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔“

”چلو مان لیا۔ ایسا یہی ہے۔“ رچی نے اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور اسے لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر سے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو۔

”لیکن تم نے تو اپنی زبان سے ان اتنے صحافیوں کے سامنے جو کچھ کہا وہ یہاں اس اخبار میں موجود ہے۔ اور اس ایک اخبار میں نہیں کئی اخباروں میں۔“ اس نے اپنے حلق کو خشک ہوتے محسوس کیا اور بے بسی سے رچی کی طرف دیکھا۔

”تم یقین کرور رچی! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا اور میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔ جب میں ایسا سمجھتا ہی نہیں۔ میں حضرت صاحب کو اللہ کا ایک نیک بندہ سمجھتا ہوں اور۔۔۔ ہاں یہ بات تو شاید ریاب حیدر نے کہی تھی یا پھر طیب خان نے میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“

”اور انہوں نے کیا کچھ غلط کہا تھا۔ نہیں ناں تب ہی تم نے ان کی تائید میں ان کی بات دہرائی تھی۔“

وہ ابھی ابھی نظروں سے رچی کو دیکھنے لگا تھا۔ ”ہو سکتا ہے تم ایسا نہ سمجھتے ہو ایسا نہ کہنا چاہتے ہو۔“ رچی نے آواز میں نرمی پیدا کی تھی۔

”لیکن تم شاید نشتے میں تھے۔“

”لیکن وہ تو شراب طور تھی۔“ وہ ہٹلایا۔

”کبھی کبھی شراب طور بھی نشہ کر دیتی ہے۔ رچی نے قہقہہ لگایا۔

”بہر حال میں ایک کر سچیں ہوں لیکن میں بھی

سمجھتا ہوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن یہ۔“ اس نے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔

”اس میں جو کچھ لکھا ہے ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔“

”میں ابھی اس اخبار کے آفس میں فون کر کے تردید چھپوا ہوں۔ میں اعتراف کر لوں گا کہ غمار کی حالت میں میرے منہ سے کچھ غلط نکل گیا تھا لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں۔“ رچی نے پہلو دلا تھا۔

”اتم حق آدمی! اتم اپنے ملک کے لوگوں کو نہیں جانتے ہو۔ ایسے معاملوں میں وہ پاگل ہو جاتے ہیں۔ مرنے مارنے پر تیار۔ وہ تمہاری اور اسماعیل خان کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ایک اخبار میں معمولی سی ایک تردید چھپ بھی گئی تو کتنے لوگوں نے اسے پڑھنا ہے۔ وہ ہزاروں لوگ جو اس خبر کو پڑھ چکے ہیں۔“

اسے ہزاروں لوگوں کی پروا نہیں تھی بھلے کروٹوں لوگ پڑھ لیتے لیکن ایک شخص وہ خیر نہ پڑھتا۔

اسے صرف ایک شخص کی پروا تھی۔ جو اس کا باپ تھا۔

اسے صرف ان دو عورتوں کی پروا تھی جن میں سے ایک اس کی ماں اور ایک بہن تھی۔ بھلے ساری دنیا پڑھ لیتی بس یہ تین لوگ نہ پڑھتے۔ رچی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رچی کیوں آیا تھا۔ کیا صرف یہی بتانے۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھاے بیٹھا تھا۔ جب الونہ اندر آئی تھی۔

”احمد۔“ الونہ نے اسے بلایا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر آج اس کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

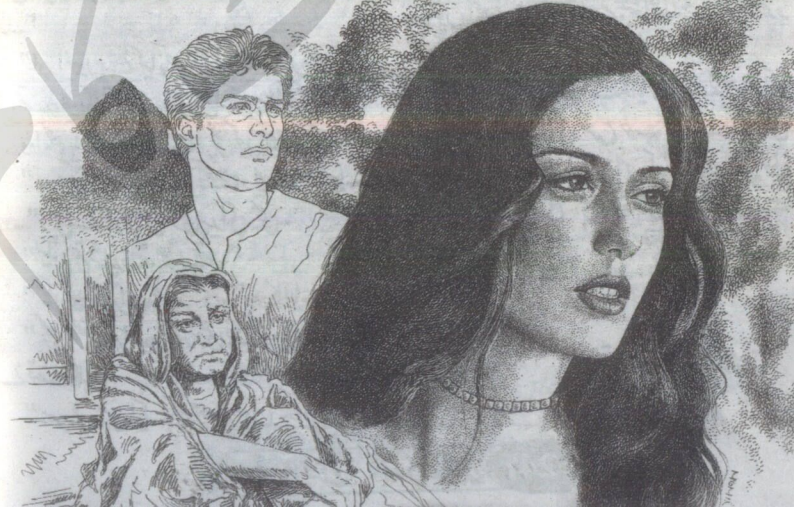
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میرے شوکر کا گلا

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا تھا اور دو بیٹیاں، سارہ اور اربہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی، خالدہ سے دوسری شادی کر لی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ، جھٹانی سے بھی شاک ہے۔ اربہ ماں سے قریب ہے، جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اربہ کی منگنی اس کے تایا زاد، اجلال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اربہ کو باپ اور دوھیائی رشتے داروں کے خلاف بھڑکانے رہتی ہے۔ اربہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہو جاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کر کے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اربہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اربہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ قتل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ روبرواری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اربہ بے حد خود سر ہوئی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شر پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن میمر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شیر علی شرمین ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔



تایاں کا پاپدے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تایاں سے اناراستہ الگ کر لیتا ہے۔ شمشیر تاجور کو اپنے ساتھ فہرے آتا ہے۔ تاجور کوئی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اربیہ، یاسمین کو شہباز دورانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے، مگر یاسمین جھوٹی کہانی بنا کر اسے مطمئن کر دیتی ہے۔ بی بی کے مریض کی کیس، سسڑی تیار کرنے کے سلسلے میں اربیہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی، اربیہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز دورانی کی ناز بگفتگوسن کر اربیہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اربیہ ہوش میں آئے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر راند مہوتی ہے۔ شمشیر علی توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے ریک سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں ہے، فائل کے ساتھ سترلاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اربیہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی، اربیہ سے ملنے جاتا ہے تو اربیہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھی جاتی ہے۔

تاجور کو اسپتال سے باہر روٹے دیکھ کر اربیہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرنا ہے۔ مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ایا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تایاں کی شادی ہو جاتی ہے۔ تایاں کو دیکھ کر شمشیر پچھتا تا ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا اکتاہے۔ مگر تایاں منع کرتی ہے۔

یاسمین، اربیہ کی جلد زل شدادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتی ہے۔ مگر اربیہ دو ٹوک انداز میں منع کر دیتی ہے۔ یاسمین جالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعویت کرتی ہے۔ اجلال، مضطرب سادعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اربیہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال، اربیہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہو جاتا ہے۔ اجلال بے حد نادام ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سیرے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اربیہ نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کانچ سے واپسی پر اسے اغوا کر لیتا ہے۔

اربیہ کے اغوا ہو جانے پر سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ اجلاس ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اربیہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اربیہ سے نیزے سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اربیہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اربیہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اربیہ سے گریز کرنے لگا۔ شمشیر علی، اربیہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کرے۔

شمشیر علی تایاں کے دیکھنے سے قدرے گڑبڑا گیا تھا۔

”میرا میں مجھے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتا۔ روٹی بھی خود پکا کے کھاتا ہے مجھے۔“ تایاں اسے چڑانے والے انداز میں بولی تھی۔

”وہ تو تمہیں دیکھ کر ہی لگ رہا ہے۔ سامنے چاچا خیر کی موٹی جھینس ہے ناں۔ ویسی ہو گئی ہو۔“ شمشیر علی نے جل کر اس کے موٹے کونشانہ بنایا تھا۔

”کیوں نہ ہوں، کھاتے بیٹے گھر کی ہوں پھر خوش رہتی ہوں۔ تیری طرح جلتی کر حتی نہیں۔“ تایاں اب لڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ ”بڑا آیا مجھے موٹی جھینس سے ملانے والا۔ اپنے آپ کو تو دیکھ۔“

”اوہو تایاں، ایسا ہو گیا ہے نہیں۔ بھائی مذاق کر رہے ہیں۔“ تاجور نے پریشان ہو کر تایاں کو خاموش کرانے کی کوشش کی۔

”مذاق کر رہا ہے۔ سمجھا کے رکھ اسے۔ مجھے نہیں اچھے لگتے ایسے مذاق۔“ تایاں روٹھے انداز میں بولی تھی۔

”اور کیسے مذاق اچھے لگتے ہیں تمہیں۔ ذرا وہ بھی بتا دو۔“ وہ پھر چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

”ہونہہ!“ تایاں نے ناک سیکڑ کر چہرہ دوسری طرف موڑتے ہوئے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

”بھائی، اب آپ کچھ نہیں کہنا۔“ تاجور نے اس کی منت کی۔

”اچھا جاؤ، چائے ناشتے کا انتظام کرو پھر ہمیں جانا بھی ہے۔“ وہ تاجور سے کہتے ہوئے صحن میں اتر گیا اور ہینڈ پمپ چلا کر منہ دھوئے لگا۔ پھر جب منہ پر صابن لگایا تو ہینڈ پمپ خود ہی چلنے لگا۔ اس نے پہلے دھیان نہیں دیا لیکن پھر منہ پر پانی کا چھپکا مارے ہی چونکا تھا۔ ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے چوڑیوں کی کھنک اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔ وہ پانی کی موٹی دھار کے نیچے ہاتھوں کا پیا لہ بنا کر جیسے بھول گیا تھا۔

”قتی جلدی کیوں جا رہے ہو؟“ تایاں نے دھیرے سے پوچھا تھا۔

”بس اب یہاں دل نہیں لگتا۔“ اس نے کہہ کر ہاتھوں کے پیالے سے پانی اپنے منہ پر اچھالا تھا۔

”نہیں اور دل لگایا ہے کیا؟“ تایاں اگر چھیڑنے والے انداز میں پوچھتی تو شاید وہ اعتراف کر لیتا۔ لیکن اس کے لہجے میں عجب سی بے چارگی تھی۔

”ابھی تو نہیں لیکن سوچ رہا ہوں، کہیں دل لگا ہی لوں۔“ اس نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ہٹ کھلے! سوچنے سے تھوڑی دل لگتا ہے۔“

”پھر؟“ وہ کروٹ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”آپ ہی آپ لگ جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا اور جب پتا چلتا ہے پھر دل اپنا نہیں ہوتا۔ پرایا ہو کر بڑے دکھ دیتا ہے۔“ وہ جانے کس خیال میں کھوئی تھی۔ چونکی تو اسے گھور کر بولی۔

”لے ایسے انجان بن رہا ہے جیسے مجھے پتا ہی نہیں۔ پکا بے ایمان ہے تو۔“

وہ ہنسنے ہوئے تارے تارے تھنچ کر اندر چلا آیا۔

”ناج! شہر جاتے ہی اپنے بھائی کی شادی کر دینا۔“ تایاں اسے سناتے ہوئے جاری تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دروازے سے باہر جاتی تایاں پر الوداعی نظر ڈالی تھی۔

اجلال رازی نوٹ کر رہا تھا کہ ساجدہ بیگم جب سے توصیف ولا سے ہو کر آئی تھیں پریشان اور اپ سیٹ تھیں۔ پہلے تو وہ اسی انتظار میں رہا کہ وہ خود ہی بتائیں گی کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں لیکن جب دیکھا کہ وہ توصیف ولا

— ۱۶ —
سولہویں قسط

کے ذکر سے ہی کترا جاتی ہیں تب اس سے رہا نہیں گیا اور اس وقت فرصت سے ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔
 ”ہاں اب بتائیں امی! آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے؟“ اس نے بیٹھتے ہی بلا تہدید پوچھا تھا۔
 ”میں اب صرف اپنے بچوں کے لیے پریشان ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔“ ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”میرے حساب سے جب تم امریکا سے آئے تھے اسی وقت تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ خیر اب بتاؤ۔ تم نے کیا سوچ رکھا ہے۔ اپنا نہیں تو بہن کا تو سوچو اس کے لیے جو ایک دورشتے آئے تھے وہ ہمیں پسند نہیں آئے۔ بس رازی بہت ہو گیا۔ میں اب جلد شادی کرنا چاہتی ہوں اور ساتھ میں تمہاری بھی۔“ ساجدہ بیگم اچانک بھٹ پڑی تھیں۔

”بالکل کریں کس نے منع کیا ہے۔“ وہ ساجدہ بیگم کا غصہ کم کرنے کے لیے فوراً کہہ گیا۔
 ”کس نے منع کیا ہے۔ تم لوگوں کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ بس اب میں تم لوگوں سے نہیں پوچھوں گی، کل ہی ملنے جلنے والوں سے بات کروں گی۔ تبادلہ رشتہ مل جائے تو اچھا ہے۔“ ساجدہ بیگم کی آخری بات پر وہ اچھل پڑا۔
 ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی! آپ صرف شادی کے رشتے کی بات کریں۔“

”اور تم۔۔۔؟“ ساجدہ بیگم نے کڑے تیروں سے اسے دیکھا تھا۔
 ”میں۔۔۔! وہ گڑبڑا گیا۔ ”میرا مطلب ہے میں پسند کر چکا ہوں۔“
 ”کون ہے؟“ ساجدہ بیگم کا انداز ہنوز تھا۔

”بتاؤں گا شادی کی بات ہو جائے تو پھر میں بھی بتا دوں گا۔“
 ”میں کہہ رہی ہوں رازی! میں تم دونوں کی ساتھ ہی شادی کروں گی۔“
 ”ایسا ہی کر لیجئے گا امی! ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔“ وہ ساجدہ بیگم کے کندھے دبانے لگا تو پھر زیادہ دیر ساجدہ بیگم ناراض نہیں رہ سکیں۔ بولیں تو کچھ نہیں لیکن ان کے چہرے کا تاؤ کم ہو گیا تھا۔ تب وہ دھیرے سے پوچھنے لگا۔

”آپ کو غصہ کس بات پر ہے امی؟“ ساجدہ بیگم نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔
 ”بتائیں نا امی! جب سے آپ چچا جان کے گھر سے ہو کر آئی ہیں۔ میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں یا سمین آئی نے کچھ کمایا اریبہ نے؟“

”تمہارا وہ ہم ہے۔ وہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ ہاں امینہ نے یا سمین سے کہا تھا کہ اب وہ جلدی بیٹیوں کی شادی کر دے۔“ ساجدہ بیگم نے اس بات کو سرسری بیان کیا پھر بھی وہ ٹھٹھکا تھا۔
 ”پھر یا سمین آئی نے کیا کہا؟“

”کیا کہتی۔ اس نے جس طرح مجھے دیکھا تھا۔ میں پریشان ہو گئی۔ بیٹا! یہ ٹھیک ہے کہ میں خود بھی اریبہ سے تمہاری شادی کے حق میں نہیں ہوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہمارے بائین رشتہ پیدا ہو نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ یا سمین تمہاری آس پر اریبہ کو بیٹھائے رکھے۔ یہ رشتہ ہم اپنے طور پر ختم کیے بیٹھے ہیں وہاں بات نہیں پہنچی۔ گو کہ امینہ کی بات سے یا سمین سمجھ تو گئی ہوگی پھر بھی وہ ہم سے تصدیق ضرور چاہے گی۔“ ساجدہ بیگم دل گرفتگی سے بول رہی تھیں۔

”بیٹا! میں خود بھی کی بات ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تو صیف سے کیا کہوں اور کیسے کہوں گی۔ سچ کہوں تو مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔ امینہ کے ذریعے اہلواؤں تو صیف کو؟“ آخر میں انہوں نے سوالیہ نظروں سے رازی کو دیکھا تو وہ جو اندراختی بیٹیوں کو دبانے کی سعی میں ہونٹ پیچھے بیٹھا تھا، آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

”پھر؟“ ساجدہ بیگم کے صرف ہونٹ لیے تھے۔
 ”آپ بہت زیادہ سوچنے لگی ہیں امی! اتنی مینش نہ لیا کریں۔ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں۔ نادان، نا سمجھ نہیں ہوں۔ کسی طریقے سے میں خود ہی یہ معاملہ نمٹا دوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“
 وہ بہت دیر تک انہیں تسلی دیتا رہا تھا پھر جب اپنے کمرے میں آیا تو اس کا اپنا ہی دل احتجاج کر رہا تھا۔

اریبہ اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ صبح کا لچ پھر اسپتال جہاں سے تین چار بجے اس کی واپسی ہوتی تھی تو گھنٹہ بھر آرام کے بعد شام تک وہ یا سمین اور سارہ کے ساتھ رہتی۔ پھر اب وہ بچن میں خواہ مخواہی دیر کے لیے ہی سہی بی بی کا ہاتھ ضرور پٹاتی تھی اور اس نے سالن بہت اچھا بنایا تھا۔ اس لیے اس وقت سارہ نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
 ”کیا وہاں تم سے کھانا پکوا یا جاتا تھا؟“

”ہاں صرف کھانا ہی نہیں جھاڑو پونچھا بھی کرتی تھی۔“ وہ ہنس کر بولی تھی۔
 ”واقعی۔۔۔“

”ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔“
 ”اچھا کتنے آدمیوں کا کھانا پکاتی تھیں؟“ سارہ نے تجسس سے پوچھا۔
 ”صرف دو۔“ وہ روانی میں کہہ کر سٹپٹ گئی۔ ”میرا مطلب ہے اور لڑکیاں بھی تھیں نا تو سب کو کام سے لگائے رکھنے کی خاطر وہ ہر ایک لڑکی سے دو آدمیوں کا کھانا پکواتے تھے۔“

”کسی خاص ڈش کی فرمائش بھی ہوتی تھی؟“ سارہ نے مزید پوچھا تو اب وہ قصداً ”چڑ کر بولی۔“
 ”کیا فضول باتیں لے کر کھڑی ہو گئی ہو چلو جاؤ۔“
 ”اور جو تم یہاں کھڑی ہو، ہمیں جانا نہیں ہے کیا۔ رازی بھائی پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔“ سارہ نے جاتے جاتے یاد دلایا تھا۔

”اف! میں تو بھول ہی گئی تھی۔“
 وہ جو لمبا بند کر کے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی تھی اور جب تک وہ تیار ہوئی رازی بھی آ گیا۔ اس نے یا سمین کو جب رازی کا فون آیا تھا تب ہی بتا دیا تھا کہ رازی اسے آؤٹنگ پر لے جانا چاہتا ہے اور یا سمین کی اجازت سے ہی رازی سے ہامی بھری تھی۔ ابھی بھی پہلے اس نے یا سمین کے کمرے میں جھانک کر اپنے جانے کا بتایا پھر ہر آئی تھی۔

رازی نے اسے دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا تو ایک پل کو اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا پھر یوں خاموش ہو گیا جیسے اب کچھ نہیں دھڑکے گا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ رازی کو اس کا کرکنا محسوس ہوا تھا فوراً اسے دیکھا تو وہ آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”مجھے آئے میں دیر تو نہیں ہوئی؟“ رازی نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ اس نے اختصار سے جواب دیا۔ گاڑی کے اندر خاموشی نے ڈیرا جما لیا جبکہ باہر لا کا شور تھا۔

ٹریفک کے ازدحام سے نکلنے میں گھنٹہ بھر لگ گیا اور جب وہ ساحل پر بنے سنگی پتھ پر بیٹھے سورج سرخی مائل نارنجی لہاؤں کے ساتھ چکا تھا۔ اریبہ کی نظریں اس نارنجی گولے پر ٹھہر گئیں جو دھیرے دھیرے سمندر میں اتر رہا تھا۔ رازی سوچ رہا تھا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کرے کہ اریبہ نے دھیرے سے اسے پکارا تھا۔

”رازی۔۔۔!“ وہ اپنی ہی آواز پر چونکا تھا۔
 ”ہوں۔۔۔!“ وہ اپنی ہی آواز پر چونکا تھا۔
 ”اک بات پوچھنا چاہتی ہوں تم سے مجھے صرف ہاں یا ناں میں جواب دینا۔ کوئی سوال مت کرنا۔“ وہ ہنوز ساکت بیٹھی سامنے نظریں جمائے ہوئی تھی۔

رازی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خود ہی قیاس کرنے لگا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ جب سمجھ نہیں پایا تو کچھ سوچ کر خود بھی شرط رکھ دی۔
 ”تم بھی سوال مت کرنا۔“
 وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی پھر ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر پکار کر پوچھنے لگی۔
 ”رازی! کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ رازی نے یکدم ٹھٹھا ہونٹ و انتھول میں دبا کر خود کو سوال کرنے سے روکا تھا ورنہ پوچھنے جا رہا تھا۔ ”اب مجھ سے کیا مطلب؟“

”ہاں اور رازی! کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے پھر پوچھا۔
 ”ہاں، لیکن کیوں کر نہیں۔“ ہاں اور نہیں کے درمیان بس ایک پل کا فاصلہ تھا۔ زندگی اس نارنجی گولے کی مانند آخری پچھلے کر کے پانیوں میں اتر گئی تھی۔
 ”تم بھی کیا بس بچے جاؤ گی؟“ کوئی اس کے کان میں دھیرے سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا چی کر کے نہیں اور پھر رازی کو جھجھوڑ کر پوچھے۔
 ”کیوں نہیں، کیوں نہیں؟“ لیکن ادھر سے بھی سوال نہ کرنے کی شرط تھی۔ وہ اٹھنے کے لیے اپنی توانائیاں جمع کرنے لگی۔

رازی کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے خود اپنے اجڑنے کا سامان کیا تھا۔
 ”سنو۔۔۔!“ کتنی دیر بعد رازی کی بو جھل آواز اس کی سماعتوں سے لٹرائی تھی۔ ”میں جانتا ہوں اربہ! اتنے سوال تمہارے ذہن کی دیواروں سے سرخ رہے ہیں اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے پاس جواب نہیں ہے۔ ہر بات کا جواب ہے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم خاموشی سے الگ ہو جائیں۔ شاید محبت کا بھرم رہ جائے۔“
 ”محبت؟“ اربہ کے ہونٹوں نے بے آواز جیش کی تھی۔
 ”ہاں میرے دل کا ہر گوشہ ابھی بھی تمہاری محبت سے آباد ہے۔ اس میں کبھی کمی نہیں ہوئی اور محبت تو امتحان لیتی ہی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ہمیں کسی بڑے امتحان میں ڈال کر خود کہیں دور نکل بھاگے کیوں نہ ہم اسے یہیں دفن کر دیں۔ بھی کبھی اس کے مزار پر پھول چڑھانے آجایا کریں گے یا پھر لٹ کر دیکھیں گے بھی نہیں؟“ وہ ٹوٹ کر بول رہا تھا۔ اربہ کا دل چاہا اپنے کان بند کر لے لیکن اس میں اپنے ہاتھ اٹھانے کی سکت بھی نہیں تھی۔

”اور سنو!“ قدرے تاخیر سے پھر بولنے لگا۔ ”میں چاہتا ہوں ہماری منگنی ٹوٹنے کا اعلان تمہاری طرف سے ہو۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں الزام تمہارے سر رکھنا چاہتا ہوں بلکہ۔“
 ”بس بس کرو رازی! خاموش ہو جاؤ۔“ وہ ایک ہاتھ سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے بولی تھی۔
 رازی نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کرب کی جانے کنی منزلوں سے گزر رہا تھا۔
 خاموشی ایک بار پھر دیوار بن گئی تھی۔

اربہ جب گھر آئی تو اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی اچھا ہوا

کہ اس وقت یاسمین اور سارہ بھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آتے ہی واش روم میں بند ہو گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں نے دل کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے آنسوؤں میں اپنا دھواں دھواں چہرہ دیکھا تو اسے خود پر ترس آیا۔ تو وہ جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر واش روم سے نکل آئی۔

سارہ نماز کا پونڈہ تہہ کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”کیسی رہی آج کی شام۔۔۔؟“

”یادگار۔۔۔!“ اس کے اندر کا سناٹا اچانک چھٹانے کے سے ٹوٹا تھا۔ ”کوئی ہنسناہ رو یا اور فیصلہ ہو گیا۔“

”کیسا فیصلہ!“ سارہ جھکی۔

”میں نے اور رازی نے ایک دوسرے کو اپنی محبت سے آزاد کر دیا ہے۔ ٹھیک کیا ناں؟“ اس نے تصدیق کے لیے سارہ کو دیکھا۔ وہ سانس روک کے کھڑی تھی۔

”ہاں سارہ! یہی ٹھیک ہے۔ میں بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا جس بندھن کی وجہ سے میں بار بار ٹوٹ رہی ہوں میں اس بندھن کو ہی کیوں نہ توڑ دوں اور میں نے توڑ دیا۔ اب درود تو ہو رہا ہے لیکن اس اذیت سے کم جو مجھے تائی امی اور پچھمو کے رویے سے ملی تھی۔“

”رازی بھائی نے احتجاج نہیں کیا؟“ سارہ نے سنائے میں پوچھا تھا۔ اربہ سے فوری جواب نہیں بن پڑا تو یوں بن گئی جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔

”ضرور کیا ہو گا رازی بھائی نے ضرور احتجاج کیا ہو گا۔“ سارہ نے یکدم چیخ کر اربہ کو بازو سے کھینچا تھا۔ ”کیا تھا ناں؟“

”نہیں۔“ جیسے کائنات تھم گئی تھی۔ کتنی دیر بعد اسے اپنے بازو پر سارہ کا ہاتھ سرکنا محسوس ہوا تو اس نے جھرجھری مٹی تھی۔

”تم ہرٹ ہوئی تھیں؟“ سارہ ہنوز سنائے میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ہاں ٹوٹ گیا نا۔ لیکن اچھا ہی ہوا پتا چل گیا۔ رازی بھی عام سامڑ ہے۔ سطحی سوچ رکھنے والا۔ وہ اپنی ساری زندگی ایک ایسی لڑکی کو دان نہیں کر سکتا جس کی پار سائی مشکوک ہو۔“ وہ بولتے ہوئے سارہ کی طرف سے رخ موڑ گئی پھر ایک دم پلٹی تھی۔

”لیکن تمہیں کیوں افسوس ہو رہا ہے۔ تمہارے خیال میں تو رازی میرے قابل نہیں تھا۔ ہے نا۔ یا تم نے مجھے ہلانے کی کوشش کی تھی۔“

”ان ساری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اربہ! رازی بھائی نے تم سے محبت کی ہے۔“ سارہ عاجز ہو کر بولی۔
 ”میں نے بھی رازی سے محبت کی ہے۔ میری اولین محبت میری آنکھوں میں تجھے والا پہلا خواب جس کی قسمت میں شرمندہ تعبیر ہونا نہیں لکھا گیا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”کتنی عجیب بات ہے۔ ہم ناکامیوں کو قسمت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ مل گیا تو ہمارا کمال، نہیں ملا تو قسمت خراب، جب پانے پر شکر نہیں تو کھونے پر شکوہ کیوں۔“ وہ رکی چوٹی پھر حیران ہوئی۔

”ارے! مجھے شاید زندگی کا فلسفہ سمجھ میں آ رہا ہے۔“
 ”نہیں تمہارا داغ خراب ہو رہا ہے۔ پاگل ہو رہی ہو تم۔ تمہیں خود نہیں پتا تھا کہ رازی ہو کیونکہ تم خود کو بہت ہمارا پوز کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مت کرو ایسی فضول کوششیں۔ محبت کی چوٹ چھپائے نہیں چھتی۔ میں دیکھ رہی ہوں تمہارے اندر محشر پر ہے تو تم بھی کرو محشر پر۔ کچھ باقی نہ بچے۔“ سارہ پھٹ پڑی تھی۔

”تو ابھی کیا چاہے؟“ اربیبہ یکدم ڈھسے گئی پھر یوں ٹوٹ کے روئی کہ سارہ کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

شمشیر علی تاجور کو اپنے ساتھ واپس لے آیا تھا۔ اب اس کے اندر پہلے کی طرح یہ خوف نہیں تھا کہ سارا دن تاجور اکیلی کیسے رہے گی۔ شاید اس لیے کہ اب اسے گھر کے ساتھ گھر والوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ پھر سال بھر تاجور اربیبہ کے گھر رہ کر کافی سمجھ دار بھی ہو گئی تھی۔ شہری طور طریقے بھی سیکھ گئی تھی۔ پھر بھی وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”دیکھو تاجور! تمہیں گھر میں سارا دن اکیلے رہنا ہو گا اس لیے احتیاط کرنا۔ کسی کے بھی آنے پر بے دھڑک دروازہ مت کھول دینا۔ پہلے پوچھ کر پورا اطمینان کر لیتا۔ ویسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دکھا ہے یہاں اچھے لوگ رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تمہاری بھی دوستی ہو جائے گی پھر تمہارا یہاں دل لگ جائے گا۔“

”میرا دل لگ گیا ہے بھائی!“ مجھے یہ گھر اچھا لگ رہا ہے پھر سارہ اور اربیبہ باجی بھی تو میرے پاس آئیں گی ناں۔“

تاجور نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”تا نہیں۔“

”مجھے بتا ہے۔ وہ دونوں مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ جب انہیں بتا چلے گا کہ میں واپس آگئی ہوں تو وہ ضرور آئیں گی۔ بھائی! آپ بھی مجھے ان کے گھر کے جائیں گے ناں بلی بلی سے تلے تو مجھے وہاں جانا پڑے گا۔“

”بلی کون اربیبہ کی امی؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

”میں بلی اربیبہ باجی کے گھر چن کا سارا کام کرتی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے قرآن شریف پڑھایا ہے اور مزے مزے کے کھانے بناتے بھی سکھائے ہیں۔ بہت اچھی ہیں بلی۔“ تاجور کے لہجے میں توصیف و لاکھ کے مینوں کے لیے انہیں تھک رہی تھی۔

”اور کون کون رہتا ہے وہاں؟“ شمشیر علی کو اب دل نے اُکسایا تھا۔

”اور بس اربیبہ باجی کی امی اور ایک بھائی ہے اور ان کے ابا دو سری بیوی کے گھر رہتے ہیں۔“ تاجور نے بتایا تو وہ اچھلا تھا۔

”کیا اربیبہ کے ابا نے دو شادیاں کی ہیں؟“

”آپ کو نہیں پتا؟“ تاجور نے اس کی لاعلمی پر حیرت کا اظہار کیا۔

”مجھے کیا پتا۔“ وہ سنبھل کر کہنے لگا۔ ”خیر نہیں کیا وہ دو کریں یا چار۔ ہمارے ابا نے بھی تو دو کی ہیں۔“

”اچھا بھائی! آپ اربیبہ باجی کو فون کر کے بتائیں ناں کہ میں آگئی ہوں۔“ تاجور کا شوق دیکھتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر پہلے نام دیکھ کر سوچا کہ اس وقت اربیبہ اسپتال میں ہوگی پھر اس کا نمبر دیا کر موبائل تاجور کو ہاتھ دیا۔

”کو تم خود بات کرو۔“

”السلام علیکم اربیبہ باجی!“ تاجور بولنا شروع ہوئی تو وہ نظا ہر انجان بن کر دو سری طرف دیکھنے لگا۔

”اچھا آپ سارہ باجی ہو۔ جی میں واپس آگئی ہوں۔ آپ آئیں گی تا میرے گھر۔ ہاں میں خود بھائی کے ساتھ آپ کو لینے آ جاؤں گی۔“

تاجور کی باتوں سے وہ خاص جھنجھلا رہا تھا۔ کیونکہ جس کے بارے میں وہ سننا چاہتا تھا اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔ اس کے سب پر کل اس کی بہن نے ریسپوکی ہے خود کماں ہے۔ سوچتے ہوئے شمشیر علی کا دھیان تاجور کی

رف سے ہٹ گیا تھا۔ جب ہی اس نے سنا ہی نہیں مزید کیا باتیں ہوئیں۔ جب تاجور نے موبائل اس کے ہاتھ لکھا تب وہ چونک کر بولا تھا۔

”ہو گئی بات؟“

”جی سارہ باجی سے بات ہوئی ہے اربیبہ باجی تو پیار ہیں۔“

”اربیبہ پیار ہے۔“ وہ بے چین ہوا تھا۔

”جی سارہ باجی بتا رہی تھیں اربیبہ باجی کو بہت تیز بخار ہے۔“ تاجور اس کی بے چینی سے بے خبر مزید کہنے لگی۔ ”پتا ہے بھائی! اربیبہ باجی بھی کھو گئی تھیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھیں۔ سب گھر والے بہت پریشان تھے۔“

”پرے چاری اربیبہ باجی بھی تب سے پریشان رہتی ہیں۔“

”اچھا جاؤ چائے وائے ناؤ۔“ اس نے تنگ ہو کر کہا پھر بالکونی میں نکل آیا۔ پہلے بھی وہ اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔

اسی ہی بالکونی اور کپڑوں میں کھیلنے بچے وہی منظر تھا لیکن زندگی کروٹ بدل گئی تھی۔

”شام! اس بات سے قطع نظر کہ یہ حادثہ یا واقعہ میری زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو گا تمہارا بہر حال کچھ نہیں

بگاڑا۔“ اربیبہ کی بات یاد آنے پر اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔

”ایسا کیا کروں میں کہ تمہارا بھی کچھ نہ بگڑے۔“

ساجدہ بیگم کو اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر رازی سمجھ گیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہوگی جب یہ کہنے سے گریز کیا کہ ”نپ کیوں آگئیں امی! مجھے بلا لیا ہوا آؤرنہ ہی جانے کے لیے غلت دکھائی تھی۔ ساجدہ بیگم آرام سے بیٹھ گئیں تب بھی وہ کوئی سوال اٹھانے کے بجائے کہنے لگا۔

”بلال! کافون آیا تھا امی! پیسوں کا قاضا کر رہا تھا۔“

”کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ جب تنک وہاں رہے گا تم اسے پیسے بھیجو گے؟ وہ خود کچھ نہیں کرے گا جیسے تم

رہے تھے؟“ ساجدہ بیگم نے کہا۔

”کرنا تو بلال کو بھی چاہیے اور میں اس سے کتنا بھی ہوں لیکن پتا نہیں وہ کیا سوچے ہوئے ہے۔“ وہ پُرسوج

انداز میں بولا تھا۔

”اگر تمہیں کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا بیٹا! تو واپس بلا لو اسے۔“ ساجدہ بیگم کے لہجے میں فکر مندی محسوس کر کے

اسے اس موضوع سے ہٹا دیا۔

”دیکھو ناں گا۔ آپ سنائیں سب ٹھیک ہے ناں۔“

”ہاں ٹھیک ہی ہے۔ آج دن میں تو صیف آئے تھے۔“ ساجدہ بیگم نے بتایا تو وہ ٹھٹک گیا۔

”چچا جان۔۔۔ خیریت؟“

”آپ کیا بتاؤں بیٹا! برسوں کا ناٹوٹ رہا ہے۔ دکھ تو ہو گا۔“

”چچا جان نے کیا کہا؟“ اس نے بے صبری سے ٹوکا تھا۔

”وہی تمہاری اور اربیبہ کی بات کر رہے تھے کہہ رہے تھے مجھے اب یہ رشتہ مناسب نہیں لگ رہا۔ آپ جہاں

چاہیں رازی کی شادی کر دیں۔ پھر معذرت بھی کر رہے تھے۔“ ساجدہ بیگم آزدگی سے بول رہی تھیں۔

”میں نے کہا تھا ناں اربیبہ کی باتوں سے یا سمین سمجھ گئی ہوگی پھر اس نے تو صیف سے کہا ہو گا۔ جب ہی وہ خود آکر

منع کر گئے ہیں۔“

رازی چپ ہو گیا۔ یوں بھی اس کے اس کو کچھ نہیں تھا۔

”گو کہ یہ اچھا ہوا کہ بات ادھر سے ختم ہو گئی لیکن ان دو گھروں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی ہے اس کا مجھے افسوس ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خاندان بھر میں تمہارے باپ اور چچا کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ سائمن کی بد اخلاقی اور بد سلوکی کے باوجود بھی ان بھائیوں میں معمولی سی رنجش نہیں ہوئی اور اب۔۔۔“ ساجدہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔

”اب بھی رنجش نہیں ہوگی امی!“ رازی نے بے چین ہو کر ساجدہ بیگم کے ہاتھ تھام لیے۔ ”ایک رشتہ ٹوٹ جانے سے سارے رشتے نہیں ٹوٹ گئے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ جس طرح ہمارے دلوں میں بچپان کی محبت اور احترام میں کمی نہیں آئی اسی طرح بچپان کی شفقت میں بھی کمی نہیں آئے گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ ساجدہ بیگم دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

”اور بھی کچھ کہا چکا جانے؟“

”میں زیادہ باتیں نہیں کیں تو صیغہ نے ہاں! تمہاری طرح وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ یہ رشتہ ختم ہو جانے سے ہمارے آپس کے تعلقات میں ان شاء اللہ فرق نہیں آئے گا۔“

”ان شاء اللہ! بس اب آپ دل پر بوجھ نہ رکھیں۔ کچھ دنوں میں سب بھول بھال جائیں گے اس سارے قصے کو۔“ وہ ساجدہ بیگم کو سلی دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلیں اب آپ آرام کریں۔“

”اچھا وہ بلال کا تم کیا کرو گے ابھی پندرہ دن پہلے ہی تو تم نے اسے پیسے بھجوائے تھے پھر اب ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے اسے۔“ ساجدہ بیگم نے پھر وہی موضوع پھینڈ دیا جس سے وہ چنا چاہ رہا تھا اور اب پچھتاہٹا بھی کہ اس نے کیوں بتایا کہ بلال پیسوں کا تقاضا کر رہا ہے۔

”میں اس وقت مصروف تھا امی! اس لیے بلال سے تفصیلی بات نہیں ہو سکی تھی۔ صبح میں پھر فون کر کے معلوم کروں گا اس سے۔“ اس نے نظر ہر سرسری انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے پھر مجھے بتانا ضرور۔“ ساجدہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ج۔“

”اور ہاں!“ ساجدہ بیگم کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔ ”میں نے شک کے لیے خواجہ صاحب کی بیگم سے کہا تھا۔ انہوں نے ایک دور رشتے بتائے ہیں۔“

”پھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”اس اتوار کو آئیں گے وہ لوگ۔ تم گھر پر ہی رونا اور دیکھو اب اس بات کو سرسری مت لینا۔ تمہارے والد نہیں ہیں جو میں بے فکری سے بیٹھی رہوں۔ میری زندگی میں تم سب کے گھر آباد ہو جائیں تب مجھے سکون ملے گا۔“ ساجدہ بیگم کی غیر معمولی سنجیدگی پر وہ خاموش ہو گیا تھا۔

تین دن کے بخار نے اربیبہ کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرے جما لیے تھے۔ اسے دیکھ کر سائمن کا دلچسپ ہنسنے لگتا تھا اور یہ احساس کہ اس کے گناہوں کی سزا اس کی بیٹی کو مل رہی ہے اسے اور تڑپاتا تھا۔ سارہ اپنی جگہ پریشان تھی اور اربیبہ گم صدمہ جیسے اسے کچھ نہیں کہنا کچھ نہیں سنتا۔

اس وقت بیٹی کی پشت سے ٹپک لگائے وہ سارکت بیٹھی تھی یا سائمن کچھ دیر پہلے اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی اور اب اس کی جگہ سارہ آ بیٹھی تھی۔

”اریبہ! تمہاری خاموشی مجھے مار ڈالے گی۔ کچھ بولو خدا کے لیے۔ تم نے سنا ابھی ممایا کہہ رہی تھیں۔ ڈیڑی کی کوئی منع کر آئے ہیں۔ تمہارے فیصلے پر مرثیت ہو گئی ہے۔ پھر بھی اگر تم کو تو میں رازی بھائی سے بات کروں؟“

اریبہ کے چہرے پر بے چینی پھیل گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

”دعس رازی بھائی کو یقین دلاؤں گی کہ تم پر کوئی آج نہیں آئی۔“ سارہ اب قدرے جھجکی تھی۔ اربیبہ نے ایک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بس سارہ! فیصلہ ہو گیا ناں اب کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”کیوں نہیں ہوگی۔ جب تم سبہ نہیں سکتیں تو پھر یہ روگ مت پالو۔ رازی بھائی عام مردوں کی طرح نہیں ہیں۔ تم انہیں سچ بتاؤ گی تو وہ تمہارا یقین کریں گے کیونکہ وہ تمہیں دل سے چاہتے ہیں۔“ سارہ اس کا ہاتھ دبا کر تسکین دیتی تھی۔

”میں جانتی ہوں پھر بھی نہیں۔“ اس کے حتمی انداز پر سارہ خاموش ہو گئی تو قدرے رک کر کہہ کنے لگی۔

”تم میری وجہ سے پریشان ہو رہی ہو ناں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا، بخار تھا اتر گیا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ بس بخار کے بعد کی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ ایک دو دن میں یہ بھی نہیں ہوگی۔“

”اچھا۔“ سارہ کے سینے سے آپ سی آپ گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

”ہاں اب یہ موضوع ختم ہو جانا چاہیے۔ دوبارہ اس پر بات مت کرنا۔“ وہ کہہ کر اپنا سیل فون اٹھا کر چیک کرنے لگی۔ پھر سارہ کو دیکھ کر پوچھا۔ ”ناجور کا فون آیا تھا؟“

”ہاں! پرسوں آیا تھا۔ اس وقت تمہیں ہوش نہیں تھا۔ میں نے اس کا فون انیڈ کیا تھا۔“

”کیا کہہ رہی تھی ٹھیک تو ہے ناں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے بھائی کے ساتھ واپس آ گئی ہے۔ تمہاری بیماری کا سن کر پریشان ہو گئی تھی۔“ سارہ نے بتایا تو اربیبہ اندر ہی اندر ہزہز ہو کر بولی۔

”تم نے میرا کیوں بتایا ایسے؟“

”ظاہر ہے وہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا۔ تمہیں بخار ہے۔“

”اچھا جاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ اس نے سارہ کو اٹھانے کی غرض سے کہا۔

”پھر کیا کھاؤ گی؟“ سارہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ ہلکا پھلکا ایسا کرو سینڈویچ بنا دو ساتھ چائے بھی۔“

”اچھی بات ہے۔“ سارہ چلی گئی تب اس نے شمشیر علی کو کال ملائی تھی۔

”کہاں ہو تم؟“ شمشیر علی نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔ اس کے بچے میں عجیب سی تھکن تھی جسے جانے کب سے اسے ڈھونڈنا پھر رہا ہو۔

”ہیں ہوں تم کیوں مجھے کال کر رہے تھے؟“ اس نے نروٹھے پن سے پوچھا۔ وہ اپنے موبائل پر اس کی آٹھ دس من کال دیکھ چکی تھی۔

”کیوں کر رہے تھے کیا مطلب۔ میں تمہیں کال نہیں کر سکتا؟“ شمشیر علی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے صاف منع کر دیا تو ادھر وہ خاموش ہو گیا۔

”دیکھو شام! وہ قدرے رک کر گویا ہوئی۔“ تمہارا کام ہو گیا ناں اب تم مجھے فون مت کرنا۔“ ناجور کے بہانے

سے بھی نہیں۔ میں تمہیں گھر کا نمبر سینڈ کر دوں گی۔ تاجور کو جب بات کرنی ہو۔ گھر کے نمبر پر کال کرے۔ سن رہے ہوں۔“

”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ شمشیر علی نے اس کی ساری بات سن کر نہ کوئی سوال اٹھایا، نہ جواب دیا تھا۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ ضبط سے بولی تھی۔
”لیکن تمہاری آواز ٹھیک نہیں لگ رہی اور تم اسپتال بھی نہیں جا رہی۔ کیوں؟“ شمشیر علی نے جلدی سے پوچھا کہ کہیں وہ فون مندر نہ کر دے اور اس نے واقعی جواب دینے کے بجائے سیل آف کر دیا تھا۔

اربیہ سے بات کر کے شمشیر علی کی بے چینی بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اربیہ نے اسے فون کرنے سے منع کر دیا تھا بلکہ اسے یہ خیال ستاتا تھا کہ کشمکش کے بعد اب لیں اس پر زندگی تنگ تو نہیں ہو گئی۔ جیسا کہ اس نے خود کہا تھا۔

”تم نادان نہیں ہو جانتے ہو گے کہ لڑکی اگر ایک رات بھی گھر سے باہر رہے تو پھر لوگ اسے کس نام سے پکارتے ہیں۔“

گو کہ اب شمشیر علی کے اختیار میں کچھ نہیں تھا لیکن وہ اس لڑکی اربیہ کو رسوا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کی عزت و آبرو کا وہ خود محافظ تھا۔ یہ صرف وہی جانتا تھا اور وہی اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ لیکن اربیہ کچھ بتائے تب ناں، وہ تو اب بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فون کرنے سے بھی منع کر دیا تھا تو پھر اس نے فون تو نہیں کیا لیکن اسپتال کے چکر ضرور لگا تھا، پھر پورے پندرہ دن بعد اربیہ نظر آئی تو وہ اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔
”تم نے کہا تھا کہ تاجور اب صرف تمہاری بہن نہیں ہے کہ تم اسے لے کر چلتے بنو۔“

”پچھو۔“ اربیہ کی پیشانی پر شکنیں بڑھ گئی تھیں۔
”پھر یہ کہ تم بھی میرے لیے اجنبی نہیں ہو کہ میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔“ اس نے کہا تو اربیہ غصے سے لیکن دبی آواز میں بولی۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب میری وجہ سے اگر تم پر کوئی آج آرہی ہے تو بتاؤ۔“ اس کی بات پر اربیہ ہتھ سے اکھڑ گئی۔
”کیا کرو گے تم۔ کیا کر سکتے ہو۔ ساری دنیا اگر مجھ پر انگلیاں اٹھائے گی تو کاٹ دو گے سب کی انگلیاں؟“
”صرف انگلیاں ہی نہیں گردنیں بھی اڑا دوں گا۔“ اس کا لہجہ ہنوز مضبوط تھا۔

”دماغ خراب ہے تمہارا اور سن لو! اول تو مجھے کسی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں اور اگر ہوا بھی تو میں خود نمٹ سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تم! اربیہ نے سلگ کر کہا اور آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ اس نے پھر راستہ روک لیا۔

”میں جانتا ہوں، تم بہت بہادر ہو لیکن اب یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“
اربیہ دانتوں پر دانت جما کر تیکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ ہلکے ہلکے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
”ہاں میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ اس لیے آئندہ غلطی سے بھی یہ مت کہنا کہ تم کون ہو تو میرے ذاتی معاملے میں دخل دینے والے۔“

اربیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا کہ وہ فوراً ”شہادت کی انگلی اٹھا کر بولا۔
”جب تم زبردستی میرے دل پر قابض ہو سکتی ہو تو میں بھی زبردستی کر سکتا ہوں۔“

”شٹ اپ۔۔۔ اربیہ! اسے دھکیل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تو وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا پھر کچھ سوچ کر وہاں سے نکلا تو سیدھا آفس آ گیا۔

اسے تو صیف احمد کا کیا آفس جوائن کے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور وہ بہت مطمئن تھا۔ تو صیف احمد نے جس طرح اصرار کیا تھا تو وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے لگن سے کام کر رہا تھا۔ پھر اب تو ایک نئی لگن بھی تھی جو اسے تو صیف احمد کی نظروں میں خاص مقام حاصل کرنے پر اساتھی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اربیہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انکیج ہے یا اس کے دل میں پہلے ہی کوئی جگہ بنا چکا ہے۔ اس وقت اس سچ پر سوچتے ہوئے وہ پریشان ہو گیا تھا اور اس روز جب تاجور اربیہ کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ کھو گئی تھی اب لوگ بہت پریشان تھے تو وہ ٹوک کر اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا لیکن اب وہ سب جانتا چاہتا تھا۔ جب ہی شام کو جب وہ گھر آیا تو اس نے تاجور کو پاس بٹھالیا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھنے لگا۔

”تمہاری اربیہ باجی کا کیا حال ہے؟“
”ٹھیک ہیں۔ کل میں نے فون کیا تھا اربیہ باجی سے بھی بات کی تھی۔“ تاجور نے سادگی سے بتایا۔
”چھادو جو اس دن تم نے بتایا تھا کہ اربیہ کھو گئی تھی تو پھر جب واپس آئی تھی تو اس کے گھروالوں نے کچھ کہا تھا اس کو؟“ اٹھنا تھا، حتیٰ کی تھی؟“ وہ تاجور کی سمجھ کے مطابق بات کر رہا تھا۔

”نہیں ڈانٹا تو نہیں تھا۔ سب خوش تھے۔“
”اور خاندان کے لوگ کیا باتیں کرتے تھے جب اربیہ گھر نہیں آئی تھی؟“
”تم نہیں بھائی! میں تو اسے کرے میں رہتی تھی، مجھے اربیہ باجی نے منع کیا تھا کہ میں کسی کے سامنے نہ آؤں، اس لیے جب کوئی آتا تھا تو میں کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔“
”اچھا کرتی تھیں۔“ وہ یہی کہہ سکا، پھر پوچھنے لگا۔ ”اربیہ نے تمہارے بارے میں اپنے ابا کو کیا بتایا تھا؟“

”یہی کہا تھا کہ وہ میرا علاج کر رہی ہیں۔“
”نہوں نے کچھ کہا نہیں؟“
”نہیں اربیہ باجی بہت اچھی ہیں نا؟ میں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب پیار کرتے ہیں ان سے۔ بھائی! آپ مجھے کب لے کر جائیں گے ان کے گھر۔؟“ تاجور کو اچانک اس گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔
”لے جاؤں گا۔ اربیہ کی شادی میں لے جاؤں گا۔“ اس نے بظاہر بے نیازی سے کہا تو تاجور منہ چھلا کر بولی۔
”نہیں بھائی! ان کی شادی تو یہاں نہیں کب ہوگی۔“
”مگنی ہو گئی؟“ اصل میں تو یہی جانتا چاہتا تھا۔
”ہاں۔“ تاجور نے انجانے میں اسے شک پہنچایا تھا پھر وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

سمیر پھر سارہ سے شادی ہو رہا تھا۔
”تم ایسی کیوں ہو گئی ہو سارہ! پہلے تو ذرا اسی بات پر مجھے فون کرتی تھیں اب اتنی بڑی باتیں چھپا جاتی ہو۔ کیوں؟“

”کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟“ خلاف توقع سارہ بہت پرسکون تھی۔
”اربیہ اور رازی بھائی کی منگنی ٹوٹ گئی۔“ سمیر نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ سارہ بول پڑی۔
”ایسی باتیں تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ تمہیں بھی اسی روز بتا چل گیا ہو گا جب ویڈیو ٹائی ای کو منع

کر آئے تھے پھر میں کیا بتاتی۔ ہاں! اگر تمہیں اس خبر کی سچائی پر شبہ تھا تو تم مجھ سے تصدیق چاہتے۔ اس انتظار میں کیوں رہے کہ میں تمہیں فون کر کے کہوں میرے نمبر نے جو سنا ہے یہ کوئی خوشی کی بات تو نہیں تھی۔
 ”اب میں کیا کہوں؟“ میرا واقعی لاجواب ہو گیا۔
 ”کچھ مت کہو۔ نہ اب نہ آئندہ کبھی۔ پتا نہیں آگے قسمت میں کیا لکھا ہے۔“ سارہ نے کہا تو میرے چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟“
 ”کچھ نہیں۔ تم بتاؤ تمہاری جاب کا کیا ہوا؟“ سارہ نے بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔
 ”جانب۔ ہاں! کوششوں میں لگا ہوا ہوں۔ تین چار جگہ اپلائی کر چکا ہوں۔ صرف ایک جگہ سے انٹرویو کال آئی تھی۔ اس کے بعد ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ دعا کرو۔“
 ”تم ڈیڈی سے کیوں نہیں کہتے؟ وہ اگر اور کہیں نہیں تو اپنے آفس میں۔“
 ”امی جی یہی کہتی ہیں۔“ میرا اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔
 ”پھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”پھر یہ کہ میں پہلے خود کوشش کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”یعنی جب ہر طرف سے پاپس ہو جاؤ گے تب ڈیڈی سے کوئے؟“ میرے منہ سے لگا تو وہ چڑ کر بولی۔
 ”یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں وقت ضائع کرنے کا شوق ہے۔“
 ”بالکل نہیں۔“ وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔ ”میں نے کب وقت ضائع کیا ہے؟ جیسے ہی تم میرے دل میں سائیں، میں نے اسی وقت تم سے اعتراف کیا تھا، جبکہ تم۔۔۔“
 ”فضول باتیں مت کرو۔“ اس نے ٹوک دیا۔

”یہ فضول باتیں نہیں، میری زندگی کا سوال ہے۔ تمہارے بدلتے رویوں کے باوجود میں نے کبھی پیچھے ہٹنے کا سوچا بھی نہیں۔“ الٹا میرا دل تابی میں گھڑتا رہا کہ تم اریبہ کی وجہ سے پریشان ہو، جب ہی ایسے بی ہو کر رہی ہو۔ ایسا ہی تھا نا؟“ آخر میں میرے تصدیق چاہی تو وہ بڑبڑا کر بولی۔
 ”نہیں۔“

”پھر؟“ میرے کو اپنا دل ڈھونڈتا محسوس ہوا۔
 ”پھر یہ کہ میں نے تمہارے کہنے پر بہت بار تمہارے بارے میں سوچا، لیکن مجھے کوئی نیا احساس نہیں ملا تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہے کیونکہ اریبہ کی محبت کا انجام دیکھنے کے بعد میرا محبت پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔“ سارہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔
 ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ میرے منہ سے نکل گیا۔

”نہیں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ باقی تمہاری مرضی مانو نہ مانو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میرے لپک کر اس کی کلائی تھام لی۔
 ”مان لوں گا۔ مجھے دیکھ کر بات کرو۔“

”کیا بات؟ اب اور کیا سننا چاہتے ہو؟“ وہ اپنی کلائی چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔
 ”میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔“ میرے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں! انہیں ہے۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”پھر کس سے ہے؟“ میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ تب وہ اسے دھکیل کر پیچھے ہٹ گئی۔
 ”کسی سے نہیں۔“
 ”تھینک گاؤ، تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔“ میرے گہری سانس کھینچ کر کہا۔
 ”بے کاری کا میں نہیں۔ کسی کی جان نہیں نکلتی۔ اپنی ایک طرف محبت پر بھروسہ مت کرو۔ بے ڈوبے گی نہیں۔“ وہ اب غصے سے بولی۔ میرے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ یا سمین کو آتے دیکھ کر اس سے مخاطب ہو گیا۔

”السلام علیکم آئی!“
 ”وعلیکم السلام! تم کب آئے؟“ یا سمین نے جواب کے ساتھ پوچھا۔
 ”جی! اچھ دی ہوئی۔“ میرے کہا تو یا سمین سہولت سے گویا ہوئی۔
 ”تو بیٹا! تمہیں پہلے مجھے سلام کرنے آنا چاہیے تھا۔ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ تم باہر ہی یا میری بیٹیوں سے مل کر جلتے بنو۔ اگر حماد اس طرح تمہارے گھر صرف طیبہ سے مل کر چلا آئے تو تمہیں کیسا لگے گا؟“
 ”میرے یکدم سناٹے میں آیا۔“
 ”برامت ماننا بیٹا! جو بات اپنے لیے ناپسند ہو، دوسرے کے لیے بھی اسی انداز سے سوچنا چاہیے۔ اب جاؤ! آئندہ خیال رکھنا۔“ یا سمین نے بڑے پیار سے اسے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ جب وہ چلا تو اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔
 ”سارہ چاہ کر بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکی تھی۔“



اریبہ کے مزاج میں چڑچڑاہٹ عود کر آیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر الجھنے لگی تھی۔ اسے خود بھی احساس تھا، لیکن وہ کیا کر لیتی۔ دل پر جو سانحہ گزرا تھا۔ اس کے بعد کسی بات کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھر میں بھی اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔ یا سمین اور سارہ اس کی کیفیت سمجھتی تھیں۔ جب ہی اسے ٹوٹی نہیں تھیں۔ بس اس کی ہاں میں ہاں ملائیں، لیکن کالج اور ہاسٹل میں اس کے ساتھ ہی اب اس سے کترانے لگے تھے اور یہ نہیں تھا کہ اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ خود عاجز تھی۔ کوشش بھی کرتی کہ اگر وہ کوئی بھی بات برداشت نہیں کیا پاری تو جواب میں خاموشی اختیار کرے اور کبھی تو وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتی ورنہ ہمت سے اکھڑ جاتی۔
 کسی وقت غیر جانب داری سے سوچنے بیٹھتی تو سب ہی بے قصور نظر آتے اور سارا ٹھیک قسمت کے کھاتے میں چلا جاتا۔ اور شاید یہ ہی سچ تھا کہ اس کا اور رازی کا جوڑ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہتی تو بھی دل روٹنے سے بچنے کی طرح جب کہ بیٹھ جاتا اور کبھی بدک جاتا۔ پھر اسی طرح اس کا مزاج بھی بدلتا تھا۔ اس وقت وہ یا سمین کی گودی میں سر رکھنے عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

”مما! دعا کریں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا۔ سب بھول جاؤں اور میرے دل کو قرار آ جائے۔“
 ”میں دعا کرتی ہوں بیٹا! میری ساری دعائیں تمہارے لیے ہیں۔ تم بھی نماز پڑھو۔ دل کا سکون نماز میں ہے۔“
 ”میں اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھی۔“
 ”میں کیا کروں، میرا نماز میں دل نہیں لگتا۔“ وہ اپنی بے بسی پر خود بھی کڑھ رہی تھی۔
 ”پھر بھی پڑھو۔ اللہ ضرور تمہارا دل اپنی طرف پھیر دے گا۔ اپنی طرف بڑھنے والی کوششوں کو اللہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ مجھے دیکھو۔“ یا سمین یکدم خاموش ہوئی، پھر ہمت کر کے کہنے لگی۔

”میں بھئی ہوئی روح تھی۔ پھر بھی اللہ نے میری پکار سن لی۔ مجھے مایوس نہیں کیا۔ اور تم نے تو بیٹا! کوئی گناہ نہیں کیا۔“

”پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“ اس کی آوازیں آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے یاسمین تڑپ گئی۔
”صرف تمہارے ساتھ نہیں بیٹا! ہر ایک کو اللہ کسی نہ کسی آزمائش میں ضرور ڈالتا ہے اور پھر نکالتا بھی دیتی ہے۔ انسان کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ اس لیے ہوشہ اللہ سے مدد مانگو۔“
وہ یاسمین کی گود سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تو یاسمین اس کی پیشانی چوم کر بولی۔
”کچھ وقت گزرنے دو۔ پھر تم خود جان جاؤ گی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، وہ اچھا تھا یا بُرا۔“
”ہاں نہیں ماما! ابھی تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ وہ پھر یاسمین کی گود میں سر گھسنا چاہتی تھی کہ سارہ کی آواز پر ادھر متوجہ ہو گئی۔

سارہ کا رُپ رُو میں جانے کس سے بات کر رہی تھی۔
”شاید کوئی آیا ہے۔“ یاسمین نے بھی آواز سن لی تھی۔
”میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سارہ کے ساتھ تاجور سامنے آ گئی۔
”کون ہے بیٹا۔“ یاسمین نے پوچھا تو وہ دروازے میں آ کر بولی۔
”السلام علیکم آئی!“
”وعلیکم السلام ٹھیک ہو بیٹا؟“ یاسمین نے مسکرا کر پوچھا۔
”جی آئی! آپ کیسی ہیں؟“
”اللہ کا شکر ہے۔ سارہ اب بخیر آئی دوست کو۔ کچھ خاطر مدارت کرو۔“ یاسمین کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”او! میرے کمرے میں چلو۔“ سارہ کو اشارہ کر کے اپنے کمرے میں آئی۔ تاجور کو دیکھتے ہی اسے شمشیر علی کی بات یاد آئی تھی۔

”جب تم زبردستی میرے دل پر قابض ہو سکتی ہو تو میں بھی زبردستی کر سکتا ہوں۔“
”اربیہ باجی!“ وہ تینوں اربیہ کے کمرے میں آئیں تو تاجور اس سے لپٹ گئی۔
”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“
”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ قصداً ”مسکرائی۔“
”پھر آپ میرے گھر کیوں نہیں آئیں؟ میں اتنا یاد کرتی ہوں آپ کو۔“
”چھا! اتنا یاد کرتی ہو اور آئی اب ہو! اتنے دنوں بعد؟ یہ ہے تمہاری محبت۔“ اربیہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی جتا دیا۔

”اللہ! نہیں باجی! میں تو روز بھائی سے کہتی ہوں، مجھے آپ کے پاس لے آئیں اور آپ کو بھی اپنا گھر دکھا دیں۔“
”مجھے پتا ہے تمہارا بھائی۔“ اربیہ جانے کیا کہنے جاری تھی کہ یکدم خاموش ہو گئی۔ پھر سارہ سے بولی۔
”سارہ! جاؤ پہلے اسے بی بی سے ملو اور۔۔۔ بہت پوچھتی ہیں اس کا۔“
”ہاں چلو تاجور! بی بی سے مل لو۔“ سارہ اس خیال سے کہ کہیں اچانک اربیہ کا موڈ خراب نہ ہو جائے تاجور کو لے کر چلی گئی۔

ساجدہ بیگم کو شادی کی فکر تو تھی، لیکن اتنی نہیں۔ یہ ہی سوچتی تھیں کہ جب اللہ کو منظور ہو گا۔ لیکن جب سے یاسمین نے ان کے منہ پر کمرہ دیا تھا کہ بیٹی تو آپ کے گھر میں بھی بیٹھی ہے تو یہ بات ان کے دل پر ایسی لگی

تھی کہ اس کے بعد انہیں اور کچھ سوچنا ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ سب سب میرے رازی کی کہ جلد سے جلد اس کے گھر کا رخ کر لیں۔ شاید اس لیے کہ یاسمین کی فطرت سے واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کا اپنا دفاع کرنے کی خاطر دوسروں پر حسرت دھرنے سے ذرا نہیں ہٹے گی اور ساجدہ بیگم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کوئی اچھا وارہہ سکے۔ یوں بھی عورت کے سر پر بیوگی کی چادر ہو تو وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔
بہر حال دو دن پہلے شاکو کچھ لوگ دیکھنے آئے تھے۔ بظاہر ساجدہ بیگم کو اس رشتے میں کوئی خالی نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن چونکہ بالکل غیر لوگ تھے اس لیے وہ آنکھ بند کر کے اعتماد بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے اجلال رازی کو پوری چھان بین کرنے کو کہا تھا اور پھر ان سے زیادہ صبر بھی نہیں ہوا۔ اس وقت رازی آنس سے آکر بیٹھا

”بیٹا! ان کے کے بارے میں معلوم کیا تم نے؟ کیسے لوگ ہیں؟“
”جی! ان کے کے بارے میں تعریف کر رہا تھا۔ اخلاق گروار کا اچھا ہے۔ محنتی بھی ہے۔ رازی غالباً ”خود مطمئن ہو چکا تھا“ جب ہی اس کے کنبے میں ہر طرح کا اطمینان جھلک رہا تھا۔

”اور گھر والے؟“ ساجدہ بیگم نے پوچھا۔
”گھر والوں سے تو آپ مل چکی ہیں ابی! اور مجھ سے زیادہ آپ سمجھ سکتی ہیں۔ ان کی بات چیت سے آپ نے کیا اندازہ لگایا؟“ رازی نے انہماک سے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔
”ایسا کرس ابی! آپ ابھی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ پہلے ان کا گھر اور گھر کا ماحول دیکھ لیں، پھر جب تک آپ کا دل مطمئن نہ ہو، سوچیں بھی نہ۔“ رازی نے کہا تو ساجدہ بیگم اسی رُپ رُو انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔
”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جلد بازی نہ کریں۔ یوں بھی ابھی شادی کی عمر ہی کیا ہے۔“
”لو! کیوں کی یہی عمر ہو رہی ہے شادی کی۔“ ساجدہ بیگم نے فوراً سخت لہجے میں کہا۔
”آپ بہتر جانتی ہیں۔“ وہ زنج انداز میں کہہ کر اٹھنے لگا تھا کہ ساجدہ بیگم نے روک دیا۔

”بیٹھو ابھی۔“ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“
”جی۔۔۔“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو قدرے رک کر ساجدہ بیگم کہنے لگیں۔
”شاکو تو ٹھیک ہے۔ میں گھر بار دیکھ کر فیصلہ کروں گی۔ ساتھ میں میں چاہتی ہوں تمہاری بات بھی ڈال دوں۔ تاکہ پھر دونوں کی ساتھ شادی کر سکوں۔“

”ہاں! لیکن۔۔۔“ وہ اندر سے بریشان ہو گیا۔
”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بتاؤ! تم نے کہاں لڑکی پسند کی ہے؟“ ساجدہ بیگم اس وقت اپنے انڈی رعب سے پوچھ رہی تھیں۔

”بتاؤں گا ابی! آپ پہلے۔“
”میں نے کہا، دونوں کے معاملات ساتھ ساتھ طے ہو جائیں گے۔ بتاؤ! کون ہے؟“ ساجدہ بیگم کے حکمانہ اصرار پر وہ جڑبڑہو کر بولا۔
”آپ جانتی ہیں اسے۔“
”نام بتاؤ۔۔۔؟“
”سارہ۔“ رازی کی اپنی سانسیں رک گئی تھیں۔

”سارہ؟“ یاسمین کی بیٹی؟“ ساجدہ بیگم کے وجود میں جیسے چنگاریاں بھڑک گئی تھیں۔

یہ دل ٹکڑوں میں گر چہ کٹ گیا ہے
مگر آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا ہے

خدا وندا! اسے شبنم سے دھو دے
یہ گلشن دھول سے اب اٹ گیا ہے

یہاں برسے گی اب کرنوں کی بارش
کہ بادل آسمان سے پھٹ گیا ہے

زمنے سے اسے کیا پھل ملے گا
قبیلوں میں جو انساں بٹ گیا ہے

بہت دشوار تھا منزل کا راستہ
خدا کا شکر، لیکن کٹ گیا ہے

اسی کا نام اتور کہکشاں ہے
ستاروں سے جو رستہ اٹ گیا ہے

اتور سدید

محکم

جہی موسم تھا، سرد و ٹھنڈا ہوا

یونہی بچ بستہ ہوا میں

میرا بچل اڑا کر میرا چہرہ چھایا کرتی تھیں

آسمان سے برقی بزم بارش

اور درختوں سے ٹپتی سفید برف

ایک دوسرے کو ہماری محبت کے قصے سنایا کرتی تھیں

شیشم کے بیڑوں پر پھرتی چڑیاں

کتنی سرشاری سے

اپنی سربلی آواز میں ہماری

دفاؤں کے پیٹھے گیت گایا کرتی تھیں

میں چشموں کے بہتے پانی میں

تمہاری ہنسی کی جھنکار سن کر کرتی تھی

بہار رت نے کب خزاں کا لباس اودھا

مجھے خبر ہی نہ ہو سکی

وقت حسین خوابوں کے بحر سے نکل کر

مجھے حقیقت کی دنیا میں لایا تو میں نے دیکھا

میرے ہاتھوں میں محبت کے سونے گلاب تھے

چشموں کے بہتے پانی کا شور

تمہارے ہجر کی کہانی سن کر ادا تھا

شیشم کے درختوں پر پھرتی چڑیاں

مجھے برف پر تنہا چلنے دیکھ کر

شود بخارا ہی تھیں

اور درختوں سے چمکتی سفید برف نے

وہ سارے خواب جو ہم دونوں کی محبت سے بڑھے تھے

اپنے سفید گالوں کے نیچے دبائے

ایک مدت کے بعد میں محبت کی نگری سے واپس آئی

تو میرا دل، میری آنکھیں، خالی ہو چکی تھیں

تمہیں معلوم ہی نہیں کہ

سب کچھ ہونے اور کچھ نہ ہونے کے اس سفر نے

مجھے اندر سے کتنا تھکا دیا ہے

نازک کنول نازی



میرے خون کے پیسے ہوں گے لیکن لوگ جیالے تھے
ان کے سر پر دھوپ کی چادر ان کے پاؤں میں چھالے تھے

اُس گھر کے دیوار و در سے جانے کیسا رشتہ تھا
گھوم گھوم کر ہم نے دیکھا، دروازوں پر تالے تھے

کچھ نے ہاتھ پکڑ کر کہینا، کچھ نے رستہ روک لیا
ورنہ ہم نے سوچ لیا تھا، اُس سے ملنے والے تھے

تم پھرتے تو ہم سے ملنے، کتنی خوشیاں، غم آئے
ہم نے اُن کی شکل نہ دیکھی، گوڑے تھے یا کالے تھے

”مٹی! مٹی! بولو یہ انکل اچھے ہیں یا پاپا؟“
اُس کے بچے... تو یہ تو یہ، آفت کے پر کالے تھے

اُس کو دیکھا تو آنکھوں میں لفظ اشکوں سے بھیگ گئے
مصحف ہم سے جھوٹ نہ بولو، تم کچھ کہنے والے تھے

مصحف اقبال توصیفی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”تم جاؤ اور اپنے بھائیوں کو کہنا کہ تمہاری رغبت دنیا میں بڑھ جائے گی“
(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے)

ضیغۃ سے مراد بن، صنعت و ذراعت اور کاروبار ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان میں اتنا زیادہ بہانہ اور دلچسپی نہیں ہونی چاہیے کہ انسان کا مقصد زندگی، رضائے الہی کے بجائے، یہی چیزیں بن جائیں اور اس کے شب و روز اسی تک دو دو میں صرف ہوں، ورنہ حسب ضرورت و کفایت تو زمین، کاروبار اور جائیداد وغیرہ بنانا اور رکھنا سب جائز ہے، ممنوع نہیں۔

جھوٹا انسان،

وہ انسان جھوٹا ہے جو حق گوئی کے موقع پر خاموش رہے یا ایسی بات کہے جس سے ابہام پیدا ہو۔
(واصف علی واصف)

غور طلب،

جب نبی کی وراثت موروثی نہیں تو اولیاء کی وراثت کس طرح موروثی ہوگئی؟ گدڑی نشین کا تصور غور طلب ہے۔
(واصف علی واصف)

مختصر مختصر،

وہ موسیقی روح پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جو رات کے ایک بجے بڑی گھر سے سنائی دے۔
بعض بیویوں کو اپنے شوہر کی خوشی کی اسی فکر ہوتی

قیمت،

ملا نصیر الدین نے ایک یار کی کفوس مہاجن کی جان بانی تو اس نے اپنی جان بچانے کا اسے ایک روپیہ دیا۔
ماتنے یہ کہہ کر بخوشی قبول کر لیا۔ ”مجھے یہ لینے ہوئے اس لیے بڑا نہیں لگ رہا کیونکہ تمہاری زندگی کی قیمت اس سے زیادہ نہیں“

مومن،

مومن اس لیے پاک ہے کہ وہ کوئی ذاتی عرض و غایت نہیں رکھتا۔ وہ عطائے خداوندی کو رضائے خداوندی پر لگا رہتا ہے۔
(اشفاق احمد۔ زاویر)
سدرہ الوار۔ منڈی بہاؤ الدین

لمحہ فکر یہ،

کیا یہ شرم ناک بات نہیں کہ انسانوں پر خطیب حکومت کس جو لمبی تقریروں سے اس طرح گونجتے رہتے ہیں، جس طرح سے بیتل کے برتن، جو ضرب لگنے کے بعد اس وقت تک گونجتے رہتے ہیں، جب تک ان پر کوئی ہاتھ نہیں رکھ دیتا۔
(افلاطون)

مطالعہ،

مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تقریباً تمام دنیاوی غم و فکر سے نجات کے لیے اپنے ایک پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔
(سمرت ماہم)

یہ کائنات،

یہ کائنات ایک حادثہ نہیں ہے۔ حادثے میں اس قدر امن نہیں ہو سکتا کیونکہ حسن، حسن ترتیب کا نام ہے اور حادثہ کسی ترتیب کے بکھر جانے کا نام ہے۔
(واصف علی واصف)
حنان سلیم اعوان۔ آخون بانڈی ہری پور

جو اہرات،

اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے ہیں

ہرک وہ اس کی وجہ جاننے کے لیے پرائیویٹ سراج زمانوں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔
”یہ درست ہے کہ متضاد عناصر میں ایک دوسرے کے لیے کشش ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ تمام شادی شدہ زوجہ شادی شدہ لڑکیوں کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔“
مسز ارشد آسی۔ اکووالہ کھاریاں

سچ تو یہ ہے کہ،

”تم اس ماہ میں چار چھٹیاں لے چکے ہو“ آفسر نے اپنے ماتحت سے کہا۔
”ایک مرتبہ تم اپنی بیوی کو ٹرین میں سوار کر لے گئے تھے، دوسری مرتبہ تم اپنی ساس کے جنازے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ تیسری مرتبہ تمہارے بیٹے کی سالگرہ بھی جو بھی مرتبہ تمہاری بیٹی یا دھرمی۔ اب یہ بتاؤ آج تم کس لیے چلی جا رہے؟“
ماتحت نے سر جھکا کر کہا۔ ”سچ پوچھیے تو آج میری شادی ہے۔“
ارم کمال۔ فیصل آباد

تو بھی،

ہمارے ہاں شادیاں پسند کی جاتی ہیں۔ جی ہاں گھر والوں کی پسند کی۔ بقول عطاء الحق قاسمی ”ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی سے پوچھتے ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کریں تو شادی کر دیتے ہیں۔“
سننے والے نے پوچھا ”اگر وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں تو؟“
کہا ”تو بھی شادی کر دیتے ہیں۔“

تو پہلے اپنا آئینہ آپ کو توڑنا پڑے گا۔
”خبر بہ بہتر“ میں استاد ہے لیکن اس مدد سے کی فیس بہت زیادہ ہے۔
”ڈپلومیٹ شخص وہ ہے جو عورت کی سالگرہ کا دن تو یاد رکھے لیکن اس کی عمر بھول جائے۔“

”شادی ایک مرتبہ کرنا ضرورت، دوسری بار کتنا حاجت اور تیسری بار اس غلطی کو دہرانے کا سہرا لگ جائے، ہجوم میں کئی سر ہوتے ہیں مگر دماغ نہیں ہوتے۔“
”اکثر مہمان گھر سے چلے جانے کے بعد اچھے لگنے لگتے ہیں۔“
”مجھلی اور مہانوں میں سے تین دن کے بعد پوآنے لگتی ہے۔“

اگر موم کے پر ہوں تو سورج سے محبت نہیں کرنا چاہیے۔
”شام زندگی کی ہو یا دکھوں کی، بالآخر ڈھل جاتی ہے۔“
صالحہ، انجلی۔ فیروز پور آزاد کشمیر

رشتے رابطے،

دنیا میں صرف تین رشتے کھرے ہیں۔ مامتا، عشق الہی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ باقی ہر رشتہ مصلحت، مطلب، منافقت اور تجارت کا ہے۔

دوستوں، عزیزوں کا بڑا سلوک بھی آپ کے لیے ایک خزانے سے کم نہیں ہے۔ اسے منہ بول کر نہیں یہ بہت سے موقعوں پر بروقت فیصلہ آپ کے کام آئے گا۔

پیار کسی بھی رشتے میں ہو، اگر اس کا اظہار کسی سطح پر نہیں ہو رہا تو ایسے پیار کا سرے سے وجود ہی نہیں۔

کیا یہ قیامت نہیں ہے کہ دنیا ایک دوسرے کے رشتے داروں سے بھری پڑی ہے لیکن رشتے مر گئے ہیں۔
مدار کراچی

حکایتیں

پل انشاء اپنے گھاؤں میں
بیٹھیں گے شکہ کی چھاؤں میں

کچھ ڈائری سے

نوال افضل گھمن

میری ڈائری میں تحریفِ عارف کی یہ غزل میری
عزیزانِ زمانہ میری اعجازِ گھمن کے نام۔
سمجھ رہے ہیں اور بولنے کا یاد نہیں
جو ہم سے مل کر پھڑ جائے وہ ہمارا نہیں

سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ دیتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں

جو ہم نہیں تھے تو کون تھا سر بازار
جو کہہ رہا تھا کہ کتنا ہمیں گوارا نہیں

ابھی سے برف اُلجھنے لگی ہے بالوں سے
ابھی تو قرضِ ماہ و سال اُتانا نہیں

ہم اہل دل ہیں عہت کی بستیوں کے امین
ہمارے پاس زمینوں کا گھر سوارہ نہیں



کچھ ڈائری سے

قرۃ العین خرم

جھاگتی دوڑتی، تیز زندگی میں، ہم خود اپنے آپ کو
مہول جاتے ہیں مگر جب دل کا پیمانہ بہت بھر جاتا ہے
تو دل چاہتا ہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی، فضا میں
فطرت کے رنگوں کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا جائے۔
انہوں کے درمیان، سکھ کی چھاؤں میں اگر کچھ دیر زندگی
سُستتا لے لو کیا زندگی اتنا بھی حق نہیں ہم پر...
ابنِ انشاء کی یہ خوبصورت نظم ایسی ہی کئی خواہش
کے نام۔

یہاں اُلجھے اُلجھے اُلجھے روپ بہت
پر اُصل کی کم، بہ روپ بہت
اس پیر کے پیچھے کیا رکنا
جہاں سایہ کم ہو، دھوپ بہت
پل انشاء اپنے گھاؤں میں
بیٹھیں گے شکہ کی چھاؤں میں

کیوں تیری آنکھ سوا لی ہے؟
یہاں ہر اک بات نرالی ہے
اس دیس بے مروت کرنا
یہاں مفلس ہونا گالی ہے
پل انشاء اپنے گھاؤں میں
بیٹھیں گے شکہ کی چھاؤں میں

جہاں سچے رشتے یاروں کے
جہاں گھونگٹ نہ زور ناریوں کے
جہاں چھرنے کو مل سکھ ولے
جہاں ساز بجیں بن تامل کے

”اگر تیا نہیں ہے تو ہم تیا دیں گے مگر پہلے اسے
کھو کر نکال لوئیں“ مزدوں نے جواب دیا۔
تحريم، عائشہ، گوجرہ

وجہ

ایک ملک کا بادشاہ کچھ عرصے سے خاصا پریشان تھا
کیونکہ ملکی خزانے کو سرفانی خاص آمدنی نہیں ہو رہی تھی جبکہ
بظاہر تمام ملکی شعبے بغیر کسی رکاوٹ کے دواں دواں
تھے۔ ایک دن بادشاہ نے اپنے دربار میں اس مسئلے
کو حل کرنے کے لیے ایک اجلاس بلوایا جس میں تمام
شعبہ جات کے نمائندے شامل تھے۔

مب سے پہلے بادشاہ نے وزیرِ بابتدیر سے اس
مسئلے کی وجہ پوچھی کہ ایسا کیوں ہے۔ ملکی خزانے کے ہاتھ
کچھ نہیں آتا۔

وزیر نے ایک برف کا ٹکڑا منگوایا اور سب سے
پچھلے بیٹھے ہوئے افسر کو بکڑایا اور ہدایت کی کہ ایک ایک
افسر کے ہاتھ سے ہوتا ہوا بادشاہ کے ہاتھ تک پہنچے۔
سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ جب برف بادشاہ
کے ہاتھ میں آئی تو اپنے اصل سائز سے پچاس گنا کم ہو
چکی تھی۔

”یہی صورت حال ہمارے ملکی خزانے اور آمدنی کی
سے جناب“ وزیر نے مختصری مانس لے کر بادشاہ
کو مطلع کیا۔

نہا، فضلہ، کراچی

حاصلِ زندگی

حاصلِ زندگی حُسنِ قوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یر کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں وہ ہوا نہیں
عبدلہ شہزاد - لیٹ



بات ہے سمجھنے کی

چہ طنز وہ تیرے ہے جو شہد میں جھگو کر بھی مارا جائے تو
اس کی چھین کم نہ ہوگی۔

ماہ اگر زبان نہ ہو تو کوئی گناہ گار نہ ہوتا۔ اس لیے
رکش کیجیے گونگوں پر۔
آمنہ آجالا - ڈہرکی

اقوال میں زندگی

• جو شور بھی کھڑا اپنی بیوی کو تھوڑا بہت جیب خرچ
نہیں دیتا، عام طور پر اسے ہر ماہ پابندی سے فاضی
بڑی رقم اپنی سالیہ بیوی کو نان نفقے کے طور پر
دینا پڑ جاتی ہے۔

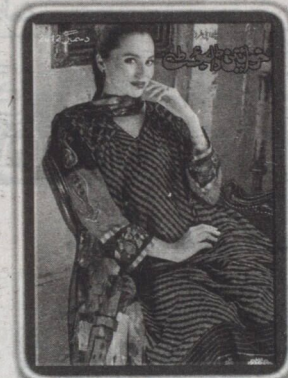
• نیس نے بد معاش کو زمین پر دے مارا پھر یہ سوچے
بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے بد معاش کو
اٹھایا اور زمین منتر لے عمارت کی کھڑکی سے نیچے
پھینک دیا۔ اس سے نمٹ کر وہ دوسرے بد معاش
کی طرف متوجہ ہوئی۔

(اس نرم و نازک ناول کی اگلی قسط اگلے ماہ
ملاحظہ فرمائیں)
(ماہنامہ لڑکی ڈائجسٹ)

جواب

ایک ٹھیکے دار جس نے کچھ سڑکوں کی کھدائی کا ٹھیکہ
لیا تھا کام کا معاوضہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ مزدوروں
کو جہاں کھدائی کرنا چاہیے تھی وہ اس جگہ سے کافی ہٹ
کر کھدائی کر رہے تھے۔ اس نے کارروائی اور سخت
غصے میں پوچھا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“
”سڑنگ بیٹھ گئی ہے، اس کی کھدائی کر رہے ہیں“
ایک مزدور نے اس کی طرف توجہ دے بغیر کہا اور کھدائی
جاری رکھی۔
”کیا فورین کو اس سڑنگ کے متعلق پتا ہے؟“
ٹھیکے دار نے پوچھا۔



نادرہ خاتون پیارے علی

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

شائستہ سعید: سہیوال

عنیزہ جی کا ”بور کے تو کوہ گراں تھے ہم“ خوب صورت منظر نگاری سے سجائے مثال ناول۔۔۔ گنمت سیما کا ”زمین کے آنسو“ بھی زبردست ہے۔ شاہین رشید صاحبہ سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ وہ صرف کراچی کے فنکاروں کو ہی فنکار تصور کرتی ہیں۔ لاہور کے فنکار کس کھاتے میں جا سکتے ہیں۔ رواں سال پی ٹی وی سے ہمارے خواتین کی رانگز گنمت عبداللہ، رفعت سراج، فائزہ افتخار، سیما مناف اور دلشاد نسیم کی لکھی تحریریں بطور ڈرامہ پیش کی گئیں۔ اس لیے پلیئر پی ٹی وی کو نظر انداز نہ کریں۔ عائشہ ثناء کے انٹرویو کی فرمائش کر، کر کے کھ گئے، لیکن آپ نے ہماری فرمائش پر توجہ ہی نہیں دی۔ ہمارے شہر سہیوال کے F.M 96 کے آر جے عامر کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔

ج۔ شائستہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

عائشہ رانا: پشاور

سب سے پہلے گنمت عبداللہ کا ناول ”میرے خواب لوٹا دو“ پڑھا۔ گنمت عبداللہ کا انداز تحریر بہت منفرد ہے۔ عنیزہ سید کا ناول ”کوہ گراں تھے ہم“ مجھے بہت اٹو کھا سا لگتا ہے۔ وہ ہنذر والا اور پھر سعید کی اصلیت۔ یہ سب بہت اسرار والے ہیں۔ موش افتخار کا ناول ”تیرے

ساتھی بنالیا۔ پھر رستہ بدل لیا۔ تمنا دل دیا۔ سر بازار، سر دنیا اور پھر زندگی میں دکھ کی برف، خوشی کی دھوپ سے پگھلی۔ ہم سفر نے ہاتھ تھاما تو تن کی دیوار پر پھول کھلے۔ تین بچوں کی ماں ہوں۔ اسی کی ڈیوٹ سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔ نئے لوگوں میں کھل بل گئی ہوں۔ کچھ لوگوں سے بچھڑ گئی ہوں۔ اک ساتھ نہیں چھوٹا تو آب کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ مجھے ان کمائیوں نے سب کچھ سکھایا، بتایا، لہجوں، انسانوں، نظروں اور جملوں کو پہچانا سکھایا۔ عمیدہ احمد، نمرہ احمد، عزیزہ سید، آسیہ رزاقی، فرحت اشتیاق، رخ چوہدری، غزالہ نگار اور بے شمار مصنفات کے نام سورج کو چراغ دکھانے سے بہتر ہے کہ خاموش رہوں۔

میں اب جو بتانا چاہتی ہوں، مجھے میرے اس سوال کا جواب دے دیں۔ مجھ سے لوگ جڑتے ہیں۔ کچھ مجھے سمجھ دار بھی سمجھتے ہیں، مگر بتا چلا کہ پیٹھ پیچھے کہتے ہیں کہ اس کو خالی خوبی باتیں کرنی آتی ہیں۔ میں بہت زیادہ حساس بھی ہوں اور رومان پسند بھی۔ مجھے وہ کہتے ہیں کہ تم فیئینسی ورلڈ میں رہتی ہو کہ دنیا میں ایسی محبت اور توجہ ناپید ہے۔ ج۔ پیاری میرا! آپ کا طویل خط پڑھا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ آپ ہم سے جدا نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ تعلق کی جس دُور سے بندھے ہیں۔ وہ بہت مضبوط ہے۔ براہ آپ سے رابطہ ہوتا ہے۔

پیٹھ پیچھے برا کہنے والی بات کا یقین نہ کریں۔ پیٹھ پیچھے لوگ کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں، بھی تو بلا وجہ ہی بغیر سوچے سمجھے بول دیتے ہیں۔ ان کی باتوں پر توجہ دینا کڑھنا یا سوچنا لا حاصل ہے۔ البتہ ان لوگوں سے محتاط رہیں جو آپ کو آکر یہ بتاتے ہیں کہ فلاں نے آپ کے متعلق فلاں بات کی ہے۔ یعنی جو تیرا آپ کو نہیں لگا، وہ آپ کو اٹھا کر مارتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ نہ کر دیتے ہوں۔

صبر، استقامت، رواداری، مروت، رحم دلی، سچائی اچھی صفات ہیں۔ اگر آپ میں یہ صفات ہیں تو ان کو قائم رکھیں، لیکن دوسروں سے اس کی توقع نہ کریں۔ دنیا کو اور اس کے لوگوں کو وہ جیسے ہیں ان کو اسی طرح قبول کر لیں۔ ہم دنیا کو نہیں بدل سکتے، لیکن خود کو بدل سکتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حیات بخاری: ڈیرہ اسماعیل خان

شعاع اور خواتین کے دونوں شماروں کے لیے صرف انتہائی کموں کی کہ یہ دونوں لا جواب ہیں۔ مگر ایک چیز جو مجھے ان دور سالوں میں بہت پسند ہے۔ وہ شعاع میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور خواتین میں انشاء جی۔ میں صرف ان دو کالمز کے لیے بہت بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔ پلیزان دونوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنا۔ اس کے بعد تمام لکھاری بہنوں کو اتنا اچھا لکھنے پر مبارک باد، خصوصاً ”نمرہ احمد“ کو بھی عمر، ہدایت اور نیکی کی دعا۔ بہت قابل ہے نمرہ۔ دنیاوی محبتوں پہ تو ہر کوئی لکھ سکتا ہے۔ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی باتوں کو بیان کرنا وہ بھی کمائی کی صورت میں۔ واہ بھی۔

اور اب میں بات کروں گی اس خط کی۔ جس نے مجھے بے حد دلایا۔ ام ثناء! مجھے آپ کے حالات جان کے بے حد دکھ ہوا۔ اتنا بڑا صدمہ، لیکن یقین جانیں، ان سب کاموں پر اختیار صرف اللہ کو ہے اور روئے سے صبر اور عبادت بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

ج۔ پیاری حیات! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ناول نئی مصنفین بھی لکھ سکتی ہیں، لیکن ضروری ہے کہ پہلے افسانے ناول وغیرہ لکھیں، تاکہ قارئین میں شناخت بن سکے۔ آپ کی بہن کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ دس مایاتی کی ترکیب شامل ہوگی۔

تہنیت خان: مومنا خان۔ عمر کوٹ سندھ

ٹائٹل بس سو، سو تھا۔ اب سب سے پہلے گنمت سیما کا ”زمین کے آنسو“ پڑھا۔ سب سے اچھا کردار ارب فاطمہ کا لگتا ہے اور پلیئر پلیئر ایک کے ساتھ ارب فاطمہ کی جوڑی بنائے گا۔ نہ کہ رائیل کے ساتھ۔ اب آتے ہیں گنمت عبداللہ کے ناول ”میرے خواب لوٹا دو“ بہت زبردست۔ ”تیرے درمیان“ موش افتخار کے مکمل ناول کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ بہت اچھا، لیکن اس سے پہلے بھی اسی طرح کی کمائی پڑھ چکے ہیں۔ ”پہلی کاوی“ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ پلیئر اتنے محبت کرنے والوں کو الگ مت کیا کریں۔ باقی ناول اور افسانے زبردست

تھے۔ شاہین رشید سے فرمائش ہے کہ مسعود رضا کا بھی انٹرویو لیں۔

ج۔ تہمت اور مومنہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

صالحہ قصیٰ میرپور آزاد کشمیر

عنیزہ جی کمائی کو بڑی خوب صورتی سے آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ عنیزہ جی! اسعد اور ماہ نور کو جد امت کیجئے گا اور آپا راجہ کو بھی جلدی سے اب اپنے بیٹے بھاری سے ملوا دیجئے۔ سعیدہ ان کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ نگت آئی! اربہ کی تائی امی سے ہمیں اس بے حسی کی امید نہیں تھی۔ رازی دیئے بھی اربہ کے قابل نہیں تھا۔ نگت سیمہ نے طویل غیر حاضری کا حق ادا کر دیا۔ احمد رضا راستے سے بھٹک گیا ہے۔ پلیز اس کی واپسی کا راستہ ہلکا رکھیے گا۔ ایک کواریب فاطمہ کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ سلوی علی بٹ کا ناول ابھی اچھا تھا۔ سعیدہ کا کردار مضبوطی لیے ہوئے تھا۔ وجہ احمد کا ناول بھی اچھا رہا۔ بلی کو اپنے نکاح کا ولی کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا، تاکہ وہ اتنا آگے نہ بڑھتا۔ سب سے اچھا افسانہ نیہ ناز کا تھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ عندیاب گل نے فیصل آباد سے لکھا تھا کہ وہ جب 4th کلاس میں تھیں، انہوں نے قراقرم کا تاج محل پڑھی تھی اور اب B.A میں ہیں۔ جبکہ یہ کمائی جنوری 2009ء میں شائع ہوئی تھی۔ ابھی تو نمبر بھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں۔ آپ کیسے ہو گئیں۔

ج۔ صالحہ اور انصی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تیل سے شکریہ۔

عنیزہ کے ناول میں آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ کھاری آپا راجہ کا بیٹا ہے؟ ہمارے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔

عظمیٰ شاہین رفیق۔ جڑانوالہ

خط لکھنے کی وجہ ہماری بہت پارا لکھنے والی سارہ رضا ہیں۔ پہلے ناول کی طرح اور تحریروں کی طرح ان کا یہ افسانہ ”یا ر ودعا کرو“ بھی بے حد زبردست تھا۔ لیکن مانعہ سے ہر محب وطن پاکستانی کے دل جذبات کی ترجمانی ہے۔ دسمبر جب بھی آتا ہے ملک ٹوٹنے کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔

قصود وار کس کو فخرائیں؟ نقصان کس کا ہوا؟ اس کو ایک طرف رکھ کر اس اتنا کہیں گی۔

تاریخ کے اوراق میں لکھی جائے گی یہ بات نعت اک ہم کو ملی تھی جو سنہائی نہ تھی آخر میں ایک درخواست ہے کہ ہو سکے تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ڈاکٹر شمر مند مبارک کا انٹرویو شائع کریں۔

ج۔ عظمیٰ! ڈاکٹر قدیر خان تک رسائی ہو سکی تو آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ سارہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

اتنے طویل عرصہ سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں اور کبھی خط نہیں لکھا۔ یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ اب باقاعدگی سے لکھتی رہیں گے۔

سمیرا الفوس۔ جھنگ

آپ جس حوصلہ کن انداز سے قارئین کو جواب دیتی ہیں۔ اس نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ دسمبر کا ناول واقعی نئے سال کی آمد کو ظاہر کر رہا تھا۔ ”گوہ گراں“ اچھا جا رہا ہے۔ موش افکار کا مکمل ناول بہت اچھا لگا۔ مگر آخری قسط آئندہ ہر دیکھ کر دل موس کر رہ گیا۔ ”زمین کے آنسو“ نگت سیمہ کی بہت اچھی اور رشتوں میں اپنائیت ظاہر کرتی کمائی لگی۔ ناول میں ”بلی کا ولی“ اچھا لگا ورل میں بے انتہا دکھ کی ایک لہر آئی۔ کچھ جیتیں قربانی مانگتی ہیں۔ اس کا اظہار بلی اور ولی نے کر دیا۔ پلیز! ایلا کرن سے گزارش کریں کہ وہ خواتین کے لیے ایک مکمل ناول لکھیں اور میں سلسلہ میری خاموشی کو بیاں ملے میں لکھ سکتی ہوں۔

ج۔ پیاری سمیرا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں قارئین کے خطوط پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے اور ان کے تفصیلی تبصرے سے ہی ہمیں قارئین کی پسند ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایلا کرن تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ ایلا اچھی راٹر ہیں۔ آپ کو ان کی تحریروں پسند ہیں تو ہم ضرور شائع کریں گے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے، آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

اقرا اکرم۔ گاؤں سلیمان شریف، ضلع سیالکوٹ

ہمارا گاؤں سلیمان شریف بارڈر لائن پر واقع ہے۔ دیا تین کلومیٹر پر بارڈر ہے۔ بارڈر سے بھارتی فوجی نظر آتے ہیں اور وہاں کے لوگ بھی ٹھیکوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بس ہمارے اور ان کے درمیان بن بنے ہوئے ہیں۔ بنوں کے اوپر درخت بہت اچھا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے۔ بچے دوسرے گاؤں پڑھنے جاتے ہیں، ہمارا سارا گاؤں تقریباً ”بھاگ لکھا بن چکا ہے۔ آپ کی سب راٹر اچھا لکھی ہیں، کسی ایک کے بارے میں کیا لکھوں، مجھے سب ہی افسانے اور ناول اچھے لگتے ہیں۔

ج۔ پیاری اقرا! آپ لوگ یقیناً ”بہت بہار ہیں۔ بارڈر لائن پر بھارتی فوجیوں کے اتنے نزدیک رہنا آسان کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ گاؤں میں اسکول نہیں، پھر بھی آپ لوگ پڑھ رہے ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

آپ صرف ایک دن میں پورا خواتین ڈائجسٹ پڑھ کر دوسرے دن ہمیں خط لکھ دیتی ہیں، اس محبت کے لیے شکریہ۔

نیلیم نانم۔ سکھ سمنڈھ

بہت طویل عرصہ بعد خط لکھ رہی ہوں۔ وجہ۔ امی کی طبیعت خرابی اور میری نااہلی، حالات زندگی نے الجھا کے رکھ دیا ہے۔ خیر۔ نگت عبداللہ جی نے اب ناول زبردست موڈ پر لکھ کر لایا ہے اور ”بلی کا ولی“ میں بلی نے بہت غلط کیا۔ اس کو چاہیے تھا وہ پہلے ولی کو بتا دیتی، کسی کے جذبات سے کھلنا سیکھیں غلطی ہے۔ سلوی علی کا کوئی جواب نہیں جو روایتی ہے ان کی تحریروں میں وہ لاجواب ہے۔ رشک حبیبہ نے بیسٹ لکھا۔ نظیر فاطمہ کیا نئے لکھنے والوں میں سے ہیں؟ سبق آموز تھا۔ ”کیا انتقام“ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے لگے اور پوچھنا یہ تھا کہ کیا کوئی رد بھی ناولز لکھتی ہیں؟

ج۔ پیاری نیلیم! آپ کی والدہ کی طبیعت خرابی کے بارے

میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں شفا ملے کئی عطا فرمائے۔ (آمین)

نظیر فاطمہ نئی لکھنے والی ہیں۔ رد انام کی کسی مصنفہ نے ہمارے پڑچوں میں نہیں لکھا۔

فوزیہ زہیر۔ چشتیاں

عنیزہ جی نے تو پہلی قسط سے ہی باندھ لیا ہے۔ بے شک شروع میں کمائی کے خدوخال نمایاں نہیں تھے۔ مگر دلچسپی کا عنصر درجہ اتم موجود تھا۔ دس سال پہلے شادی کے بعد میرا تینوں شادوں سے رابطہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ مگر صرف بصارت کا رابطہ۔ ورنہ دلوں کے تعلق تو یوں آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتے۔ مگر پچھند سال بعد کسی نہ کسی طرح یہ رابطہ بحال کر لیا، کیونکہ جس اور ٹھٹھن کے زندان میں تازہ ہوا کا کوئی روزن تو چاہیے تھا۔ یہ تو ہمیں کمائی کی کہ آپ کی تحریروں نے میرے مسائل کم کرنے میں میری مدد کی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میں وقتی طور پر سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں ڈپریشن کے اس فیز سے باہر نکل آئی ہوں۔ جو بقول ڈاکٹر زبیریشن کلاسٹ اسٹیج ہوتا ہے۔ لیکن میری خود اعتمادی صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ کسی بھی غلط بات کو لے کر گھٹنوں کڑھ سکتی ہوں۔ رو سکتی ہوں۔ مگر ہونٹوں پہ لگی چپ کی باڈھ نہیں ٹوٹی۔

تخیلوں، رنگوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں کو جب ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اپنی پلکوں سے چٹنی پڑیں تو دل کے اندر رسائے ہی کو جھیں گے۔

ج۔ پیاری فوزیہ! جو کچھ آپ کے ساتھ پیش آیا۔ وہ صرف آپ کا ہی نہیں ہر حساس ذہن کا المیہ ہے۔ بے شمار حساس اور ذہین لڑکیوں کے لیے زندگی کا یہ موڈ خوشیوں کے بجائے ایک بوجھ بن کر آتا ہے اور وہ خواب ٹوٹنے کا دکھ سہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں کرے۔ (آمین) خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل مندرجہ ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی دوسری شکل میں ڈراما، ڈرامائی ٹیلی ویژن، سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چال چلانی کا حق رکھتا ہے۔



نیلامنیر سے ملاقات

شاہین رشید

کل آج ایک نجی چینل سے حسینہ معین کا سیریل ”مایا میری بہن“ ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینہ معین کی تحریر بہت لا جواب ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لا جواب تحریر کو مزید لا جواب بنانے میں ڈائریکٹر کے علاوہ فنکاروں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ مایا اور مایا کی بہن کا رول بالترتیب عینی جعفری اور نیلم منیر کر رہی ہیں۔ دونوں کا کردار بہت اہم اور مضبوط ہیں۔ دونوں ہی بہت محنت کے ساتھ بہترین پرفارمنس دے رہی ہیں۔ ہم دونوں بہنوں سے آپ کی ملاقات کروائیں گے مگر پہلے بڑی بہن نیلم منیر سے ملے۔

”کیسی ہو... ماشاء اللہ روز بروز چہرے کے ساتھ ساتھ اداکاری میں بھی نکھار آتا جا رہا ہے؟“
”اچھا... بہت شکریہ... آپ میرا کون سا ڈراما دیکھ رہی ہیں؟“
”میں آج کل تمہارا سیریل ”مایا میری بہن“ دیکھ رہی ہوں۔ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہو اور کیا کیا کام ہیں تمہارے؟“
”بہت کام ہے اللہ کا شکر ہے۔ زندگی کافی مصروف ہو گئی ہے اور میں زندگی کو بہت انجوائے بھی کر رہی ہوں۔“

”بہت سرائی بات بھی ہے اور سوال بھی پرانا ہے۔“
”فیلڈ میں کون لایا... سفارش یا محنت؟“
”صرف اور صرف محنت... کوئی سفارش نہیں تھی... سفارش ہوتی تو بہت پہلے اس فیلڈ میں آچکی ہوتی۔ یہاں جگہ بتائی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ جن کی جگہ بن چکی ہوتی ہے وہ دوسروں کو آگے نہیں آنے دیتے“ بلکہ ان کی جڑیں ہی کاٹتے ہیں۔“
”پھر بھی کوئی تو ہوتا ہے جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوتا ہے؟“

”میں تو بچپن سے ہی اس فیلڈ میں آنے کے لیے جنونی تھی۔ جب میں اسکول میں رہا کرتی تھی تو ہمارے اسکول میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے ایک ٹیم آئی۔ انہیں ایک کمرشل کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت تھی۔ میں اس کمرشل کے لیے منتخب ہو گئی۔ بس پھر تو مجھے کمرشلز ملتے چلے گئے۔ جن کی وجہ سے میں اسکرین کے ذریعے سب سے متعارف ہوئی گئی۔“

”تو محنت تو نہ کرنی پڑی نا؟“
”ایسا تو یہ کہیں۔ جب آپریشن لینے آئے تو صرف میں تو نہیں تھی۔ میرے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ مگر ہماری اتنی خواری ہوئی کہ کئی لوگ تو گھبرا کر چھوڑ گئے مگر میں نہیں گھبرائی اور محنت جاری رکھی۔ بس پھر مجھے محنت کا صلہ مل گیا۔“

”اور ڈراموں میں کون لایا؟“
”کوئی بھی نہیں... قسمت ہی لے کر آئی۔ اصل میں میں نے ”ناریہ خان شو“ میں ایک روڈ شو کیا تھا۔ اس کو دیکھ کر اور میرے کچھ کمرشلز دیکھ کر بابر جاوید نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور اپنے سیریل ”دبا جے“ کے لیے سویرا اندیم کی بجلی کا کردار دیا۔ بس اس کردار سے مجھے راتوں رات شہرت مل گئی۔“

”کردار بھی بہت اچھا تھا۔ ایک خود سر لڑکی کا جو سوتیلی ماں کو پسند نہیں کرتی۔“
”ارے! آپ کو یاد ہے... جی! وہ میری زندگی کا

پہلا اچھا اور فل اور بہترین رول تھا۔ بابر جاوید نے اس کے بعد جو بھی سیریل کیے تقریباً ”ہر سیریل میں مجھے بک کیا اور بک کرتے ہیں۔“
”گویا بابر جاوید کو نئے چہروں کی تلاش رہتی ہے؟“
”بالکل رہتی ہے۔ انہوں نے بھی مجھے اسکرین پر دیکھا تو انہیں لگا کہ یہ لڑکی کچھ کر سکتی ہے۔ اور شکر ہے کہ میں ان کی امیدوں پر پوری اتری۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بابر جاوید سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے ڈائریکٹر کے ساتھ کام کیا تو مجھے تھوڑا بہت کام کرنا آتا تھا۔“
”اپنا پسندیدہ ڈراما کون سا ہے اور رول کون سا پسند ہے؟“
”مجھے اپنے سارے ہی ڈرامے بہت پسند ہیں۔ کیونکہ میرے ہر کردار نے ہی مجھے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس لیے کسی ایک کا نام تو لے ہی نہیں سکتی۔ جہاں تک رول کی بات ہے تو مجھے یہ نہیں کہنا کہ مجھے فلاں رول پسند ہے اور فلاں رول کرنا چاہتی ہوں۔ میں ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں ہر طرح کے رول کرنے کی صلاحیت ہے۔ چاہے وہ سیدھی سادھی لڑکی کا رول ہو یا کوئی بہت سی ماڈرن قسم کی لڑکی کا۔“
”مشکل کیا ہے“ اداکاری“ ماڈلنگ یا ہوسٹنگ؟
کیونکہ تم نے ہوسٹنگ بھی کی ہے ”گڈ مارننگ پاکستان“ کی؟“
”اداکاری مشکل ہے۔ نام بھی زیادہ لگتا ہے۔ مگر مجھے اداکاری ہی زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ میں ایک مشکل پسند لڑکی ہوں اور مشکل کام کرنا مجھے پسند ہے۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں مگر اداکاری نہیں۔ ”گڈ مارننگ پاکستان“ کی ہوسٹنگ کی۔ مجھے بہت مزا آیا۔ فیوچر میں اگر کوئی مارننگ شو ملا تو ضرور کروں گی اور آپ نے ماڈلنگ کے بارے میں پوچھا ہے تو بہت آسان ہے ماڈلنگ اور پیسہ بھی ٹھیک ملتا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اداکاری کا جنون ہے۔ اسے کبھی نہیں

بہت تکلیف اور بہت دکھ دیتے ہیں۔ وہ پتا نہیں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کم سے کم میں تو ایسا کسی کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ ہر ایک کو اپنی قسمت کا رزق ہی کھانا ہوتا ہے۔“

”گزشتہ دنوں میں نے ایک ڈراما دیکھا جو ملک سے باہر شوٹ ہوا تھا۔ کیا لگتا ہے ملک سے باہر جا کر؟“

”بہت اچھا لگتا ہے۔ دوسروں کی ترقی پر رشک بھی آتا ہے۔ لیکن سچ بتاؤں! شروع شروع کے کچھ دن تو بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر پھر اپنا گھر، اپنی فیملی اور اپنا ملک بہت یاد ہے اور دل چاہتا ہے کہ بس فوراً واپس چلے جائیں۔ اپنا ملک ایسا ہی ہے۔“

”اس فیلڈ میں آکر کیا کھایا کیا پیا؟“

”بہت کچھ پایا ہے دولت شہرت۔۔۔ مگر کھویا بھی بہت کچھ ہے۔ پتا نہیں، میرا اللہ مجھ سے راضی بھی ہے کہ نہیں کیونکہ اس فیلڈ میں آنے کی وجہ سے پوری نمازیں نہیں پڑھ سکتی۔ گو کہ قضا پڑھ لیتی ہوں، مگر پھر بھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔“

”کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہو؟“

”فضول خرچ تو خیر میں بہت ہوں۔ کپڑوں کا بھی شوق ہے، مگر نئے نئے میگزین اور نئی ٹیکنالوجی کے موبائل لینے کا بہت شوق ہے۔ بس کچھ پسند آجائے تو پھر ہاتھ رکتا نہیں ہے۔“

”مزاں میں کوئی تبدیلی آئی۔۔۔ کہ میں تو بہت مشہور ہو گئی ہوں۔ اس لیے لوگوں سے دور رہوں؟“

”نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں تو پہلے سے بھی زیادہ نرم مزاج ہو گئی ہوں اور کبھی کبھی مجھے اپنی یہ خوبی ”خامی“ لگتی ہے، کیونکہ لوگ نرم مزاجی کا خوش اخلاق کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور نقصان پہنچاتے ہیں۔“

”کبھی تو غصہ آتا ہی ہوگا؟“

”آتا ہے۔۔۔ مگر میں اظہار نہیں کر پاتی۔ بس خاموش ہو کر اس جگہ سے ہی اٹھ جاتی ہوں جہاں

چھوڑیں گی۔“

”اتنے سارے لوگوں کے سامنے اور کیمروں کے سامنے کام کرتے وقت کوئی جھجک تو نہیں ہوتی یا آسانی سے کر لیتی ہو؟“

”جب کسی کام کا جنون ہو تو پھر جھجک نہیں ہوتی۔ ہاں! ایسا کوئی سین جس میں عشق و محبت کی کوئی بات ہو یا شادی والے سین ہوں تو پھر مجھے تھوڑی بہت جھجک یا شرم آتی ہے۔“

”میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ڈراموں میں ماڈرن رول میں لڑکیاں بہت برے لباس پہنتی ہیں۔ کیا ایسا ہونا چاہیے؟“

”ایسا تمہیں ہونا چاہیے۔ لیکن شاید رول کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ مگر میں اس معاملے میں بہت خیال رکھتی ہوں اور کو شش کرتی ہوں کہ ایسا لباس نہ پہنوں کہ جس سے میری فیملی میں شرمندگی ہو یا ان کو کوئی اعتراض ہو۔“

”بولڈ رولز کی پیش کش ہوتی ہے؟“

”جی! بہت ہوتی ہے، مگر میں انکار کر دیتی ہوں۔ کیونکہ نہ مجھے ایسے رول کرنا پسند ہیں اور نہ ہی میری فیملی کو۔ ہم پٹھان فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کو پتا ہے کہ پٹھانوں میں کتنی شرم و حیا ہوتی ہے۔ مجھے میرے گھر والوں نے فیلڈ میں کام کرنے کی اجازت دے دی ہے، یہی ان کی بہت بڑی مہربانی ہے۔“

”شادی کے معاملے میں اپنی پسند کو ترجیح دو گی؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی، جیسا اللہ نے چاہا ویسا ہی ہوگا گھر والوں کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔“

”ہر شے میں ایک دوسرے کو کاٹ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور یہ فیلڈ تو اس سلسلے میں بہت بدنام ہے۔ ایسا ہے؟“

”جی! بالکل ایسا ہی ہے۔ جو آپ کے سامنے آپ کی تعریف کر رہا ہوگا اور اپنے آپ کو آپ کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا، وہی دوسروں کے سامنے آپ کی برائی بھی کر رہا ہوگا۔ ایسے رویے مجھے



- جب کوئی نظر انداز کرے۔
24 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
میں اتنی جلدی ہوں کہ اپنے آپ کو بور ہونے نہیں دیتی
آپ اکیلے کمرے میں بھی مجھے چھوڑ دیں گی تو میں انجوائے
کروں گی۔
25 جب تنہا ہوتی ہیں تو کیا کرتی ہے؟
تنہائی کا بھی اپنا مزہ ہے۔
26 کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہو؟

- قائد اعظم۔
27 کبھی ہجوم میں اکیلا پن محسوس ہوا؟
ہاں کئی مرتبہ۔
28 کیا ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟
بالکل ہوتا ہے۔
29 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
بس کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ شوپہ جانے کو دل
چاہتا ہے۔

- 30 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
باتھ روم میں (فتمہ)
31 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر فوری طور پر کچھ کھانے کو نہ
ملے تو بھوک مر جاتی ہے۔
32 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
مما کے ہاتھ کا۔ بہت مزے کا پکاتی ہیں۔

- 33 ناشتا جو شوق کرتی ہیں؟
نہیں، میں ناشتا نہیں کرتی۔ بس ملک شیک پیتی ہوں۔

- 34 اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟
کسی سے بھی نہیں۔

- 35 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟
اب کچھ نہیں کہتی۔

- 36 آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟
بہت زیادہ.....

ایس سی جی علی سے

شائین رشید

- 13 کوئی تحفہ جسے پاکر بہت خوشی ہوتی ہو؟
17 جنوری جو کہ میرا تھڈے ہے اس دن میں نے اپنا
پہلا کنٹریکٹ سائن کیا تھا تو میں سمجھتی ہوں کہ اللہ کی
طرف سے یہ میرے لیے بہت قیمتی تحفہ تھا۔
14 انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟
بہت زیادہ ہے مگر ٹائم نہیں دے پاتی۔
15 مستقبل میں کیا بننا ہے؟
ایک اچھی ڈائریکٹر۔
16 سمندر دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
سمندر میں گہرائی بہت ہے۔ انسان کو بھی اتنی ہی گہرائی
ہونا چاہیے۔
17 زندگی میں پڑھائی کتنی ضروری ہے؟
بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ پڑھائی آپ کو سونا بنادیتی
ہے۔
18 اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟
یہ وقت صحیح نہیں پوچھنے کے لیے..... کیونکہ ابھی کچھ
بھی اچھا نہیں ہے۔
19 دوسرے ملکوں کی اچھی بات؟
بہت ساری اچھی باتیں ہیں۔ بہت امن و سکون ہوتا
ہے وہاں۔
20 آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟
کوئی گنہگار کرے اور طاقت ہار ڈور رنگ۔
21 میک اپ ایجانہ ہوتا تو؟
اچھا ہی ہوتا پھر آپ ویسے ہی نظر آتے جیسے ہیں۔
22 میک اپ میں کیا چیز بڑی لگتی ہے؟
کچھ بھی را نہیں لگتا۔
23 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟

- 1 اصلی نام؟
سجل علی۔
2 پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
سجایا جو۔
3 تاریخ پیدائش / شہر؟
17 جنوری 1994ء / لاہور۔
4 تعلیمی قابلیت؟
پڑھ رہی ہوں اور سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوں۔
5 ستارہ / قد؟
کیپری کورن / 5 فٹ 4 انچ۔
6 بہن بھائی آپ کا نمبر؟
ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں بڑی ہوں پھر بہن ہے اور
پھر بھائی ہے۔
7 پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟
محمود آباد کی مکالمیں اور یہی شہرت کا باعث ہے۔
8 شو بزم میں کس نے متعارف کرایا؟
میں خود اپنی قابلیت سے آئی ہوں۔
9 پہلی کمائی / کیا کیا تھا؟
مجھے تو یاد نہیں۔ ممائی سارا حساب رکھتی ہیں اور مجھے
تو بس کام کی ایکسٹنٹنٹ تھی۔
10 سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟
اپنی برتھ ڈے کا۔
11 ابھی ستارہ شناس کو ہاتھ دکھایا؟
نہیں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں خود بھی ہاتھ کی لکیروں
کو پڑھ سکتی ہوں۔
12 کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟
پیرس۔

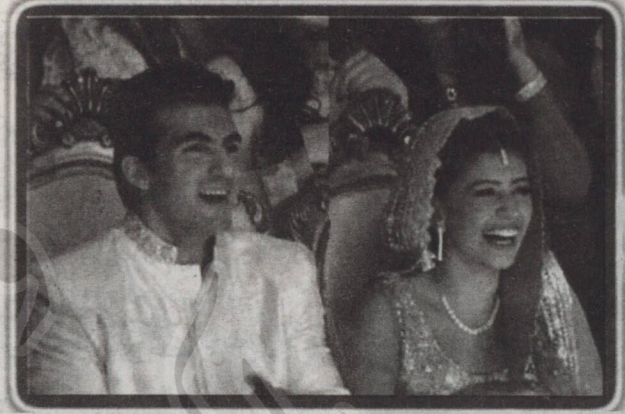
- 37 کیا آپ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار رہی ہیں؟
نہیں، ایسا نہیں ہے۔ جو والدین کہتے ہیں، میں وہی
کرتی ہوں۔
38 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل
ہے۔
یقیناً اپنے آپ کے لیے۔
39 پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟
786 عام طور پر اور اپنے سائن۔
40 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
ہاں غصے میں بھوک ہی نہیں لگتی۔
41 دل کب ٹوٹتا ہے؟
جب کوئی جان بوجھ کے گنہگار کرے۔
42 کون سی بات جذباتی کر دیتی ہے؟
میں بہت زیادہ جذباتی ہندی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو
دل پہ لے لیتی ہوں۔



- 73 بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟
کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کسی پہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔
- 74 اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟
کچھ نہیں بلکہ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔
- 75 گھر آکر پہلی خواہش؟
کہ سو جاؤں اور کسی سے بات نہ کروں۔
- 76 موت سے ڈر لگتا ہے؟
ہاں۔۔۔ بہت زیادہ۔
- 77 جھوٹ آسانی سے بول سکتی ہیں؟
نہیں میری آنکھیں چغلی کھانے لگتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔
- 78 سائنس کی بہترین ایجاد؟
موبائل فون۔
- 79 اگر موبائل فون ایجاد نہ ہوتا تو؟
تو کوئی بات نہیں۔ پہلے بھی تو لوگ رہتے ہی تھے اس کے بغیر۔
- 80 شوہر کی سب سے بڑی برائی؟
مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔
- 81 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
چھٹی کے دن میں گیارہ بجے تک سوتی ہوں اور پھر اٹھ کر فریٹش ہو کر اپنا اسکرپٹ پڑھتی ہوں۔
- 82 کون سا تہوار شوق سے مناتی ہیں؟
ہر تہوار۔
- 83 زندگی کب بدلی؟
جب آڈیشن دے کر آئی اور کامیابی کی خبر سب کو سنائی۔
- 84 اپنی شخصیت میں کیا چیز بہت پسند ہے؟
اپنی پوری شخصیت سے پیار ہے مجھے۔
- 85 پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟
آنکھیں۔
- 86 ٹریفک کب مسئلہ بنتا ہے؟
جب آپ کو نہیں جلدی پتہ ہوتا۔
- 87 ٹریفک جام ہو تو وقت کیسے گزارتی ہیں؟

- 43 موڈ کب خراب ہوتا ہے؟
ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی وجہ کے بغیر بھی۔
- 44 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟
ہائے اللہ بہت ساری ہیں۔ ایک ہو تو بتاؤں۔
- 45 کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر سکتی ہیں؟
ذرا مشکل سے ہی کرتی ہوں۔
- 46 پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟
کہ کاش یہاں سب کچھ اچھا ہو جائے۔
- 47 آپ کی زندگی دوسرے لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟
بہت مختلف ہے ہر لحاظ سے مختلف ہے۔
- 48 کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
اپنے بیک اور اس میں رکھے ہوئے میک اپ کے بغیر۔
- 49 تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟
اللہ سے اور باقاعدہ باتیں کرتی ہوں۔
- 50 مذہب سے آپ کا لگاؤ؟
بہت زیادہ۔
- 51 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟
نہیں کرتی۔
- 52 سفر کے لیے بہترین سواری رکشا، بس یا اپنی کار؟
ویسے تو اپنی کار۔۔۔ لیکن تاکہ میں سواری کا جو مزہ ہے وہ کسی میں نہیں۔
- 53 کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟
اپنے گھر کی چیزوں پر اپنے گھر والوں پر۔
- 54 کوئی ایک کردار جو آپ کو ناچا ہتی ہیں؟
بہت سے کردار ہیں ایک نہیں۔
- 55 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟
دوسروں کی باتوں کو غور سے سنتی ہوں اور بری عادت یہ ہے کہ بہت زیادہ غصہ میں آجاتی ہوں۔
- 56 دھوکا کسے دیتے ہیں یا پرانے؟
دووں ہی دیتے ہیں۔
- 57 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟
پیرس (فرانس) بہت پسند ہے۔ اس کے لیے کہوں گی۔
- 58 پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟
میرے خیال میں ہر چیز کی آزادی ہے۔
- 59 لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟
اللہ۔۔۔
- 60 لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟
تم بہت کیوٹ ہو۔
- 61 اگر آپ اس ملک کی صدر ہوتیں تو؟
غریب لوگوں کے لیے تعلیم کو فری کر دیتی۔
- 62 بیوی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سالگاتی ہیں؟
بہمنی وی۔
- 63 خدا کی حسین تخلیق؟
میں خود (تقمیر)
- 64 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہیں؟
ہر وقت دن کے ہر حصے میں۔
- 65 فقیر کو کس سے کم کتنا دیتی ہیں؟
پانچ روپے۔
- 66 کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟
نہیں بار بار ہوتی ہے۔
- 67 غصہ کب اور کن باتوں پر آتا ہے؟
جب کوئی زیادہ بول رہا ہو اور چپ ہونے کا نام ہی نہ لے رہا ہو۔
- 68 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
نہیں۔۔۔ نصیحت بری نہیں لگتی۔
- 69 شہرت کیسی لگ رہی ہے؟
بہت اچھی لگ رہی ہے۔ بہت مزا آ رہا ہے۔
- 70 زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
ابھی تک تو کوئی کمی نہیں ہے۔
- 71 زندگی کب بری لگتی ہے؟
خاص طور پر جب کسی سے لڑائی ہوتی ہے۔
- 72 اگر کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟
میں ایسے لڑکوں کو انکور کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ان کو مارنے کو بھی دل چاہتا ہے۔





خبریں ویسی

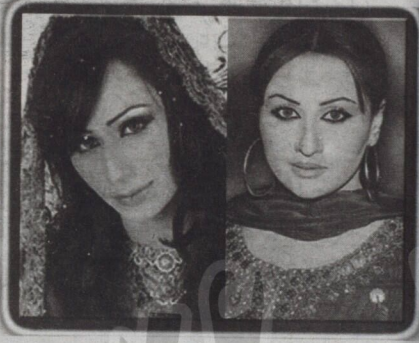
تبصیرِ نشاط

نیاموڑ مبارک

ان دنوں ڈراما سیریل ”تنہائیاں“ کا سیکوئیل مختلف چینلز سے نشر ہو رہا ہے۔ اس سیریل نے لوگوں کی توجہ آج بھی پہلے کی طرح کھینچ لی ہے۔ سیریل تنہائیاں کی قطعیں تو ابھی جاری ہیں۔ تاہم اس میں کام کرنے والے دو فنکاروں ساتھ یوسف اور شہروز سبزواری کی شادی کی قطعیں مکمل ہو گئی ہیں۔ جی ہاں! ان کے ”نکاح“ کی قطع کے بعد اب ان کی ”رخصتی“ کی قطع بھی خیرے نشر ہو گئی ہے۔

ساتھ یوسف اور شہروز کی رخصتی کی تقریب و سمر کے آخری سقے میں کراچی میں نہایت دھوم دھام سے منعقد ہوئی۔ گویا سال 2012ء جاتے جاتے انہیں ایک دوسرے کی شکست دے گیا۔ تقریب میں فواد خان، ہمایوں سعید، نبیل، محمود اسلم، سلیم شیخ، شہزاد شیخ، جاوید شیخ، تجل علی اور میرا سمیت کئی فنکاروں نے

شرکت کی۔ بہروز سبزواری اور علی شہباز یوسف تو خیر میزبانوں میں سے تھے۔ تجل علی شوہر کی دنیا میں ابھی نووارو ہیں، لیکن وہ تقریب میں موجود دیگر تمام روشن ستاروں پر اس وقت چھا گئیں جب رقص میں ان کا مقابلہ کوئی بھی فنکار نہ کر سکا۔ نوجوان فنکار شہزاد شیخ، دولہا کے والد بہروز سبزواری، میاں تک کہ فلموں میں ایک عرصے سے رقص کرنے والے جاوید شیخ بھی میدان میں کوڑے، مگر تجل علی نے پالا ماری لیا۔ یوں وہ تقریب میں مرکز نگاہ بن گئیں۔ تاہم ان کا یہ سحر تھوڑی دیر ہی قائم رہا کہ تقریب کے اصل مرکز نگاہ تو دولہا و دہن ہی تھے۔ گلابی رنگ کے عروسی لباس میں ساتھ یوسف اور کریم رنگ کی شیر وانی پہنے شہروز سبزواری لگ بھی بہت سارے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا گویا گڑیا لڈے کی شادی ہو رہی ہو۔ ساتھ یوسف اور شہروز سبزواری کو زندگی کے سفر کا یہ نیا موڑ مبارک ہو۔



ماہر

اداکارہ ویدار کا معروف حوالہ اداکاری کے علاوہ

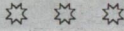
اداکارہ نرگس کی بہن ہونا بھی ہے۔ تاہم ویدار کے لیے محض اتنی شہرت کافی نہیں۔ اسی لیے تو بے چاری کو اتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔ (جی ہاں! ابھی صائمہ چودھری سے لڑائی، کبھی کرکٹرز کے ساتھ دوستیاں، کبھی قیمتی تحائف کی وصولی تو کبھی کوئی اور کارنامہ۔ اف! بے چاری ایک ویدار کے ساتھ کتنے جھیلے ہیں۔) اوپر سے لوگ انہیں سکون سے نہیں رہنے دیتے۔ ویدار اپنے والدین کے ساتھ جج کرنے گئیں تو پیچھے ادھر ان کی بہن نرگس نے ان کی شادی کا راز صحافیوں کے سامنے افشا کر دیا۔ (لو بھلا! بندہ اپنے خون پر بھی بھروسا نہ کرے) ویدار واپس آئیں تو صحافیوں نے انہیں جج کے ساتھ شادی کی بھی مبارک باد دے ڈالی۔ ویدار نے جج کی مبارک باد تو قبول کر لی، تاہم شادی سے مکر گئیں۔ ابھی وہ شادی کی تردید کر رہی رہی تھیں کہ اسی وقت ان کا موبائل بج اٹھا۔ ویدار نے فون کرنے والے کا نام دیکھا تو ان کے چہرے پر پھوٹے ہوئے دھنک رنگ صحافیوں کو بہت کچھ سمجھا گئے۔ تب ویدار کو ڈال میں کچھ کالا ہونے کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ اب آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ موصوف بھی کالے ہیں۔ ویدار نے موقع پر موجود صحافیوں کو ان صاحب کی تصویر بھی دکھائی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ خاصے پنڈت سم ہیں۔ (بس

تھوڑی نظر ہی کمزور ہوگی۔) ویدار نے بتایا کہ ”میری شادی نہیں ہوئی۔ ابھی صرف لڑکا ہی پسند کیا ہے۔ ابھی میرے ہونے والے شوہر اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لیے راضی کر رہے ہیں۔“ (اویسے شاداشے!) ابھی رشتہ آیا نہیں اور ابھی سے ہونے والے شوہر! ویدار کا کہنا ہے کہ لڑکے کا تعلق یورپ سے ہے۔ لہذا وہ شادی کر کے وہیں چلی جائیں گی۔ (چلو! یورپ والوں نے کوئی کام تو اچھا کیا) ایک سوال کے جواب میں ویدار نے کہا کہ وہ شادی پاکستان اور باہر دونوں جگہ پر کریں گی۔ (ہائیں!) تو وہ شادیاں کریں گی کیا ایک ہی شادی کو ”کالی اینڈ پیسٹ“ کریں گی؟ ان سب باتوں کے بعد ویدار کو خیال آیا کہ انہوں نے بھانڈا پھوڑنے والی بڑی بہن کو تو کچھ کہا ہی نہیں۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے کہا کہ وہ میری شہرت سے خائف ہیں۔ وہ برویگنڈوں کی ماہر ہیں اس لیے ”شوٹا“ چھوڑ دیا۔ (چلیں! آپ نے ان کے کسی فن میں ماہر ہونے کا اعتراف تو کیا۔ اور آپ بھی کتنی ماہر ہیں، یہ تو سب کو نظر آ رہا ہے۔)

چائنا برانڈ

یہ ابھی زیادہ پرانی بات نہیں ہوئی کہ معروف گلوکارہ پرنسز عینی ”ٹوئی سے میرا پیار ماہیا“ کہتی ہوئی نوریہ اعوان کے سنگ ایک حسین تعلق میں بندھی تھیں، مگر خدا جانے اس بندھن کی گرہ کمزور بھی یا کسی حاسد نظر نے اس پر ”کھل جاسم سم“ بڑھ کر پھونک دیا تھا کہ گرہ اتنی جلدی کھل گئی اور یہ رشتہ دوریوں کی کھائی میں جا گرا۔ یہ شادی محض دو ڈھائی ماہ ہی قائم رہی۔ (چائنا برانڈ شادی بھی کیا؟) علیحدگی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے پرنسز عینی نے نوریہ اعوان پر الزام عائد کیا کہ وہ ان پر تشدد کرتے تھے۔ پرنسز عینی کے مطابق نوریہ اعوان کی تسلی محض مار پیٹ ہی سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ انہیں کان پکڑ کر مرقا بننے کی سزا بھی دیتے تھے۔ (چلو جی! اور نائیں بالوں کو گھونسلے جیسا

سلسلہ تو اب چل نکلا ہے۔ دیکھیے! اب بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ تاہم افسوس ناگ پہلو یہ ہے کہ ماضی میں اس طرح کی خبریں اور پھر الزامات کا سلسلہ صرف بانی وڈ کے فنکاروں کی طرف سے ہی دیکھنے میں آتا تھا۔ تاہم آج دنیا کے ”عالمی گاؤں“ بننے کے بعد سے مختلف تہذیبیں ایک دوسرے پر اپنے اثرات زیادہ تیزی سے مرتب کر رہی ہیں۔ ڈر ہے کہ تہذیبوں کا یہ ادغام کہیں ہماری تہذیب کی شناخت ہی نہ کھو دے۔



یہ بیان کلامانہ

○ اگر ریجنرز کو کراچی میں فری پیٹڈ نہیں مل رہا ہے تو یہ اپنی بدنامی کیوں گرا رہی ہے؟ اسے واپس چلے جانا چاہیے تاکہ یہ الزام نہ لگ سکے کہ یہ اپنی ویوٹی دینے اور کراچی میں امن و امان قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی ہے۔

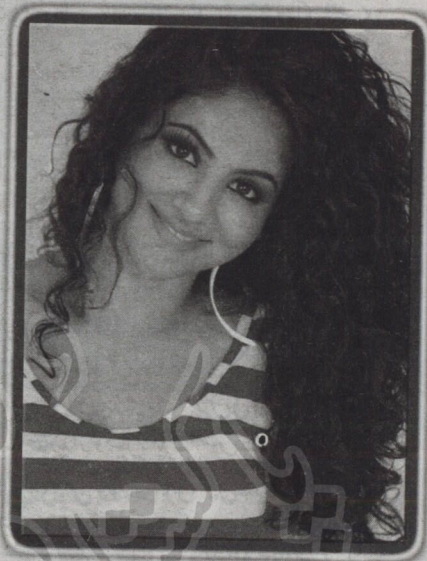
(روف کلاسرا۔ رازونیا)

○ اس بات پر سب ہی احتجاج کرتے ہیں اور سو فیصد درست کرتے ہیں کہ بلوچستان میں ایجنسیوں کے ہاتھوں بلوچ نوجوان اغوا اور قتل ہو رہے ہیں، لیکن کوئی بھی یہ نہیں بتا رہا کہ جتنے نوجوان ایجنسیوں کے لوگ مسینہ طور پر اٹھاتے ہیں۔ اس سے زیادہ تعداد پنجابی آباد کاروں کی ہے۔

(عباس اطہر۔ کنکریاں)

○ جامعہ حفصہ کی طالبات اور حکومت کے درمیان تنازعے کی اصل وجہ سو برس پرانی مسجد امیر حمزہ کی شہادت ہے، چودھری شجاعت حسین مئی 2007ء میں لال مسجد تنازعہ طے کر چکے تھے، لیکن مشرف نہیں مانے، کیونکہ وہ لال مسجد تنازعے کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

(حامد میمن۔ قلم کمان)



..... اگلا تو پرندہ ہی سمجھے گا نا..... بس موصوف یہ بھول گئے کہ مرنے عام طور پر پالتو ہوتے ہیں اور لوگ انہیں بڑے شوق سے ڈربوں میں رکھتے ہیں..... ان کا گھونسلوں سے کیا واسطہ..... ویسے کیسے عینی کی شکل نوید اعوان کی کسی خراشت نیچر سے تو نہیں ملتی، جنہوں نے انہیں بار بار کان پکڑ کر مرنے کی سزا دی ہو۔ اب وہ عینی کو یہ سزا دے کر اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کرتے ہوں۔ لیکن نوید صاحب! کوئی خاتون مرنے کیسے بن سکتی ہے، کیونکہ وہ تو مرنے ہوتی ہے نا۔ (پرنسز عینی کا مزید کہنا ہے کہ ”بات ہوئی سزاؤں تک تو سہہ لیتے ہم“، لیکن جب نوید اعوان نے انہیں الٹا لٹکا کر جان سے مارنے کی کوشش کی تو وہ وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگ آئیں۔) (ہائیں! الٹی لٹکی تھیں تو سر کے بل ہی بھاگ گئیں کیا؟)

نوید اعوان نے جب یہ سب سنا تو انہوں نے پرنسز عینی پر جوانی الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کا کہنا ہے کہ عینی ان کے گھر سے سونے کے زیورات اور کروٹوں کی رقم لے اڑی ہیں۔ (الزمامت در الزامات کا



آپ کا باورچی خانہ

شمیم اختر ریسر

چکن مسالا

ایک کلو	جزا ۱ :
ایک چمچ	چکن
ایک چمچ	اورک
ایک چمچ	لسن
ایک چمچ	ہری مرچ کا پیسٹ
ایک چمچ	نمک ہلدی لال مرچ پاؤڈر (حسب ضرورت)
ایک چمچ	دھنیا زیرہ پاؤڈر
دو بڑے چمچ	نٹائو پیوری
ایک چمچ	بھنا اور پسا، موکھا کھوپرا

ترکیب :

یہ ساری چیزیں چکن پہ مل دیں اور سائڈز میں رکھیں۔ کڑھائی میں دو بڑی پاز گولڈن براؤن کریں۔ ساتھ ہی ثابت گرم مسالا ڈالیں۔ پھر چکن ڈال کر

1 سنا ہے شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ بس جی! جب سے یہ سنا تب سے کھانا پکاتے ہوئے ہماری یہی دعا اور یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کو پسند آجائے اور وہ رغبت سے کھالیں۔ ساتھ ہی ہم صفائی کا خاص خیال رکھ کر کوکنگ کرتے ہیں، تاکہ پسند کے ساتھ ہی غذائیت اور صحت سب ہی کچھ حاصل ہوں۔

2 ویسے تو اکثر ہی مہمان بغیر اطلاع کے آجاتے ہیں اور زیادہ تر ہماری یہی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں کھانے پر روک کر ہم بھی کچھ ٹواب گھر بیٹھے کمالیں۔ اگر ایسی ایمرجنسی ہو جائے تو جی اس کا حل ہماری بایں چٹکی میں ہے۔ سب سے پہلے ٹافٹ فریزر سے چکن نکال کے پانی میں رکھ دیں تاکہ وہ جلد از جلد نارمل حالت میں آجائے۔ پھر جلدی سے سوٹ ڈش تیار کر کے فریق میں رکھ دیں۔

خوب بھونیں پھر تھوڑی دیر ڈھک کر پکائیں۔ پک جانے پر ہرے دھنیا سے گارنش کریں۔ روٹی یا نان سے سرو کریں۔

(3) روزہ کی کھانے کے برتن دھلتے ہی، گیس اسٹوو اور کوکنگ ریج کی صفائی ہوتی ہے۔ پھر چکن کی زمین کو بھی صاف کرتی ہوں۔ تفصیلی صفائی کا موقع بڑی مشکل سے بچے کے سونے پر اپنی نیند قربان کر کے حاصل ہوتا ہے۔

(4) ناشتے کے وقت میں تنہا ہوتی ہوں۔ ویسے تو ماشاء اللہ دو بجے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر ابھی وہ فرمائش کرنے کے دور سے تھوڑے دور ہیں۔ اسی لیے میں انہیں زبردستی کچھ کھلا کر خود بھی کچھ بھی بلکا لے لیتی ہوں۔ ویسے جمعہ کو چٹائی ہوتی ہے اور انتظار کے ساتھ ہی ہمارے ڈیڑھ سٹ بھائی صاحب کی بھی موجودگی ہوتی ہے۔ تب ہم خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ ویسے تو بہت سی چیزیں ہیں۔ مگر ایک خاص ترکیب جو آپ سب یقیناً "نہیں جانتی ہوں گی۔ کیونکہ یہ ہمارے گاؤں کی ڈش ہے۔ جو میں نے بھی می سے ابھی ابھی سیکھی ہے۔

سوٹ رول

ترکیب :

ایک پیالی چاول کے آٹے میں انتاپانی ڈالیں کہ نہ زیادہ گاڑھا نہ زیادہ پتلا آمیزہ بن جائے اس میں ایک انڈا خوب پھیٹ کر مکس کریں اور علیحدہ رکھ دیں ایک پیلی میں ایک چمچ بھی ڈال کر دو پیالی فریش ناریل کدووش کیا ہوا ڈالیں۔ شکر، سرخ رنگ، وینلا ایسنس شامل کریں اور ہلکا گولڈن ہونے تک بھون کر سائڈز میں رکھ دیں۔

اب دوسرے پیلی میں چاول والا آمیزہ تھوڑا آٹل ڈالنے کے بعد پھیلا میں۔ اس روٹی میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوں گے۔ اسے پلٹے گا مت۔ بلکہ

تیار ہونے پر تمہرے پیٹ میں نکالیں۔ ہلکا ٹھنڈا ہونے پر تمہ کھولیں۔ کھوپرے کا مکسچر ایک لائن بنا کر ڈالیں۔ پھر روٹی رول کر کے ٹکڑے کاٹ لیں۔ (5) کھانے کا فیشن تو پتا نہیں، مگر جب کوئی ایمرجنسی کام نکل آئے۔ بچوں کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا ہو یا اسکول میں فنکشن ہوں۔ اس کے علاوہ کسی بہت زیادہ خوشی کے موقع پر باہر کھاتے ہیں۔ (6) ہاں! اکثر ایسا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں کڑھی اور وال چاول جیسے ہلکے کھانے اور خاص طور پر کھیرے کی موجودگی ٹیبل پر ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح سردیوں میں گرم تاثیر والے کھانے پر زور ہوتا ہے۔ بارش میں جو کہ یہاں کبھی بھاری ہوتی ہے ہم بھی پکڑوں کے مزے لوٹتے ہیں۔

(7) میری سرال والوں کا کہنا ہے کہ والوں، مسالوں، حتیٰ کہ قیے وغیرہ کو بھی سل پر پینے سے جو لذت، ذائقہ کھانے میں آمو جو ہوتا ہے وہ مشینوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن میں اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتی آپ میں اگر شوق ہے۔ آپ لکھن سے محبت سے پکار رہی ہیں تو جدید مشینوں کی مدد سے

بھی آپ ذائقہ دار پکا سکتی ہیں۔ محنت ضروری ہے۔ مگر اتنی نہیں کہ پکانے کے بعد آپ خود کھانے سے محروم رہ جائیں۔ ویسے کچھ ہاتھوں میں خدا داد صلاحیت ہوتی ہے۔ پریکٹس مزید نکھار پیدا کرتی ہے۔ (8) ٹپس تو بہت سی ہیں۔ مثلاً "چاول بواٹل کرتے وقت ایک چھوٹا چمچہ آٹل ڈال دیں تو چاول کھلے کھلے پکتے ہیں۔ فریش ناریل کدووش کیا ہوا اور لیمن جوس فریزر میں مینے تک مازہ رہتے ہیں۔



موٹہ کے پکوان

خالہ جیلانی

کشمیری چائے

اجزا :

دو چائے کے چمچے
چار چائے کے چمچے
چار کپ
حسب پسند
ایک چٹکی
ایک چٹکی
دو چائے کے چمچے
ایک چٹکی
دو عدد

سبز پتی
خشک دودھ
پانی
چھنی
الاجینی پاؤڈر
میٹھا سوڈا
پیسے بادام
جائفل جاوتری
لوٹک

ترکیب :

دو کپ پانی میں دو تین ابال آنے کے بعد سبز پتی
ڈال کر دس منٹ تک بپائیں، پھر میٹھا سوڈا ڈال کر مزید
پانچ منٹ تک درمیانی آگ پر پکائیں۔ اب چوبابند کر
کے دو کپ ٹھنڈا پانی ملائیں اور خوب پھینٹیں۔ جتنا
پھینٹیں گی، اتنا ہی ذائقہ آئے گا۔ پھر چھان کر دوبارہ
چولے پر چڑھا دیں۔ ایک آدھ جوش کے بعد بقیہ تمام
اجزاء ڈال کر بلکی آگ پر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ
دیں۔

مزے دار کشمیری چائے تیار ہے۔ مزید ذائقے کے
لیے دو چمچے فریش کریم بھی ملا سکتی ہیں۔

کھٹے گوشت کا پلاؤ

اجزا :

چاول
ابی
گوشت
تین پاؤ
آدھا پاؤ
آدھا ٹکڑا

لسن اور ک پیٹ
ثابت گرم مسالا مکمل
پسی سرخ مرچ
ہلدی
پیاز
نمک
تیل
حسب ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کر کے پیاز سنہری کریں۔ لسن اور ک
پیٹ، ہلدی، مرچ اور نمک ڈال کر بھونیں۔ مسالا
تیل چھوڑ دے تو ثابت گرم مسالا ڈال دیں پھر گوشت
اور دو گلاس پانی ڈال کر پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ چاول
ابال لیں۔ ابھی پانی میں ڈال کر رکھ دیں۔ گوشت
گل جائے تو ابلی کو مٹل کر گاڑھا سا پیٹ بنا کر گوشت
میں ڈال کر بھونیں اور آٹھ دھبی کر دیں۔ ایک پتلی
میں چاول اور گوشت کی تہ لگائیں اور پندرہ منٹ کے
لیے دم پر رکھ دیں۔

فرنیچ ٹوسٹ

اجزا :

چار سلاٹس
ایک عدد
آدھا کپ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چٹکی
تلنے کے لیے

ڈبل روٹی
انڈا
دودھ
مکھن
چھنی
دار چینی پاؤڈر
تیل

ترکیب :

سلاٹس کو تھون کٹ کر اس پر مکھن لگائیں۔ دودھ
میں دار چینی پاؤڈر اور انڈے پھینٹ کر ڈال دیں۔
مکھن لگے سلاٹس کو دودھ میں ڈبو کر تیل میں ڈالیں۔
سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔ فرنیچ ٹوسٹ میٹھے بنانا
چاہیں تو دودھ میں چینی گھول لیں یا تیار ہونے کے بعد
پسی ہوئی چینی چھڑک دیں۔



بہنوں شمع

جنوری 2013
کے شمارے کی ایک جھلک

جنوری 2013
کا شمارہ نکلتا ہے
ہو گیا ہے



”جنت کے پتے“ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
”دابعہ کی کہانی“ نعیم شریف کے افسانے،
”دستک“ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
”پیادے نبی ﷺ کی پیادری باتیں“
احادیث مبارک کا سلسلہ،
”خط آپ کے، شاعری بچ بھوتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے
شامل ہیں،
”کیا کہو یا، کیا پایا“ نئے سال کے حوالے
سے قارئین سے سروے،

شمع جنوری 2013 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

ڈراتی اور رلاتی ہے اپنائیت اجسی سی ہو چکی ہے دماغ ہر وقت سوچ سوچ کر تھک جاتا ہے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے سر کے بال ختم ہو کر ایک ہزار ستارے کی طرح چھپا پانی ہے سر پہ خارش کر کر کے زخم بن گئے ہیں رات آجائے تو یہ فکر کہ کیسے گزرے گی۔ دن چڑھے تو یہ کہ کیسے بیتے گا وقت کیسے گزرے گا (جو کہ گزر رہا ہے) بیمار ہو گئی تو کون سنبھالے گا۔

رج: اچھی بہن! بے اندیشہ آنا پریشان کن سوچیں، مستقبل کے خدشات نہ صرف ذہن کو متاثر کرتے ہیں بلکہ جسمانی بیماری کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ڈاکٹر عام طور پر نیند کی گولیاں اور ڈپریشن کی دوا میں تجویز کرتے ہیں۔ لیکن ایک بہت اہم بات جو ڈاکٹر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ ان دواؤں کے مضر اثرات ہیں ان ہی مضر اثرات یا سائیڈ ایفیکٹ کی وجہ سے ان دواؤں سے فائدہ ہونے کے بجائے دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان مضر اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی غذا میں استعمال کی جائیں جو ان کے مضر اثرات کو کم کر سکیں۔

سب سے اہم اور ضروری یہ ہے کہ آپ اپنی غذا میں پھل اور سبز یوں کی مقدار بڑھادیں۔ آج کل گاجر اور کینو کا موسم ہے۔ روزانہ کچی گاجریں اور کینو کھائیں۔ ممکن ہو تو گاجر کا جوس بھی پیئیں۔ ایک ہفتہ میں آپ نمایاں بہتری محسوس کریں گی۔

رات کو کھانے میں ہلکی پھلکی غذا لیں، سونے سے پہلے آپ اپنے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کریں پھر نیم گرم پانی سے غسل کریں۔ اس کے بعد ایک گلاس تیز گرم دودھ پیئیں۔ پھر سونے کے لیے بستر جائیں اور یا حی یا قیوم کا ورد کریں۔ چند منٹ بعد ہی آپ کو پرسکون نیند آجائے گی۔

پرسکون نیند ہوگی تو خواب بھی خوشوار ہوں گے۔ ان دواؤں کے اثر سے عموماً "قبض کی شکایت بھی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو یہ شکایت ہے تو پانچ دانے متقی کو گرم دودھ میں ایک جوش دے کر کھالیں۔

سسرال والوں کے غلط رویوں کو یاد کر کے آپ خود پر ہی ظلم کر رہی ہیں۔ آپ کے مطمئن رہنے کے لیے یہ بات کافی ہونا چاہیے کہ آپ مظلوم ہیں ظالم نہیں۔ جو کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں اگر بچ بھی گیا تو آخرت تو ہے جہاں اسے ایک ایک ظلم کا حساب دینا ہو گا۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔

وہ لوگ جو ظالموں کے شریک کار ہیں۔ ان کا انجام بھی ظالموں کے ساتھ ہو گا۔ آپ ان کے متعلق سوچ سوچ کر اپنی صحت کیوں برباد کر رہی ہیں۔

زندگی میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ انسان درگزر کرے اور ان تمام لوگوں کو معاف کر دے جنہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اگر دل میں اتنی کشاؤں نہ ہو تو پھر اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دے۔ وہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ لیکن ان زیادتیوں کو یاد کرنا اور سوچ سوچ کر کڑھانا اسے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

خط سے اندازہ ہوتا ہے آپ ذہین لڑکی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو فضول سوچوں میں ضائع نہ کریں۔

نوٹ: اچھی بہن! اچھے کپڑے، زیورات اور دولت کی افراط الگ چیزیں ہیں اور زندگی کا سکون علیحدہ چیز ہے۔ انسان کو یہ تمام چیزیں بہت آسانی سے دستیاب ہوں اور خواہشیں اس انداز میں پوری ہوں کہ ادھر منہ سے بات نکلی ادھر پوری ہو گئی تو زندگی سے سکون غارت ہو جاتا ہے۔ جدوجہد محنت کا نام ہی زندگی ہے۔ آپ صبر و قناعت سے کام لیں گی خوش رہیں گی۔

احساس برتری دراصل احساس کمتری کی دوسری شکل ہے اور پہلی کے مقابلے میں زیادہ بری اور خوفناک ہے کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی انسان سے برتر بھی ہے اور کم تر بھی۔ لیکن وہ شخص جو احساس کمتری کو احساس برتری کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔

احساس برتری کا شکار جھوٹ غلط بیانی اور ظاہری نمائش سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن اس کی باتوں میں معقولیت کم اور غلط بیانی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اپنے احساس کمتری کو چھپانے کی خاطر رہن سہن، دکھاوا، ظاہر داری اور لباس میں حد درجے بناوٹ دکھاتا ہے۔ ماکہ دیکھنے والے اس کی آن بان سے خوب متاثر ہوں بلکہ اکثر اوقات دعوتیں اس انداز سے کرتا ہے کہ جس کا مقصد دعوت کم اور گھریار کی نمائش زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ احساس کمتری کو چھپانے کی خاطر سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دکھاوے کی خاطر تحائف دیتا ہے تاکہ سامنے والے پر اپنی برائی ثابت کر سکے۔ ان تمام چیزوں کے پیچھے خلوص نہیں رہا کاری ہوتی ہے۔ ظاہر داری اور دکھاوا۔ سامنے والے کو اپنی امارت کا احساس دلانا ہوتا ہے۔

احساس برتری کے شکار لوگوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ بے حد حاسد اور باہن الوقت ہوتے ہیں۔ تقابلی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ کسی کو کھانا پیتا، خوش و خرم نہیں دیکھ پاتے۔ اسی وجہ سے ہر وقت الجھے ہوئے اور پریشان رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ دوسروں پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ بہت خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی کمزوریوں اور برائیوں کی پردہ پوشی کی خاطر دوسروں پر الزام رکھ دیتے ہیں۔ دوسروں پر نکتہ چینی کر کے انہیں تسکین ملتی ہے۔ دوسروں کی تعریفیں سن کر اور خوش حالی دیکھ کر زور درج ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ دوسروں کو پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں باتیں کر کے ان پر جھوٹے الزامات دھر کر اپنی برائی ثابت کرنے کی سعی رائیگال کرتے ہیں ایسے لوگ لاشعوری طور پر اپنی کمی کی تلافی چاہتے ہیں یا اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ ایک توان کا بھرم قائم رہے دوسرا لوگ ان کے تصنع کو جان کر ان کی برائیاں نہ دیکھ لیں۔ حالانکہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ لوگ ایسے لوگوں کے منہ پر مروتا "خاموش رہتے ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے ہیں لیکن دل ہی دل میں حقیقت کو سمجھتے ہیں۔

ثابت

میرے ذہن پر سوچوں کی بلخا رہتی ہے۔ رات کو خوابوں میں الٹی سیدھی جگہیں، مکان، رستہ، گھنڈر، چھت، اجنبی راہیں دکھائی دیتی ہیں ڈاکٹر نے ٹینشن اور نیند کی گولیاں دی ہیں، نیند کا نہ آتا، بے خوابی اور سوتے ہوئے بے آرائی، بے قراری، دماغ پہ بوجھ، مشتعل متنی باتیں جان کھپاتی ہیں۔ سسرال والوں کے ظالمانہ، بے حس احساسات نہیں بھولتے۔ زندگی سے لگے نہیں مگر ظالم کو ظلم نہ ماننا جیسے عمل والے لوگ زندگی کو بڑی گہری مضامین لگا چکے ہیں۔ کسی پر اعتماد نہیں رہا کوئی بڑا ہی دکھائی دیتا ہے۔

لوگوں کی ناپسندیدہ باتوں کل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ موسم بھی بھلے نہیں لگتے۔ فراغت کا حق ہے۔ تنہائی

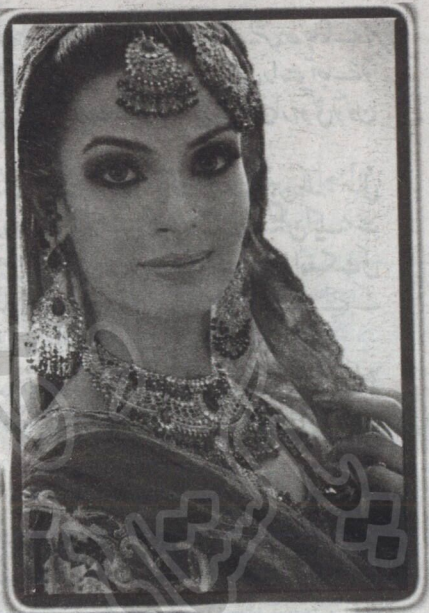
ہاتھ اچھی طرح دھوئیں۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو منہ کے اندر ڈالیں اور بائیں گال کو باہر کی طرف دبائیں۔ اسی طرح بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو منہ میں ڈال کر دائیں گال کو دبائیں۔

یہ عمل دو منٹ صبح دو منٹ شام کریں۔ دائیں ہاتھ کو چہرے پر اس طرح رکھیں کہ پھیلی ٹھوڑی کے نیچے ہو، اب پھیلی کو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کپٹی تک لے جائیں۔ اسی طرح بائیں ہاتھ کی پھیلی ٹھوڑی کے نیچے رکھیں اور بائیں کپٹی تک آہستہ آہستہ لے جائیں۔ یہ عمل تین مرتبہ کریں۔

لبنی..... لاہور

س : میرے چہرے پر بے شمار چھوٹے چھوٹے تل ہیں۔ چہرے کے مسام بھی کھلے ہوئے ہیں اور پسینہ بھی بہت آتا ہے۔ کوئی ایسا گھریلو نسخہ بتائیں جو میں آسانی سے کر سکوں۔

ج : آپ کو چاہیے کہ آپ کافی مقدار میں سادہ پانی اور پھلوں کا رس پیئیں تاکہ آپ کے جسم میں نمی کی کمی واقعی ہوئی ہو، اس کو اس طرح پورا کر لیا جائے۔ کھلے مسام کے لیے آپ ایسا کریں کہ دن میں کم از کم تین بار صابن سے منہ دھوئیں۔ چہرہ خشک کرنے کے بعد اسٹرنجینٹ لوشن (جلد کو سکھڑنے والا لوشن) استعمال کریں۔ دھوپ میں باہر نہ نکلیں اور اگر نکلتا ہی پڑے تو چہرے کو دھوپ سے بچائیں۔ رات کو سوتے ہوئے دلہ اور دودھ کا ماسک بنائیں اور اس کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد اسے صاف اور ٹھنڈے پانی سے دھوئیں۔



اَمّت الصُّبُوْر

عشقِ ملی جکس

شمنہ کریم..... بہاولپور

س : میری عمر صرف چالیس سال ہے، لیکن چہرے سے میں پچاس سے زیادہ کی نظر آتی ہوں۔ گال پچک گئے ہیں اور جلد پر بھی عمر کے اثرات نمایاں ہیں۔

ج : بہن عطیہ بانو ہماری بہت اچھی مصنفہ تھیں۔ انہوں نے ایک بار پچکے گالوں کے لیے ہمیں یہ نسخہ بتایا تھا۔

پچاس سال کے بعد جب چہرے پر عمر کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ گال پچک جاتے ہیں۔ اگر گال پچکے ہوئے نہ ہوں تو آپ اپنی اصل عمر سے بہت کم نظر آ سکتی ہیں۔ اس مسئلے کے لیے اس نسخہ پر عمل کریں۔